دنیا کی بہترین کہانیوں کا انتخاب

سب رنگ ڈائجسٹ





شمارہ ★ ۷

جلد ★ ۳

فی پرچہ ★ ۲ روپے

زرِ سالانہ ★ ۲۱ روپے

سرورق طباعت : ایسٹ پبلشرز لیمیٹڈ - ایس-آئی-ٹی-ای۔کراچی

پبلشر شکیل عادل زادہ نے قاسم نورانی کے اہتمام میں پاکستان ہیرالڈ پریس ضیاء الدین روڈ

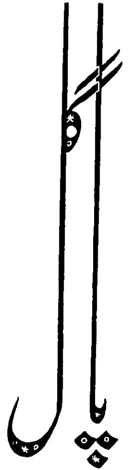
کراچی سے چھپوا کر ۵۔سی ۱۲/۴ ناظم آباد، کراچی ۱۸ سے شائع کیا۔

پتہ: ۴۷-۴۸ پریس چیمبرز- آئی-آئی چندریگر روڈ، کراچی

فون: ۲۲۵۸۴۴

ذیلی دفتر: لطیف ہاؤس، کریشن پورہ، پشاور


حسینوں کیلئے
باٹا کے
آرام دہ ، ہوادار
سٹائل
سٹائل ۳۲
سٹائل ۳۰
سٹائل ۵۵
باٹا
باٹا
Bata
Bata
تقسیم کنندگان :- گلوب کمرشل انٹرپرائسز لمیٹڈ۔ لاہور



غالباً ہم نے یہ افسوسناک اور تلخ حقیقت ابھی تک تسلیم نہیں کی کہ ہمیں شکست ہوگئی ہے۔ ہم ہار گئے ہیں۔ ہم نے اپنے ملک کا ایک وسیع و زرخیز علاقہ کھو دیا ہے۔ ہارنے والوں کے یہ تیور نہیں ہوتے جو ہمارے ہیں۔ یہ عذر تراشیاں اور جواز سازیاں اس عظیم شکست کی تلافی نہیں کر سکتیں جو دنیا کی تمام قوموں کے لیے درسِ عبرت اور تاریخِ عالم کے لیے مقامِ حیرت ہے۔

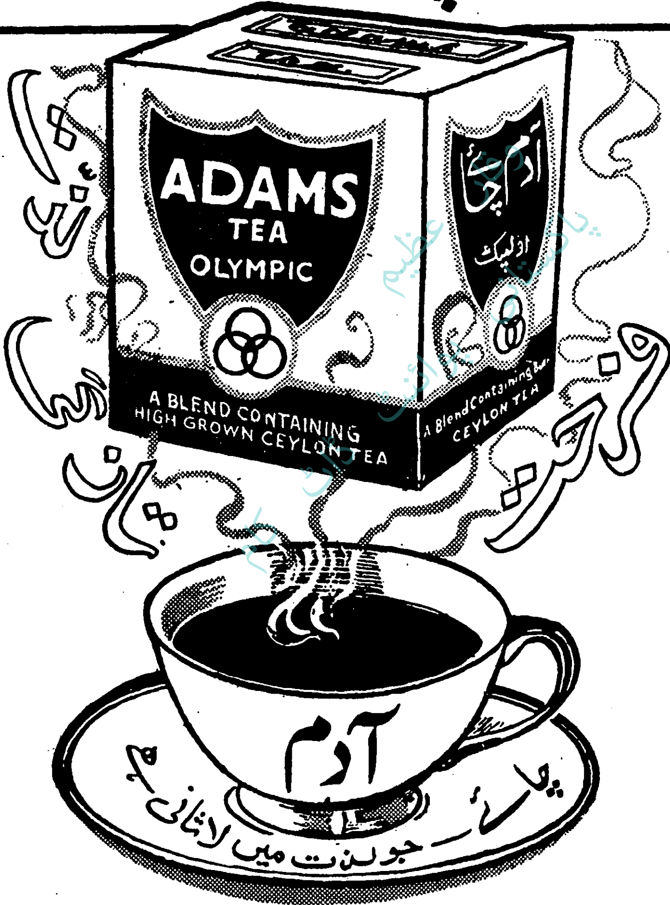
ہاں تسلیم کر لیجیے کہ ہم ہار گئے ہیں اور یہ سب کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ایک شخص یا چند اشخاص کو اچانک اعصابی ضعف و انتشار کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ نفس کے غلام، کینہ پرور، جاہل اور خود غرض ہجوم نے ہماری دیانتوں پر اعتبار نہ کیا، ہمیں موقع پر دھوکا دے دیا، دشمن نے جنگ میں عیاری و مکاری سے کام لیا اور ہم سادہ لوح، معصوم اور نیک طینت شخص اس کے جال میں پھنس گئے۔ دشمن نے ہمیں لڑنے کا موقع ہی نہیں دیا اور ہماری شرافت اور نیک نفسی کا ناجائز فائدہ اُٹھالیا۔ جب دو فریق میدانِ جنگ میں اُترتے ہیں تو ایک فریق کی یہ توقع حماقت ہے کہ اس کے زخمی بازو کے ساتھ رعایت برتی جائے گی، دوسرا حریف اقدار کی پاسداری اور اخلاق و مروّت کا لحاظ رکھے گا۔ نفرت و اشتعال میں بصارت معطل ہو جاتی ہے۔ غصوں میں احتیاط کی توقع عبث ہے۔ جنگ میں تمام نفسیاتی، سیاسی اور حربی حربے آزمائے جاتے ہیں۔

جسے شکست ہو جاتی ہے وہ یقیناً اسی کی خامیوں کے سبب سے ہوتی ہے۔ وہ ان نشیبوں کی وجہ سے ہوتی ہے جو اس کے اندر موجود ہیں۔ وہی قومیں معرکۂ جنگ و جدال میں سرفراز ہوتی ہیں جنہوں نے ہر محاذ، ہر مرحلے پر خود کو پہلے سے مستعد و مستحکم کر رکھا ہے، جو خطرے کو پہلے سے سونگھ لیتی ہیں اور صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں جن میں نظم، قربانی، اپنے مقصد پر ایمان اور قومیّت کا شدید جذبہ ہوتا ہے۔ جنگ میں طاقت ایک ضمنی چیز ہے، اصل چیز تو تدبّر، مستقبل بینی، عزمِ مصمم اور صحیح فیصلہ ہے۔ جو اپنے اندر منتشر ہوں اور ایک دوسرے پر اعتماد نہ کرتے ہوں، وہ جنگ کیا لڑیں گے۔ شکست ان کا مقدر ہے۔ سیاسی اور اخلاقی فتح اصطلاحوں کی بات ہے۔ یہاں جو عملی جنگ میں جیت جاتا ہے وہی سربلند و سرخرو ہوتا ہے۔ شروع سے اب تک یہی ہوتا آیا ہے۔ یہ کوئی ایسا ناقابلِ فہم نکتہ نہیں ہے جو اسی دور میں رائج ہوا ہو۔ ہماری موجودہ شکست ۲۵ سالہ کوتاہیوں، عاقبت نا اندیشیوں اور ذہنی کج رویوں کا خمیازہ ہے۔ یہی مدّت دوسری قوموں کو کہاں سے کہاں لے گئی۔ ہم ابھی تک وہیں ہیں جہاں پہلے تھے، ہمارا اتحاد راکھ کا ڈھیر ہے، ہماری طاقت پھلجھڑی ہے۔ ہم لوگ تو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ یہاں چھوٹی چھوٹی باتوں اور معمولی معمولی مسئلوں پر مفاہمت، ضبط، تحمل اور ایثار کا فقدان ہے، ستم ظریفی یہ ہے کہ اس شیرازے کے بکھرنے کا اندیشہ ہمہ وقت رہتا ہے۔

کوئی ایک سبب نہیں۔ ساری غلطیاں ہماری، ہمارے اپنے لوگوں کی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہندوستان نے پاکستان کا وجود اصولاً اور بہ صمیمِ قلب تسلیم نہیں کیا، لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو منوایا کہاں ہے۔ خود ہم نے خود کو کہاں تسلیم کیا ہے۔ قوموں کی یہ آوارگیاں، بے ضمیریاں اور بے غیرتیاں انھیں نیست و نابود کر دیتی ہیں۔ شکست کے بعد خیال تھا کہ شاید یہ لٹا ہوا کارواں اپنے بچے کھچے اثاثے پر قناعت کر کے ایک تازہ عزم، جدید روح اور نئی اُمنگ کے ساتھ دوبارہ اپنا سفر شروع کر دے۔ مگر یہ لوگ تو کچھ ایسے انتشار کے عالم میں ہیں کہ خود کو نوچ اور کھسوٹ رہے ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ ہمارا موجودہ ذہنی انحطاط ہمیں کس طرف لے جا رہا ہے۔ پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب اپنے وجود کی نفی کرنے پر تُل گئے ہیں۔ یقیناً ہم سب پاگل ہو گئے ہیں۔

گاہے گاہے سکون و عافیت کے جو لمحے مل جاتے ہیں، یہ بھی ہَوا ہو جائیں گے۔ تابکے ان گردشوں کا سلسلہ چلے گا جو ایک علیحدہ ملک بنانے اور متحد رہنے کے اہل نہیں، ان سے رعایت چھین لی جائے گی۔ جنگ، طاقت، غصّے اور نفرت کی باتیں مضبوط و متحد قوموں ہی کو زیب دیتی ہیں۔ کوئی دعوا اور اقدام کرنے سے پہلے ذہین اور بہادر لوگوں کے آداب سیکھنے لازم ہوتے ہیں۔ محنت ذہانت ہے۔ ذہین قومیں محنت کرتی ہیں۔ محنتی قومیں ذہین ہوتی ہیں۔ ہم نے یہی ایک کام کر کے نہیں دیا۔

پس اب ایک شکست خوردہ قوم کی طرح حالات کے جبر سے مفاہمت کیجیے۔ سر اُٹھانے کا کیا محل ہے۔ سر جُھکا کر بات کیجیے، نفرتیں اور غصّے نہ بیدار کیجیے۔ ذہانت سے کام لیجیے۔ زندہ رہنے کے لیے شیرازہ بندی اور تیور بدلنے کی ضرورت ہے۔ کوئی رہنما، کوئی حکومت اور کوئی نظریہ لوگوں کو منقلب نہیں کر سکتا اگر آمادگی اور قبولیت کی فضا موجود نہ ہو۔ محض حکومت اور رہنماؤں سے اُمید رکھنے اور ان پر تکیہ کرنے والی قوم کا حشر دیکھ لیا؟ ہر عہد کے تقاضے نئے ہوتے ہیں۔ باتیں کم اور کام زیادہ کرنے کی عادت ڈالیے۔ بڑی بڑی باتیں زیادہ کام کرنے کے بعد ہی اچھی لگتی ہیں۔


ADAMS
TEA
OLYMPIC
A BLEND CONTAINING
HIGH GROWN CEYLON TEA
آدم چائے
اولمپک
A Blend Containing
CEYLON TEA
آدم
چائے جو لذت میں لاثانی ہے

ذاتی صفحہ

اس ماہ پرچے کی ترتیب میں عجیب عجیب اُلجھنیں پیش آئیں۔ عزیزہ شاہدہ پروین نے مختلف موضوعات پر کوئی سو صفحے ترجمہ کیے، ان میں رنگ برنگی کہانیاں تھیں مگر صرف سات ہی صفحے منتخب ہو سکے۔ کچھ کہانیاں ان میں سے ایسی ہیں جو ممکن ہے ایک سال بعد سب رنگ میں شائع ہوں اور کچھ ایسی ہیں جو ایک سال پہلے شائع ہو سکتی تھیں۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے قارئین کی پسند، ناپسند، مزاج اور معیار کو خود سے پرکھتا ہوں اور اس کی تصدیق اپنے رفقا سے کراتا ہوں۔ جب وہ اسے پاس کر دیتے ہیں تو وہ تحریر آپ کی نذر کر دی جاتی ہے۔ میرے اور آپ کے درمیان ایک ایسی ہم آہنگی ضرور موجود ہے کہ جو چیزیں مجھے پسند آتی ہیں وہ عموماً آپ کو بھی پسند آتی ہیں۔ یقیناً سدا بہار کہانیوں کے سوا بہت سی کہانیاں ایسی ہوں گی جو سب رنگ میں پہلے شائع ہو گئی ہیں۔ اب وہ سامنے آئیں تو شاید مسترد ہو جائیں۔ مجھے احساس ہے کہ مختلف کہانیاں پڑھتے پڑھتے میری اور آپ کی کوئی تربیت ضرور ہوتی ہوگی۔ میں آپ کو کوئی آگے یا پیچھے کی تحریر پڑھوانے کے معاملے میں بڑا محتاط ہوں۔ ہاں فضا رفتہ رفتہ ہموار ہو رہی ہے اور میرا خیال ہے کچھ عرصے بعد اعلا درجے کی کہانیوں کے لیے لوگ صرف سب رنگ کا نام لیا کریں گے۔ اب بھی سب رنگ اپنے مواد اور معیار کے اعتبار سے بے شمار پرچوں سے مختلف ہے۔ آئندہ دیکھیے آپ کے سامنے کیا کیا چیزیں آتی ہیں۔ ابھی دُنیا کا عظیم ادب اُردو میں منتقل ہی کہاں ہوا ہے۔ لوگ بہت سی چیزیں ترجمہ کرتے ہوئے ڈرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے لوگ انھیں شاید پسند نہ کریں مگر اچھی اور معیاری چیزیں ساری دُنیا کے قارئین کو پسند آتی ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ انھیں ارتقائی اور تدریجی انداز میں پیش کیا جائے۔ میں نے گزشتہ ماہ عرض کیا تھا کہ سب رنگ کے پاس ایک بڑا ادارتی عملہ ہے۔ اگر دوسرے ماہنامے جاری کرنے والے حضرات وہ اخراجات سُن لیں جو سب رنگ کے ادارے پر صرف ہوتے ہیں، تو حیرت زدہ رہ جائیں اور مجھے پاگل کہیں۔ مجھے اس کا بہت پہلے اندازہ ہو گیا تھا کہ آنے والے زمانے میں اچھے مواد کی کیسی قلت ہوگی۔ اس لیے میں نے منتخب لوگوں کو اپنے ارد گرد جمع کر لیا تھا۔ اتنے رسالوں کی بہتات اور مصنفین کی کم تعداد کے سبب اب کہانیوں کا نیلام ہونے لگا ہے۔ جو سب سے زیادہ بولی لگاتا ہے کہانی اسی کی ہوتی ہے اور یہ کہنے کی غالباً ضرورت نہیں کہ سب سے منتخب اور دلچسپ کہانیاں کہاں شائع ہوتی ہیں۔ اتنا متنوع، دلچسپ اور معیاری مواد جمع کرنے کے لیے اپنی اوقات سے بڑھ کر کچھ سوچنا اور کر گزرنا پڑتا ہوگا۔ بہرحال ابھی تو آغاز ہے، پہلے سے کوئی دعوا کرنا مجھ جیسے بے مایہ شخص کے لیے مناسب نہیں۔ میں اپنی بساط کے مطابق جو کر رہا ہوں وہ آپ کے سامنے ہے۔ وہ چند قدامت پسند لوگ جو اِدھر اُدھر کی ہانک رہے ہیں، ایک دن خود بخود خاموش ہو جائیں گے۔ یورپ میں بھی یہی ہوا تھا۔ مگر ڈی ایچ لارنس، آسکر وائلڈ، کانن ڈائل، پو اور ہمارے ہاں منٹو، بیدی اور عصمت وغیرہ مسلم الثبوت ادیب ہیں، یہ باتیں ذرا دیر سے ہضم ہوتی ہیں اور دیر میں سمجھ میں آتی ہیں۔ فکشن کیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کی تعریف بار بار اس ملک میں کی جائے۔

بعض احباب کبھی کبھی کوئی تیر اِدھر بھی چھوڑ دیتے ہیں، کچھ میری زبان بے لگام سے بھی نکل جاتا ہے مگر میں بڑی سچائی سے عرض کروں کہ اپنے دل میں کسی کے لیے کوئی ناروا جذبہ موجود نہیں۔ ہم تو قلندر ہیں۔ اپنی ہستی مٹا کر کوئی کام کرنے کے جویا رہتے ہیں۔ مجھ سے میرے قریب کے لوگ آ کر کہتے ہیں کہ شکیل تم نے وہ رسالہ دیکھا؟ اس نے ہو بہو تمھاری نقل شروع کر دی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ تو ایک بہت بڑی داد ہے مجھے اور میرے رفقا کو ان کے کام کی کہ ہماری تقلید کی جاتی ہے اور ہم کم از کم اس جبر سے تو بچے رہتے ہیں کہ کوئی ہمارے منہ پر تتبع کا الزام دھرے۔ پر افسوس اس بات کا ہے کہ وہی لوگ جو ہمارے منتخب رنگوں سے اپنی عروسِ اُمید سجاتے ہیں، ہماری جانب چھینٹے اڑانے سے بھی باز نہیں آتے اور یہ کیا کم کرب ہے کہ ایک اچھے خیال کا حُلیہ اس مضحکہ خیز حد تک بگاڑ دیا جاتا ہے کہ وہ نہ نقل رہتا ہے نہ اصل۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کے سب سے قریبی شخص گویا اپنی محبوبہ کو کوئی بیش قیمت اور مرصع لباس بطورِ تحفہ دیا۔ سب نے اسے پسند کیا اور آپ کو اپنی نظرِ انتخاب کی خوب داد ملی۔ اب سوچیے آپ کا اس وقت کیا حال ہوگا۔ آپ تو نڈھال ہو جائیں گے جب وہ نشاط انگیز گلبدن آپ کا تحفہ لباس اُلٹا پہنے ہوئے نظر آئے۔ آپ کی تو جان پر بن آئے گی۔ اور اس پر ستم مستزاد ہو کہ اس کی تیوری پر بھی بل ہوں۔ خدا ایسے عذاب سے ہر مومن مسلمان کو بچائے۔

اب جگہ جگہ سب رنگ ٹائپ رسالوں کی بہتات ہے۔ ان میں بعض پرچے خاصے مقبول ہوئے اور بعض جیسے تیسے زندہ رہنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے میری شمعِ اُمید بھی کہیں سے بھڑکنا شروع ہوئی تھی۔ اتنے بہت سے پرچے کوئی ایک شخص نہیں پڑھ سکتا۔ میں آپ کو بتاؤں، ممکن ہے آپ اسے مبالغہ سمجھیں مگر یہ حقیقت ہے کہ میں نے ڈھائی سال سے کوئی رسالہ باقاعدہ نہیں پڑھا۔ ایک تو فرصت اپنی کہانیاں پڑھنے ہی سے نہیں ملتی اور دوسرے ہنگامے الگ رہے۔ ایک دلچسپ اور عجیب بات ہے، مجھے کچھ یہ شبہ سا ہو گیا ہے کہ انھیں پڑھ کر میرا جیسا تیسا انتخاب اور میرے اُول جلول فیصلے متاثر ہوں گے، میری منفرد رہنے کی کوشش مجروح ہوگی۔ چنانچہ میں انھیں نہیں پڑھتا۔ البتہ جگہ جگہ آرا سونگھتا پھرتا ہوں۔ یہ تمام موقر جریدے ادارے کے لوگ پڑھتے ہیں اور وہی مجھے مطبوعہ و غیر مطبوعہ کہانیوں کی سند دیتے ہیں، اسے آپ خود ستائی نہ سمجھیں۔ میں ایک عاجز اور فقیر آدمی ہوں، تنہا اور گوشہ نشیں۔ میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کا آرزومند بچپن سے رہا ہوں۔ یہ ایک شخص کی خامی ہے یا خوبی، مجھے معلوم نہیں آپ کیا فیصلہ کریں گے۔ بہرحال ہر آدمی کی طرح میری بھی اپنی ایک دنیا ہے۔ لوگ میری باتیں، میرا انتخاب اور میری چیزیں پسند کرتے ہیں۔ اس سے میرے اندر کام کرنے کی تحریکیں اُبھرتی ہیں۔ رفتار تیز اور اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے۔ الیاس صاحب کہتے ہیں، تمھارے ہاتھ میں وہ لکیر ہے جس کی خوش بختی کا انحصار لوگوں کی پسند و ناپسند پر ہے۔ سو میں لوگوں کو خوش رکھنے اور اس طرح اپنے بخت کو سرشار رکھنے میں ہمہ جان و ہمہ دل منہمک ہوں۔ عشق کا ذکر خاصا پرانا ہو گیا ہے مگر یہ تو ایک مستقل کیفیت ہے، اس لیے تکرار میں کوئی حرج نہیں۔ عشق صادق ہو تو وہ تمام دنیا سے بے نیاز ہوتا ہے، کچھ کھو کر ہی کچھ حاصل ہوتا ہے۔ میں نے عملاً خود کو کھو دیا ہے۔ سب رنگ اس قربانی کا ماحصل ہے۔ عاشق کے لیے اس کا مقصود و محور تو اس کا محبوب ہوتا ہے۔ دوسروں سے عشق کے آداب نہیں سیکھے جاتے۔ جب یہ سرشوری اور جنون ہو تو اطوار آداب کا کہاں ہوش رہتا ہے۔ مجھے ڈر ہے یہ باتیں گراں نہ گزر جائیں مگر یہاں اپنے دوستوں سے کون سی بات چھپائی گئی ہے۔ یہ ذات کی باتیں ہیں۔ اس صفحے میں، میں نے آپ سے ہر طرح کی اجازت لے رکھی ہے، خود نمائی و خود پسندی کیوں سمجھیے۔ یہ تو ناز و ادا کی باتیں ہیں جو اپنوں کے سامنے اپنا سمجھ کر کہی جاتی ہیں۔ کون شخص اس سے مبرا ہے، ذات کا درد ہی تو کچھ کر گزرنے پر اکساتا ہے، جو مجھ سے قریب نہیں، وہ ذات و حیات کی ان باتوں پر اُلجھتے ہوں گے۔ تو اُلجھیں۔

پچھلے دنوں ایک صاحب کا خط ملا جنھوں نے باقاعدہ تحقیق کر کے ریشم کی ڈوریاں کہانی کے اعداد و شمار غلط ثابت کیے تھے۔ مجھے اُن کی تحقیق و تفتیش سے بڑی خوشی ہوئی۔ اعداد و شمار میں غلطی ہو سکتی ہے۔ تاہم نفسِ مضمون اپنی جگہ قائم ہے۔ میں اُن سے آئندہ اور محتاط رہنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ اسی طرح ہر ماہ بہت سے خطوط موصول ہوتے ہیں جن کا تذکرہ اس صفحے میں ممکن نہیں۔ علیحدہ جواب دینے کی کوشش میں ہوں۔ دیر سویر ہو سکتی ہے۔

اس مرتبہ اقبال مہدی نے اسکیچز میں کچھ نئے تجربے کیے ہیں۔ آئی بروپنسل عموماً غزالی آنکھ والے اپنے ابروؤں کو حسین بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں اقبال مہدی نے اس سے کچھ اور ہی کام لیا ہے۔ انھوں نے چہرے تراشے اور جسم ڈھالے ہیں۔ منہ کا ذائقہ بدلتا ہے تو اچھے بُرے ذائقوں کی تمیز ہو جاتی ہے۔ دیکھیے یہ اسکیچز دنیا کے اوریجنل اسکیچز سے کتنے مشابہ ہیں۔

سُنا ہے گرمی کو گرمی مارتی ہے۔ اس شدید گرمی اور حبس میں میری مرتب کی ہوئی گرم جوش اور شگفتہ تحریریں پڑھیے اور جسم و جاں کو میرے قُرب کے گداز سے راحت پہنچائیے۔ یہ شمارہ موسم کے تمام اثرات سے بے نیاز ہے۔ اس میں بعض تحریریں تو ہمیشہ زندہ رہنے والی ہیں۔

میں نے بہت کچھ کہہ لیا۔ میری طرف سے اب آنکھیں پھیر لیجیے۔ اتنی محبت بہت ہے۔ اب دوسروں کی کاوشوں سے قلب و نظر کی آسودگی کا اہتمام کیجیے۔


بادشاہ کا رقیب
الیاس سیتاپوری



سُرخ رنگت، نکیلی داڑھی، سرخی مائل بال اور بھاری تن و توش کا عمر شیخ مرزا اپنی عمر کے انتالیسویں سال اور حکمرانی کے ستائیسویں سال اپنے قصبے اخشی پہنچا تو والیِ فرغانہ کے اس تیموری حکمران کو فردوسی کے شاہنامے اور مولانا رومی کی مثنوی کے مطالعے کے ساتھ ہی کبوتر بازی کا بڑا شوق تھا۔ اخشی کے پہاڑی محل کی چوٹی پر اس نے شاندار کبوتر خانہ بنوا رکھا تھا۔ محل میں داخل ہوتے ہی کبوتر خانے کی چھت پر چڑھ گیا۔ کبوتر خانہ ٹوٹ گیا اور عمر شیخ مرزا لڑھکتا ہوا چٹان پر گر کر جاں بحق ہو گیا۔ یہ خبر آناً فاناً چاروں طرف پھیل گئی۔

بارہ سالہ ظہیر الدین بابر لشکرے کو ہاتھ پر بٹھائے اپنے چند دوستوں اور ملازموں کے ساتھ باغ میں بیٹھا شکار کے منصوبے بنا رہا تھا۔ لشکرا یا باز صحرا میں پر تول تول کر رہ جاتا۔ اسی لمحے باغ کے مغربی دروازے سے ایک گھڑسوار اسے تلاش کرتا ہوا اس کے قریب آیا، گھوڑے سے اترا اور دوزانو ہو کر آداب بجا لایا۔ اس نے ایک چھوٹا سا پرزہ بابر کی طرف بڑھا دیا اور آہستہ سے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھ کر چپ ہو رہا۔ اس خط میں بابر کی ماں نے عمر شیخ مرزا کی ناگہانی موت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"عزیز بیٹے فوراً اندیجان کے شاہی محل پہنچو اور تاج و تخت پر قبضہ کر لو ورنہ اندیشہ ہے کہ سازشی امرا تمہارے کم عقل بھائی جہانگیر مرزا کو بٹھا کر حکومت کا کام خود سنبھال لیں۔ جہانگیر مرزا کا باپ یقیناً تمہارا باپ عمر شیخ مرزا ہے لیکن ماں تمہاری ماں نہیں، وہ فرغانہ کی تیموری حکومت کا حق نہیں قرار دیا جا سکتا۔"

بابر نے لشکرا اپنے ایک نوجوان دوست علی نواز کے حوالے کیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر محل کی طرف چل دیا۔ دوست علی نواز اس کے ساتھ تھا۔ بقیہ دوست اور ملازمین اس کے پیچھے گردن جھکائے سوگوار انداز میں گھوڑوں کی لگامیں ڈھیلی چھوڑے ہوئے تھے۔ راستے میں محل کا ایک پریشان حال ملازم ملا اور اس نے بابر کو یہ افواہ سنائی کہ اس وقت اس کا محل میں جانا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ سازشی امرا اسے قید میں ڈال کر جہانگیر مرزا کو تخت پر بٹھا دیں گے۔ بابر نے گھوڑے کا رُخ عیدگاہ کی طرف کر دیا اور روپوش ہو جانے کی نیت سے گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا۔ دوستوں اور ملازموں نے کنارہ کشی اختیار کی لیکن علی نواز اب بھی ساتھ تھا۔ بابر کو زندگی میں پہلی بار دوستوں کی بے مہری اور ملازمین کی بے وفائی کا تجربہ ہوا۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اسے اپنے پیچھے لمحہ بہ لمحہ قریب آنے والے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دینے لگیں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا چند گھڑسوار گرد و غبار کے بادل اڑاتے اس کے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ بابر نہتا تھا، وہ سہم گیا۔ اسے یقین تھا کہ یہ لوگ اسے گرفتار کرنے آ رہے ہیں۔ بھاگنا بے سود تھا، علی نواز کے مشورے پر ٹھہر گیا۔ چاروں آنے والے گھڑسواروں نے اسے گھیر لیا اور اسے مجبور کیا کہ وہ قلعے میں واپس چلے، وہاں خوش بختی اس کا انتظار کر رہی ہے۔

بابر تذبذب کے ساتھ قلعے میں واپس چلا گیا۔ وہاں وفادار امرا اس کے منتظر تھے۔ انہوں نے بارہ سالہ بابر کو فرغانہ کے تخت پر بٹھا کر رسم تاجپوشی ادا کی اور اسے سلامت کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا باپ عمر شیخ مرزا بھی تو بارہ سال ہی کا تھا جب اسے فرغانہ کا تاج و تخت ملا تھا۔ بابر تیمور ع سے وہی تھا۔ امرا کی اس بات سے اس نے یہ شگون لیا کہ شاید وہ بھی زندگی بھر اطمینان سے فرغانہ کا حکمران رہے گا لیکن بابر کا یہ خیال خام تھا۔

عمر شیخ مرزا کی موت کی خبر سن کر بابر کا ماموں [illegible] کے شہر تاشقند سے اور چچا سمرقند سے اپنی اپنی فوج لے کر اندیجان کی تسخیر کے لیے چل پڑے۔ اس کا چچا فتح کے جھنڈے اڑاتا ہوا فرغانہ سے سترہ میل دور تک آ گیا۔ کمسن بابر حیران تھا کہ ان نازک موقع پر یہ خونی رشتے اس کا ساتھ دینے کے بجائے اس کی حکومت کو ہڑپ کر جانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں، لیکن اس حیرت کو بابر کی ذہین اور دور اندیش نانی ایسن نے یہ کہہ کر دور کر دیا کہ تاج کے رشتے نہیں ہوتے۔ اس قول کی صداقت سامنے تھی، چچا سلطان احمد مرزا والیِ سمرقند اس کا ہونے والا سسر بھی تھا کیونکہ اس کی لڑکی عائشہ سلطان بابر کی منگیتر تھی۔ فرغانہ کی طمع نے والیِ سمرقند کے دل سے ساری محبتیں اور مروتیں دور کر دی تھیں۔ اس خطرناک موقعے پر نوعمر بابر نے پہلی بار اپنی خردمندی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے والیِ سمرقند کو لکھا:

"آپ میرے والد عمر شیخ مرزا مرحوم کے بھائی اور غلام کے

اس کہانی کے تاریخی پس منظر کیلیے مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

تزکِ بابری (بابر) ھمایوں نامہ (گلبدن بیگم) تذکرۃ الواقعات (جوہر آفتابچی) بابر (ارسکن) بابر (ہیرلڈ لیم) اور تاریخ بخارا (آرمینیس ومبری)۔

چچا ہیں، آپ کی بیٹی عائشہ سلطان خانم کی منگیتر ہے کیا یہ
حقیقت نہیں ہے کہ ناصر آپ کا بھتیجا، بیٹا، ہونے والا داماد
یا غلام ہے ان تمام رشتوں میں سے میرے لیے جو چاہیں تصور
کریں اور یہ سوچیں کہ اگر آپ نے فرغانہ فتح بھی کر لیا تو اس پر
اپنا ایک عامل ضرور مقرر کریں گے چنانچہ آپ کا یہ غلام
جنگ کیے بغیر ہی فرغانہ پر آپ کی حکومت تسلیم کیے لیتا
ہے اور خود کو آپ کا عامل سمجھتا ہے ناصر کے خیال میں
اس پیش کش کے بعد معرکہ آرائی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔"

علی نواز جان خطرے میں ڈال کر بابر کی پیش کش لے کر والئی سمرقند کے دربار میں پہنچ گیا، چچا بھتیجے کی تجویز مان لیتا لیکن اس کے مشیروں نے اسے مسترد کر دیا۔ علی نواز دل شکستہ اور مایوس جب واپس ہوا تو شام ہو چکی تھی اور مشرق سے سیاہی کی چادر تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی، اندیجان کے مغرب کی مضافاتی بستیوں میں چراغ روشن ہو چکے تھے گھروں کے اوپر دھواں اُٹھ رہا تھا گلے بان اپنے مویشیوں کو ہنکاتے لیے جا رہے تھے راہ میں اکا دکا ملنے والے سمور اور پوستین میں لپٹے ہوئے لوگ تیز تیز قدم اُٹھاتے گھروں کی طرف بھاگے جا رہے تھے، گھروں کے دروازے بند ہو چکے تھے اور بستی کے احوال اور کیفیات دیکھ کر پہلی نظر میں یہ بات معلوم ہو جاتی تھی کہ لوگ خوفزدہ اور سراسیمہ ہیں۔ جب وہ ایک سُرخ پتھروں کی مسجد کے پاس سے گزرا تو نمازی اندر سے نکل رہے تھے وہ نمازیوں کے احترام میں ذرا دیر کے لیے گھوڑے سے نیچے آ گیا اور لگام تھام کر پیدل چلنے لگا۔ اچانک ایک بڑی بڑی گھنیری مونچھوں والا ادھیڑ عمر شخص اس کی طرف بڑھا اور قریب آ کر رسمی سلام دعا کے بعد سوال کیا۔ "یقیناً تم مغل معلوم ہوتے ہو اور دربار سے متعلق ہو۔"

"ہاں!" علی نواز نے جواب دیا۔

"کس شاخ سے تعلق رکھتے ہو؟ چغتائی، جوجی خانی یا ازبک؟"

علی نواز نے جواب دیا "میرا خاندان مغلوں کی کسی گمنام شاخ سے تعلق رکھتا ہے؟"

"اچھا!" وہ کچھ سوچتا ہوا بولا "کیا خیال ہے یہ کمسن شہزادہ کیا فرغانہ پر حکومت کر سکے گا؟"

علی نواز اس باوقار شخص سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے سفارت اور ناکامی کی پوری روداد سنا دی کہنے لگا "حالات بہت نازک ہیں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

اس شخص نے آس پاس نظریں ڈالیں اور کہنے لگا "میں بھی مغل ہوں، میں کاشغر کے شمال سے قسمت آزمائی کے لیے جب یہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ عمر شیخ مرزا انتقال کر چکا ہے، بابر ابھی بچہ ہے ہمیں اس کے بجائے سمرقند یا تاشقند چلا جانا چاہیے!" اس کے بعد کچھ سوچتا ہوا بولا "تم بھی مغل ہو میں بھی مغل ہوں کیوں نہ ہم لوگ ایک الگ فوج تیار کریں اور تیموریوں کی اپیں کی۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر بولا "آؤ تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ اور کل کسی وقت پھر ملو گھر بیٹھ کر منصوبے بنائیں گے!"

علی نواز میں قبائلی عصبیت بیدار ہو گئی اور وہ بے چون و چرا اس شخص کے ساتھ اس کے چوبی مکان میں چلا گیا۔ یہ ادھیڑ عمر مغل غیر معمولی بہادر معلوم ہوتا تھا بیٹھک کے برابر غالباً مویشیوں کا باڑا تھا کیونکہ تیز اور ناگوار بو اندر دماغ پھاڑے دے رہی تھی کہیں قریب ہی چولھا جل رہا تھا اور غیر مرئی دھواں ناک میں داخل ہو کر نرخرے میں خراش پیدا کر رہا تھا مغل اسے بیٹھک میں چھوڑ کر اندر چلا گیا جب تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک حسین ترین نوجوان لڑکی بھی آئی اس کے ہاتھ میں دودھ کا پیالہ تھا، سُرخ رومال سر سے بندھا تھا اور لومڑی کی کھال کی واسکٹ سینے کے عین نیچے پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں خمار لیے ہوئے تھیں، علی نواز نے شاعری میں چشم غزال سن رکھا تھا لیکن دیکھنے میں پہلی بار آئی تھیں، اس نے دودھ کا پیالہ علی نواز کی طرف بڑھا دیا لیکن پیالے کی منتقلی میں دونوں کے ہاتھ مس ہو گئے۔ بوڑھا مغل اس خاموش تصادم کو نہیں دیکھ سکا۔ "یہ میری بیٹی خانزادی ہے میری کوئی اولادِ نرینہ نہیں ہے۔ کل جب تم یہاں آؤ گے اور میں گھر میں موجود نہ ہوا تو تمہیں خانزادی بٹھائے گی"، اس کے لہجے کی لکنت اور لفظوں کے اختصار سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ دل کی اصل بات کہہ نہیں پا رہا ہے۔

علی نواز غٹ غٹ دودھ چڑھا گیا اور خالی پیالہ خانزادی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اندر چلی گئی۔

"سنو نوجوان!" مغل کھڑا ہو گیا "اب رات ہو رہی ہے تمہیں چلا جانا چاہیے لیکن جانے سے پہلے غور کرنے کے لیے چند باتیں سنتے جاؤ، ہم مغلوں میں ایک مثل مشہور ہے اگر دشمن تمہارے باپ کے خیمے پر حملہ کرے تو لوٹ کے مال میں حصے دار بننے کے لیے دشمن کے ساتھ ہو جاؤ، اب سوال یہ ہے کہ اس مثل کی روشنی میں ہمیں کمسن بابر کا ساتھ دینا چاہیے یا والئی سمرقند کا؟ ہم مغلوں کو اس کا جلد از جلد فیصلہ کر لینا چاہیے ورنہ وقت گزر جائے گا۔"

علی نواز اب تک بابر کا وفادار دوست تھا لیکن یہاں ادھیڑ عمر مغل کی تجربکارانہ باتوں نے اسے ڈانواڈول کر دیا اور وہ خان زادی کی ایک ہی جھلک پر اتنا وارفتہ ہوا کہ اس نے بابر کے ساتھ اپنے مستقبل کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ علی نواز نے پہلی بار یہ سوچا کہ اس کا دوست نوعمر بابر اب شاید زیادہ دنوں تک اپنے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کر سکے۔ اس نے والئ سمرقند کا جواب خاموشی سے بابر کے حوالے کیا اور خود تنہائی میں بستر پہ دراز ہو کر آئندہ کے منصوبے بنانے لگا۔

دوسرے دن چار و ناچار بابر فوج لے کر اپنے چچا کے مقابلے میں پہنچ گیا۔ چچا بھتیجے کے درمیان دریائے قبا حائل تھا۔ سمرقندی فوج بابر کو صف آرا دیکھ کر بے چین ہو گئی اور ایک تیلے پل سے گزر کر بابر پر حملہ آور ہونا چاہا لیکن پل ٹوٹ گیا اور لوگ بہہ گئے۔ پل کے آس پاس کی زمین دلدلی تھی۔ بے شمار سپاہی گھوڑوں سمیت اس دلدل میں دھنسنے لگے۔ سمرقندی اپنے ساتھیوں کا یہ حشر دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے اور ابھی ان کی حیرت اور خوف دور بھی نہیں ہوا تھا کہ مرتیسیوں میں حیرت انگیز طور پر ایک پُراسرار وبا پھیل گئی۔ ان کے گھوڑے ہلاک ہونے لگے۔ پے در پے بدشگونیوں سے خوفزدہ ہو کر والئ سمرقند نے واپس جانا چاہا۔ بابر بھی یہی چاہتا تھا لیکن چچا سلطان احمد مرزا فرغانہ کے جن شہروں پر قبضہ کر چکا تھا انہیں چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا اور جو ابھی تک بابر کے قبضے میں تھے ان پر بابر کا حق بدستور تسلیم تھا۔ اس کشمکش میں ایک بات کھل کر سامنے آتی جا رہی تھی۔ بابر کے مغل امرا میں پہلے جیسا جوش و خروش نہیں پایا جاتا تھا۔ خود علی نواز کا یہ حال تھا کہ فریقین میں تو واپسی کی شرائط طے پا رہی تھیں لیکن علی نواز کی سوچ میں فرق آ چکا تھا۔ ادھیڑ عمر مغل نے اسے بابر سے کچھ لاتعلق کر دیا تھا وہ جلد از جلد ادھیڑ عمر مغل سے ملنے اور اس کی حسین لڑکی کو دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔

طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے وہ چپ چاپ وہاں سے کھسک لیا اور چوبی مکان کے دروازے پر پہنچ کر دم لیا۔ مغل سردار گھر پر موجود نہ تھا۔ خان زادی اور اس کی ماں نے علی نواز کا استقبال کیا۔ بھاری کولھوں اور اُبھرے ہوئے بڑے بڑے جبڑوں والی ماں پینتیس چھتیس سال سے زیادہ عمر کی نہ ہوگی۔ ان دونوں نے باجرے اور جو کے مرکب آش سے علی نواز کی تواضع کی۔ ماں کا سر نیلے اور خان زادی کے بال سرخ رومال میں ڈھکے ہوئے تھے۔

خان زادی نے کسی جھجک کے بغیر اشتیاق سے پوچھا۔ "بابا کہتے تھے ظہیر الدین بابر تمہارا دوست ہے؟"

علی نواز نے جواب دیا۔ "پہلے دوست تھا لیکن اب ہمارا بادشاہ ہے!"

ماں نے بے دلی سے منہ بنا کر کہا۔ "یہاں کے لوگ کچھ احمق معلوم ہوتے ہیں۔ بھلا اس بچے کو بادشاہ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس بچے کی حکومت میں رہتے ہوئے ہمیں تو شرم سی محسوس ہوتی ہے!"

خان زادی نے اس کی بات پوری کر دی "اس لیے ہم لوگ بہت جلد یہاں سے چلے جائیں گے!"

علی نواز نے پوچھا۔ "کہاں چلی جاؤ گی؟"

خان زادی نے رومال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "اس کا فیصلہ بابا جان کریں گے!"

کئی گھنٹے گزر گئے۔ لیکن مغل سردار نہ آیا۔ یہاں تک کہ دریائے قبا کی طرف سے آنے والی شاہراہ گرد و غبار میں ڈوب گئی۔ بابر اپنے امرا اور محافظ دستے کے ساتھ اندیجان واپس جا رہا تھا۔ علی نواز کا گھوڑا دروازے پر درخت کے تنے سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "غضب ہو گیا اگر ان لوگوں نے میرے گھوڑے کو دیکھ کر پہچان لیا تو کیا کہیں گے؟"

خان زادی نے شرارت سے کہا۔ "تو اسے وہاں سے کہیں اور منتقل کر دو۔"

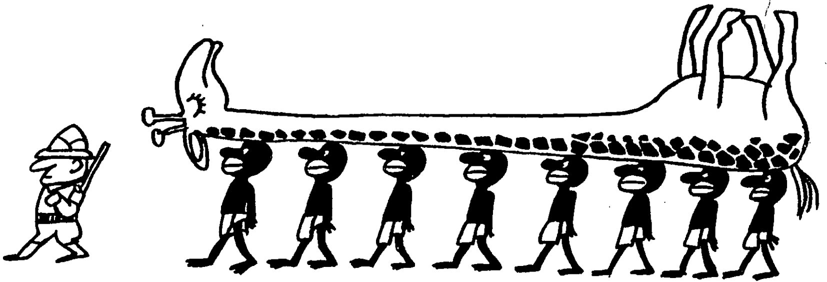
علی نواز نے بے بسی سے جواب دیا۔ "اگر میں نکلا تو پہچان لیا جاؤں گا!"

خان زادی مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ علی نواز نے دروازے کی جھری سے دیکھا کہ خان زادی نے گھوڑے کی پچھاڑی کو خنجر سے کاٹ دیا اور اُچک کر اس پر سوار ہو گئی۔ لگام پکڑ کر چند معمولی معمولی جھٹکے دیئے اور پھر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ گھوڑے کا رخ بابر کے لشکر کی طرف تھا۔ علی نواز دم بخود حواس باختہ خان زادی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ رومال کے باہر گدی اور پشت پر بکھرے ہوئے بال ہوا میں لہراتے تھے۔ ماں پریشان حال علی نواز کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی "مت ڈرو! میری بچی بڑی عمدہ گھڑسوار ہے۔ بہت سے مردوں سے بھی اچھی۔ ہم نے اسے لڑکوں کی طرح تربیت دی ہے۔"

علی نواز کی آواز کپکپا گئی۔ "لیکن ظہیر الدین بابر میرے گھوڑے کی پیشانی اور دم کے سفید دھبوں کو دیکھ کر پہچان لے گا۔ یہ گھوڑا اسی نے مجھے عطا کیا تھا!"

اتنے میں مغل سردار بھی آ گیا۔ آتے ہی وہ علی نواز سے بغل گیر ہو گیا۔ جب اسے خان زادی کی حرکت کا علم ہوا تو وہ بہت ہنسا۔ کہنے لگا "خان زادی تو میرا خان زادہ ہے۔ تم مت گھبراؤ مغل نوجوان۔ وہ ابھی واپس آ جائے گی۔"





انہوں نے اُوپر چھت پر پہنچ کر دیکھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین
لرز رہی تھی۔ خان زادی بابر کے قریب پہنچ کر بڑی دلیری سے اس کا راستہ
روک کر کھڑی ہوگئی۔ اُمرا اور محافظ دستے نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا اور
یہ محاصرہ تھوڑی دیر تک قائم رہا۔ مغل سردار بھی پریشان ہوگیا۔ کہنے لگا۔ "آخر
یہ اس لڑکی کو اچانک سوجھا کیا۔ وہاں کیا لینے پہنچ گئی؟ یہ ضرور کوئی مصیبت
کھڑی کرے گی!"

علی نواز کا تو اتنا بُرا حال تھا کہ آواز تک حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی
پھر انہوں نے دیکھا۔ خان زادی اسی آن بان سے واپس آرہی تھی۔ علی نواز
کھڑا ہوگیا اور مغل سردار سے بولا۔

"محترم سردار! میں فوراً ہی واپس جانا چاہتا ہوں مزید نہ بیٹھ سکنے
کی معافی چاہتا ہوں اگر زندگی رہی تو کل سے پرسوں تک کسی وقت
ضرور ملاقات کروں گا!"

مغل سردار باتیں کرنے کے لیے بے چین تھا "لیکن تم سے کچھ اہم باتیں
کرنی مقصود تھیں۔"

"یہ تو پھر بھی ہوسکتی ہیں۔" علی نواز نے اپنے اضطراب کو چھپانا چاہا۔
"مجھے ایک دوسرے راستے سے اسی وقت اندیجان میں داخل ہوجانا چاہیئے۔
ظہیرالدین بابر کے پہنچنے سے پہلے ہی!"

خان زادی واپس آگئی اس نے گھوڑے کو بدستور درخت کے تنے
سے باندھ دیا اور ہنستی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔ باپ کو دیکھتے ہی ایک دم سنجیدہ
ہوگئی۔ مغل سردار نے اسے ڈانٹا۔ "یہ کیا حماقت سوجھی تھی تمہیں؟"

خان زادی نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میں اس نوعمر بادشاہ کو ذرا
قریب سے دیکھنا اور اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔"

اس جواب پر سبھی کو سکتہ ہوگیا لیکن مغل سردار نے اسے کچھ اس طرح
دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ "پھر کیا ہوا؟"

خان زادی نے والہانہ انداز میں کہا۔ "نیا بادشاہ بڑا اچھا معلوم ہوتا
ہے پہلے تو وہ اچانک گھبرا گیا پھر مجھ سے بہت اچھی طرح ملا جب میں نے
اسے یہ بتایا کہ میرا خاندان کاشغر کی چغتائی نسل سے تعلق رکھتا ہے تو اس نے
اس بات کا بڑے فخر سے اظہار کیا کہ وہ خود بھی اپنی ماں کی طرف سے چغتائی
ہے اور اس کی نانی ایسن چغتائی عورتوں میں زیرک ترین عورت ہے۔" پھر علی نواز
کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "گھوڑے کو دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ تو ہو بہو اس کے ایک دوست کا
گھوڑا معلوم ہوتا ہے لیکن میں نے یہ کہہ کر اس کی زبان بند کردی کہ خدا کی قدرت
سے کیا بعید ہے کہ دو گھوڑے یکساں رنگ اور قدوقامت کے پیدا کردے۔"

یہ کہہ کر اس نے باپ کو راضی کرنا چاہا۔ "باواجان! میرا خیال ہے کہ ہمیں اس
نوعمر بادشاہ کی مدد کرنی چاہیئے اور کسی دوسرے دربار کا رُخ نہیں کرنا چاہیئے۔"

علی نواز اس کی باتیں جیسے عالم خواب میں سن رہا تھا۔ اس نے
خان زادی کی باتوں کا کچھ اور ہی مطلب لیا۔ کہنے لگا۔ "محترم خان زادی کو
شاید یہ نہیں معلوم کہ والیِ سمرقند ظہیرالدین بابر کا ہونے والا سسر بھی ہے اس
کی لڑکی عائشہ سلطان ظہیرالدین بابر کی منگیتر ہے۔" پھر پُرتشویش لہجے میں کہا۔
"اور ابھی کیا پتہ کہ ظہیرالدین بابر کب تک فرغانہ کا بادشاہ رہتا ہے وہ ابھی بچہ
ہے معلوم نہیں حالات اس کے خلاف کونسا رُخ اختیار کریں۔"

خان زادی نے بے خیالی میں کہا: "ابھی کیا پتہ، لیکن میں تو یہ جانتی ہوں کہ ظہیر الدین بابر شاندار اور خوش اخلاق انسان ہے۔ اس کے انداز میں شاہانہ تمکنت ہے، وہ یقیناً کوئی بادشاہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی رفاقت باعثِ سعادت ہے۔ سنا ہے بادشاہوں کی تو کئی کئی بیویاں ہوا کرتی ہیں!"

علی نواز آخری بات پر چونک پڑا۔ اس نے اپنی پریشانی کا چہرے سے اظہار نہ ہونے دیا۔ مغل سردار سے کہنے لگا: "مغل سردار! میں کل پھر حاضری دوں گا۔ خدا حافظ۔"

اِدھر بابر اپنے اُمرا اور محافظ دستے کے ساتھ گرد و غبار میں گُم ہو چکا تھا۔ علی نواز نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اندیجان کے شمالی دروازے کی طرف روانہ ہو گیا۔

بوڑھی نانی ایسن بابر کو بُری طرح ڈانٹ رہی تھی: "تمہیں اپنے مصاحبین سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ دربار کے چند مغل سردار کچھ خطرناک منصوبے بنا رہے ہیں لیکن تم ان پر اعتماد کرتے ہو!"

بابر نے بھنویں سکیڑ کر جواب دیا: "عدمِ اعتمادی سے عدمِ اعتمادی ہی ملے گی اور اعتماد سے اعتماد ملے گا۔ آپ کے تجربے اور دانائی اپنی جگہ، ہمیں بھی تو کچھ سیکھنے سمجھنے کا موقع دیجئے!"

نانی کا چہرہ سرخ ہو گیا: "کیا ہم نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ بادشاہ کا کوئی کنبہ نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں تم نے اس کا کیا مطلب لیا۔ ہم نے تمہیں یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ بادشاہ کا کنبہ، ساتھی، دوست یا سہارا اس کی عقل اور طاقت کے علاوہ نہیں ہوتے۔" علی نواز بچپن سے محل میں آ جا رہا تھا۔ قریب ہی بیٹھا دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔

بابر نے اس کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا: "لیکن نانی جان! چند دوستوں پر تو اعتماد کرنا ہی پڑتا ہے، اس اعتماد کے بغیر کوئی بادشاہ بادشاہ نہیں رہتا!"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" نانی نے کہا: "لیکن بادشاہ اپنے سائے سے بھی محتاط رہتے ہیں، وہ مصلحت بین اور مردم شناس ہوتے ہیں، کسی دوست پر اتنا بھروسا بھی نہ کرنا کہ وہ تمہاری کھال میں بھُس بھروا دے۔"

علی نواز کو یہ بات بُری لگی، اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد بابر بھی وہیں پہنچ گیا اور علی نواز کا غمزدہ چہرہ دیکھ کر نانی کی تلخ کلامی کی معافی چاہنے لگا لیکن علی نواز کے دل میں بات بیٹھ گئی تھی، اس نے مؤدبانہ عرض کیا: "ظہیر الدین! اب تم دوست سے زیادہ ہمارے بادشاہ ہو، تمہیں اختیار ہے کہ اپنے دوستوں پر اعتماد کرو یا نہ کرو۔ وقت آنے پر تمہیں خود ہی یہ معلوم ہو جائے گا کہ دوست دوست کی کھال میں بھُس بھرتا ہے یا دوست دوست کے لیے خود اپنی کھال میں بھُس بھروانا ہے۔"

بابر نے اپنے دوست سے بڑی معذرت کی لیکن علی نواز کا تکدّر دُور نہیں ہوا۔ اس نے سوچا اب بہتری اسی میں ہے کہ وہ مغل سردار کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کر دے کہ وہ ہر طرح اس کا ساتھ دینے کو تیار ہے۔ مسکراتے ہوئے معذرت خواہ بابر کی ذات سے ایک اور دُکھ پہنچنے کا احتمال پیدا ہو چکا تھا۔ اسے شبہ تھا کہ شاید خان زادی اس کمسن بادشاہ کی ایک ہی جھلک دیکھ کر پسند کرنے لگی ہے... پندرہ سولہ سالہ خان زادی اور بارہ سالہ ظہیر الدین، وہ سوچتا کیا ایسا ممکن ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہو جائیں، کیا ظہیر الدین عشق و محبت کی لذت سے آشنا ہو چکا ہے؟ جب کوئی معقول جواب نہ ملا تو اس خدشے نے مزید پریشان کر دیا کہ کمسن ظہیر الدین خان زادی کو پسند کرے یا نہ کرے لیکن شاید خان زادی اسے ضرور پسند کرنے لگی ہے۔ اُس دن خان زادی کے التفات اور اس کی والہانہ باتوں سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا۔

پھر بابر نے معلوم نہیں کیوں اور کیا سوچ کر خان زادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ پورا واقعہ سُنا کر کہنے لگا: "خدا معلوم وہ دلیر اور حسین مغل لڑکی ہم سے ملنے کیوں آئی تھی۔ ہم نے اتنی سرکش اور حسین لڑکی پہلے نہیں دیکھی؟ اور حیرت یہ کہ اس کا گھوڑا بالکل تمہارے گھوڑے جیسا تھا!"

علی نواز کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ بابر نے مزید کہا: "ہم نے اپنے معتمدِ خاص قاسم بیگ کو اس کے باپ کے پاس روانہ کر دیا ہے۔ ہم اسے کوئی معقول عہدہ دیں گے۔ دراصل بہادر اور وفادار امرا ہی تو کسی حکومت کے ہاتھ پیر ہوتے ہیں!"

علی نواز چپ رہا اور کسی بات کا جواب نہ دیا اور جب بابر نے اسے یہ بتایا کہ مغل سردار کے کنبے کو رہائش کے لیے قلعے ہی میں جگہ دے دی جائے گی تو بہت زیادہ پریشان ہو گیا اور اسے تقریباً یہ یقین ہو گیا کہ اس کا نوعمر دوست ظہیر الدین، خان زادی میں دلچسپی لینے لگا ہے، گویا اسے خان زادی سے دستبردار ہو جانا چاہیئے، بادشاہ جنہیں پسند کر لیتے ہیں وہ انہیں حاصل بھی کر لیتے ہیں۔

مغل سردار نے علی نواز کا بہت انتظار کیا لیکن جب وہ نہیں پہنچ سکا تو اس نے بابر کے معتمدِ خاص قاسم بیگ کی پیشکش قبول کر لی۔ قاسم بیگ نے اسے سمجھایا تھا کہ ظہیر الدین کے متوسلین کا مستقبل دوسرے درباروں کی بہ نسبت زیادہ تابناک ہے۔ اس نے مغل سردار کو یہ یقین دلایا تھا کہ سردست اس کو دو سال اندیجان کے قلعے ہی میں خدمات انجام دینا ہوں گی، اس کے بعد اسے کسی جگہ کا قلعے دار بنا کر روانہ کر دیا جائے گا۔ سردار نے کاشغری لباس پر کتھئی پوستین ڈال کر مغل ٹوپی پہنی، گردن کو ذرا ٹیڑھا کر کے انگوٹھے اور انگلیوں کی مدد سے مونچھ کے دونوں

سرس کو چھو کر کے ڈنک کی طرح ٹیڑھا کر کے قد سے اوپر کو اُٹھا دیا پھر گھوڑے پر بیٹھ کر بابر کے پاس روانہ ہوگیا۔

بار ہا بابر نے ادھیڑ عمر مغل سردار کی شاندار پذیرائی کی جو کہ آتش سے اس کی تواضع کی اور دیر تک اس کے خاندان کے بہادروں کے قصے سناتا رہا مغل سردار نے یہیں ایک طرف نوجوان علی نواز کو بیٹھے دیکھا جو اس سے نظریں چرا رہا تھا۔ اس نے اپنی گردن جھکا کر سر دونوں شانوں کے اندر سینے پر ٹھوڑی کو ٹکا کر چھپا لیا۔ بالآخر بابر نے اندیجان کے شمالی دروازے کو اس کے سپرد کردیا اور وہیں قریب ہی رہائش کا بھی انتظام کردیا۔ بابر کی زبانی خان زادی کی خیریت کے ذکر سے مغل سردار کو یہ شبہ پیدا ہونا لازمی تھا کہ بابر خان زادی میں دلچسپی لے رہا ہے اور ایک مغل سردار کے لیے یہ کوئی عیب کی بات نہیں تھی اگر یہ نوعمر بادشاہ خان زادی کو پسند کر لیتا تو اس کی بقیہ زندگی کے سکون کی ضمانت مل جاتی۔

لیکن علی نواز اس حریص مغل سردار پر مشتعل تھا کہاں وہ فرغانہ سے بھاگنے کے منصوبے بنا رہا تھا اور کہاں یہ عالم کہ بابر کے دربار سے وابستہ ہوگیا وہ بڑی دیر تک آنکھیں چرائے بیٹھا رہا۔

جب مغل سردار قلعے کے شمالی حصے میں کنبے سمیت آگیا تو ایک دن بابر علی نواز کے ساتھ اس سے ملنے گیا۔ مغل سردار نے شاہانہ ضیافت کا اہتمام کیا تھا اس اہتمام میں خان زادی پیش پیش تھی۔ علی نواز نے یہاں صاف صاف یہ دیکھ لیا کہ خان زادی کی ساری عنایتیں اور التفات بابر کے لیے ہیں۔ رشک و رقابت کی آگ روشن ہوگئی لیکن اس آگ کو بابر کے اعتماد اور خلوص کی نمی نے زیادہ بڑھنے نہیں دیا۔ خان زادی کی ماں کو بھی یہ کم سن بادشاہ بہت اچھا لگا اس نے اپنی بے سُری آواز میں نوعمر بادشاہ کو چند گیت سنائے، بابر بہت محظوظ ہوا۔ لیکن واپسی سے قبل اس نے اچانک خان زادی سے سوال کیا "تمہارا اُس دن والا گھوڑا کہاں ہے؟ ذرا ہمیں تو دکھاؤ" پھر علی نواز کی طرف گھوم گیا "اس کا گھوڑا بھی بالکل تمہارے گھوڑے جیسا ہے!"

مغل سردار اور علی نواز گھبرا گئے اور دونوں بابر کی نظریں بچا کے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے اچانک حاضر دماغ خان زادی نے جواب دیا "وہ تو وہیں چوبی مکان میں رہ گیا۔ دراصل وہ ہمارا گھوڑا نہیں تھا۔ مالک مکان کا تھا چنانچہ اس نے ہم سے واپس لے لیا۔"

بابر نے کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے والی روش اختیار کی۔

ایک نئے سردار سے ربط ضبط بڑھانا پرانے سرداروں کو پسند نہ آیا لیکن قاسم بیگ کا یہ خیال تھا کہ نوعمر حکمراں کو نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے نئے سرداروں کو آگے لانا چاہیے۔ کیونکہ پرانوں کی جگہ یہ نئے زیادہ وفادار ثابت ہوسکتے ہیں، محلسرا میں یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ نوعمر بادشاہ کسی نئے مغل سردار سے اس کی عمر میں زیادہ حسین و جمیل بیٹی کی وجہ سے راہ و رسم بڑھا رہا ہے نانی ایسن نے تنہائی میں بابر سے سخت باز پُرس کی اور اسے سمجھایا کہ اب جبکہ اس کا ہونے والا سسر اور چچا سلطان احمد مرزا بڑی مشکلوں سے سمرقند واپس چلا گیا ہے آج نہایت محتاط رہنے کی ضرورت ہے، دربار کے مخالف اور سازشی امرا معلوم نہیں کیا کیا والیٔ سمرقند سے جا کر شکایت لگائیں گے اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ نانی کی رائے میں ابھی اس کا نواسا نابالغ تھا اور اسے یوں بھی عشق و محبت میں ابھی نہیں پڑنا چاہیے، بادشاہ عشق نہیں کرتے۔ حکومت کرتے ہیں۔

بابر محلسرا سے نکل کر جب دربار میں پہنچا تو پتہ چلا کہ اس کا مشہور جرنیل سلطان احمد تنبل اور وزیر حسن یعقوب بھی اس سے کھنچے کھنچے ہیں حسن یعقوب نے تو کسی بات پر یہاں تک کہہ دیا کہ عقلمندی یہ نہیں ہے کہ آدمی پتھر کی طرح کسی ایک ہی جگہ پڑا رہے بلکہ اسے قسمت آزما ہونا چاہیے اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں سرگرداں رہنا چاہیے" بابر نے جب اس بات کی وضاحت چاہی تو وزیر نے یہ کہہ کر بات بنا دی کہ بابر کو فرغانہ کی حدود میں اضافہ کرنا چاہیے اور تیمور کا صحیح جانشین بننے کے لیے ضروری ہے کہ سمرقند بھی قبضے میں ہو اور حکومت وہاں سے کی جائے لیکن حسن یعقوب کا اصل مفہوم اس کے ان پڑھ لیکن ذہین معتمد قاسم بیگ نے بتایا۔ حسن یعقوب بابر سے مطمئن نہ تھا، وہ دوطرفہ سازشوں میں لگا ہوا تھا ایک طرف تو وہ والیٔ سمرقند کو فرغانہ پر قبضہ کر لینے کی ترغیب دے رہا تھا دوسری طرف بابر کے دس سالہ بھائی جہانگیر مرزا کو بابر کی جگہ حکمراں ہونے کی دعوت دے رہا تھا۔ یہ ساری خبریں دینے کے بعد وفادار قاسم بابر کو تسلیاں دینے لگا کہ جب تک وہ موجود ہے تو بابر کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

علی نواز بابر کی وہمی طبیعت سے واقف تھا جب اسے ان باتوں کا علم ہوا تو اس نے انہیں کچھ اور ہی رنگ دینے کی کوشش کی اس نے بابر کو یہ باور کرانا چاہا کہ نیا مغل سردار فرغانہ کے لیے منحوس ثابت ہو رہا ہے اس لیے اس سے جلد از جلد کنارہ کشی اختیار کر لینی چاہیے لیکن بابر تجربوں کے بغیر اس وہم کو دل میں جگہ نہیں دینا چاہتا تھا۔

علی نواز کو یہ سن گن مل چکی تھی کہ بابر کی نانی نے مغلوں اور مشتبہ افراد کے پیچھے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں، اسی وجہ سے وہ مغل سردار سے ملتے کترا رہا تھا

لیکن جب خود بابر نے اس سے یہ کہا کہ جا کر مغل سردار سے ملو اور اس سے معلوم کرو کہ وہ کاشغر یا مغلستان سے کتنی تعداد میں سپاہی بھرتی کر سکتا ہے تو گویا اسے مغل سردار سے ملنے کا ایک شاندار موقع ہاتھ آ گیا۔

اب مغل سردار کے ٹھاٹھ باٹ ہی نرالے تھے۔ اس پاس مصاحب بھی جمع ہو چکے تھے۔ اس نے علی نواز کی شاندار پذیرائی کی کیونکہ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ علی نواز، اس کے لیے خوش قسمتی نہاں ہے۔ اس کی ملاقات کے بعد ہی قسمت نے شاندار پلٹا کھایا تھا۔ وہ مغل سردار کو لے کر اندیجان کے شمالی دروازے سے ملحق دیدبان پر چڑھ گیا اور وہاں موجود مشاہدین کو نیچے بھیج دیا۔ اس دیدبان سے شمال سے آنے والے دشمنوں کی نگرانی کی جاتی تھی اور خطرات کے نمودار ہوتے ہی ڈھول پر زوردار ضرب لگا کر قلعے والوں اور بادشاہ کو خطرے سے آگاہ کر دیا جاتا تھا۔ یہاں دونوں نے تنہائی میں بیٹھ کر بڑی باتیں کیں اور علی نواز مغل سردار کو اس پر آمادہ کرتا رہا کہ وہ کاشغر اور مغلستان سے بابر کے خرچ پر جنگجو مغلوں کی ایک بڑی تعداد قلعے میں جمع کرے اور پھر موقع پاتے ہی اس نادان اور کم عمر بادشاہ کو اپنے قابو میں کر لے لیکن مغل سردار اس پر آمادہ نہ تھا۔ وہ یہ کہتا تھا کہ ایسا ناممکن ہے کیونکہ پرانے امرا فوجی اور شہری اسے اور اس کی سپاہ کو غدار اور نمک حرام قرار دے کر جانیں دینے اور لینے پر آمادہ ہو جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی اگر بابر کو اپنے چچا یا ماموں کی طرف سے مدد مل گئی تو مغل سردار اپنی سپاہ سمیت کہیں کا بھی نہ رہ جائے گا اور تلون مزاج قرار پا کر کسی دربار میں بھی جگہ نہ پا سکے گا۔

علی نواز نے مغل سردار کی دلیلوں سے لاجواب ہو کر کہا۔ "اچھا تب پھر تم بابر سے مل کر یہ کوشش کرو کہ وہ تمہیں اوش یا مرغینان کا قلعہ دار بنا کے بھیج دے۔ تم اندیجان سے دور رہ کر زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل کر سکتے ہو، میں بابر کے قریب رہ کر تمہیں پل پل کی اطلاعیں دیتا رہوں گا اور تم جب بھی مجھے بلاؤ گے حاضر ہو جاؤں گا۔"

مغل سردار نے نیچے فصیل کے گرد کھدی ہوئی خندق کو جھانک کر دیکھا اور بے نیازی سے بولا۔ "لیکن اس خود مختاری کی ہمیں ضرورت ہی کیا ہے؟ ہم سر دست اپنے مستقبل کو خطرے میں نہیں ڈالیں گے!"

علی نواز مایوس ہو گیا۔ جل کر بولا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ لوگوں کا حافظہ اتنا کمزور ہوتا ہے۔ مغل سردار! تم کتنی ہی وفاداری دکھاؤ لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس تیموری بچے کے ہاتھوں مغل سخت ذلیل ہونے والے ہیں!"

مغل سردار نے غصے میں کہا۔ "ذلیل وہ ہوتے ہیں جنہیں اپنی قوتِ بازو پر بھروسا نہیں ہوتا۔"

علی نواز نے بات بنتی نہ دیکھ کر نرمی اختیار کی۔ کہنے لگا۔ "مغل سردار! تمہی نے تو مغل اتحاد پر زور دیا تھا اور آج تمہی اس کی مخالفت کر رہے ہو۔"

اسی دوران اس کے جی میں آئی کہ وہ مغل سردار کو اس خطرے سے آگاہ کر دے کہ شاید بابر خان زادی کو حرم میں ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن فوراً ہی احساس ہوا کہ مغل سردار کہیں اس میں اپنی اہانت نہ محسوس کرے اور اس طرح اس کے اپنے تعلقات کشیدہ ہو جائیں۔ مغل سردار بھی غالباً ناسمجھ اور سازشی مغل نوجوان سے تعلقات بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ جب وہ دونوں دیدبان سے نیچے اترے تو مغل سردار اسے اپنے گھر لے گیا اور وہاں اس کی بڑی تواضع کی۔

سرخ ریشمی کپڑوں میں ملبوس خان زادی اسے دیکھ کر مسکرائی اور علی نواز نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ خان زادی کو شاید سرخ رنگ بہت پسند ہے۔ خان زادی کی ماں نے محسن بادشاہ کی خیریت دریافت کی اور بابر کا ذکر خان زادی بڑی توجہ اور اشتیاق سے سنتی رہی۔

یہاں مغل سردار نے اس کے سامنے ایک بڑی اچھی تجویز رکھی۔ اس نے کہا۔ "بادشاہ کی مصاحبت سے اسے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ اسے اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کرنا چاہیے اور یہ خود اعتمادی اسی طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ بابر کی مصاحبت سے کنارہ کشی اختیار کر کے اس کے پاس آ جائے۔ وہ اسے تربیت دے کر کسی لائق بنا دے گا۔"

علی نواز تو دل سے یہ چاہتا تھا۔ فوراً تیار ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ خان زادی سے قربت میں وہ ضرور اسے اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور اس کا دل بابر کی طرف سے برگشتہ کر دے گا۔ اس نے مغل سردار کی اس پیش کش میں خوشی بھی محسوس کی۔ اس نے سوچا شاید اس طرح مغل سردار اسے خان زادی کے قریب تر لانا چاہتا ہے۔



علی نواز مغل سردار کے ساتھ رہنے لگا۔ بابر کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ مغل سردار نے اس سے سخت محنت لینی شروع کر دی۔ وہ علی نواز کو علی الصباح گھنٹوں فنِ سپاہ گری میں مصروف رکھتا۔ اس کے بعد ناشتہ دیتا۔ ناشتے کے بعد علی نواز کو پانچ میل کی گھڑ دوڑ میں حصہ لینا پڑتا اور تعجب کی بات یہ تھی کہ اس گھڑ دوڑ میں خان زادی بھی حصہ لیتی تھی اور جب خان زادی اس دوڑ میں علی نواز کو شکست دے دیتی تو مغل سردار فخریہ کہتا۔ "یہ میری خان زادی نہیں

خان زادہ ہے مجھے اس پر فخر ہے!"

ایک دن ناشتے کے بعد مغل سرداران کا ساتھ نہیں دے سکا۔ اس کی آنکھیں آشوب کر آئی تھیں وہاں یہ بیماری عام تھی۔ علی نواز خوش تھا کہ آج وہ خان زادی سے بہت ساری باتیں کر سکے گا۔

ان کے گھوڑے ہوا سے باتیں کرتے ہوئے نہر کے کنارے کنارے بھاگ رہے تھے شمال مشرق میں پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب پہاڑ کچھ گیلے گیلے نظر آ رہے تھے مرغابیاں دریائے سیحون کے اوپر شکاری کی تاک میں معلق تھیں۔ علی نواز نے کہا۔ "خان زادی! میں روز روز کی گھڑ دوڑ سے تنگ آ گیا ہوں میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں آؤ یہیں بیٹھ کر کچھ باتیں کریں۔"

دونوں نے لگامیں کھینچ لیں اور گھوڑوں کی رفتار میں کمی آنے لگی۔ علی نواز ایک جگہ سبزے پر کود گیا اور اس کا گھوڑا آگے نکل گیا لیکن پھر اپنے سوار کے پاس واپس آ گیا۔ خان زادی بھی اسی طرح کود دی اور نرم و ملائم سبزے پر دور تک قلابازیاں کھاتی چلی گئی۔ علی نواز نے دوڑ کر اسے اٹھایا اور دونوں سبزہ زار پر بیٹھ گئے۔ خان زادی نے گھاس کو توڑ کر دانتوں تلے دبا لیا اور کہنے لگی "عجیب بات ہے میں خود تم سے باتیں کرنے کا موقع ڈھونڈ رہی تھی لیکن اس کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔"

علی نواز کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی اس نے باتیں سنے بغیر ہی کہا "میں جانتا ہوں تم مجھ سے کون سی باتیں کرو گی تم نے یقیناً محسوس کر لیا ہوگا۔"

"میں بادشاہ کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہوں یہ شمس بادشاہ ہمارے گھر دوبارہ کیوں نہیں آیا کیا یہاں اس نے کوئی مغائرت محسوس کی؟" اس نے دریافت کیا۔

علی نواز نے مایوسی سے جواب دیا "خان زادی! میں تمہیں یہی بات بتانا چاہتا ہوں تمہیں شاید یہ سن کر افسوس ہو کہ بابر تمہیں منحوس سمجھنے لگا ہے اور میں جب یہ باتیں برداشت نہ کر سکا تو تمہارے گھر آ گیا۔"

خان زادی سبزے پر پڑے ہوئے شبنمی موتیوں سے کھیلنے لگی "اچھا تو اس نے یہ کس طرح جانا کہ میں منحوس ہوں؟"

علی نواز نے جواب دیا "گمان ہے کہ تم اسے جب بھی ملیں وہ کسی نہ کسی مصیبت میں ضرور گرفتار ہو گیا۔"

خان زادی خوبصورت انداز میں زور زور سے ہنسنے لگی "خوب! وہ اتنا وہمی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ تمہارا کیا خیال ہے؟"

علی نواز نے جسارت سے کام لیا اور اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن خان زادی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

وہ کہنے لگا "میں تمہیں خوش قسمت اور سعد سمجھتا ہوں" اور اس نے پھر اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی لیکن خان زادی نے بے دلی سے پھر ہاتھ کھینچ لیا۔

اس نے اچانک ایک عجیب سوال کر دیا "تم مغلوں کی کس شاخ سے تعلق رکھتے ہو؟"

علی نواز نے شرما کر جواب دیا "مجھے پتہ نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ہمارے آباؤ اجداد بھی کاشغر یا مغلستان کے اس پار سے فرغانہ آئے تھے۔"

خان زادی نے حیرت سے کہا "تو گویا تم کسی گمنام شاخ سے تعلق رکھتے ہو!"

علی نواز نے بدقت تمام جواب دیا "ہاں ایسا ہی سمجھ لو۔" اس کے بعد اس نے جبراً خان زادی کو اپنی آغوش میں لینا چاہا۔ خان زادی نے مچل کر خود کو چھڑا لیا اور کہنے لگی "تم زیادتی پر اتر آئے ہو میں کسی گمنام خاندان کے مغل نوجوان کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ کس طرح دے سکتی ہوں تمہیں مجھ سے دور دور رہنا چاہئیے!" اسی لمحے اسے شاید بابر کا خیال آ گیا اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور کہنے لگی "لیکن وہ کم سن ہونے کے باوجود شاندار ہے!"

علی نواز نے حسد سے پوچھا "شاید تمہارے خیال میں اس وقت بابر موجود ہے!"

"ہاں!" اس نے اسی اطمینان سے جواب دیا "میں صرف اسے پسند کرتی ہوں تم اپنے بادشاہ سے کہو کہ کبھی کبھی وہ ہمارے پاس بھی آ جایا کرے۔"

علی نواز نے کہا "بادشاہوں کی چاہت کبھی راس نہیں آتی تم مردم شناس نہیں میں کہتا ہوں تم بادشاہ کو اپنے گھر میں مت بلاؤ۔ اس کی چالاک نانی تمہارا ذکر تک سننا پسند نہیں کرتی۔"

خان زادی نے اٹھنا چاہا لیکن علی نواز نے پھر اسے زبردستی بٹھا لیا۔

خان زادی بیزاری سے بولی "تمہیں معلوم ہے کہ میری تربیت مردوں کی طرح ہوئی ہے میں مشکل چیزیں حاصل کرنے کی جستجو میں رہتی ہوں تم مجھ سے دور رہو جب تم پہلی بار ملے تھے تو قطعی ایسے نہیں لگتے تھے تمہیں کیا ہو گیا ہے تم یہ بات اچھی طرح گرہ میں باندھ لو کہ میں اپنی مرضی کی مختار ہوں میں نے اسے قریب سے دیکھا ہے وہ اپنی کم سنی کے باوجود ایک شاندار آدمی نظر آیا۔ تمہارا دوست مجھے مطلوب ہے بہتر ہے کہ تم آئندہ احتیاط رکھو۔"

علی نواز غم اور غصے میں کھول کر چپ ہو رہا۔

سامنے سے کچھ سوار بھاگے چلے آ رہے تھے جیسے جیسے وہ قریب آتے

گئے دونوں مؤدب اور مہذب ہوتے گئے ان میں سب سے آگے ظہیرالدین بابر تھا
اس کے پیچھے قاسم بیگ اور اس کے پیچھے حفاظتی دستہ۔ علی نواز کچھ خوفزدہ تھا۔
لیکن خان زادی اس کی اچانک آمد سے بہت شاداں نظر آتی تھی۔
خود بابر کے چہرے پر خوشی اور تردد کے آثار تھے۔ بابر اور خان زادی
کی نظریں ملیں اور دونوں ہی شرما گئے۔ اس نے خان زادی سے مغل سردار کی
خیریت پوچھی اور علی نواز سے طنزیہ کہا: "تو تمہیں یہ چیز مغل سردار کے گھر کھینچ
لے گئی ہے۔ خوب! آج اتفاقیہ اس گل بدن سے ملاقات ہو گئی۔ علی نواز، ہم دیکھیں
گے کہ یہ ملاقات ہمارے لیے منحوس ثابت ہوتی ہے یا مبارک۔"
علی نواز نے کوئی جواب نہ دیا اور گردن جھکائی۔ بابر ٹھہرا نہیں، اسی
وقت طوفان کی طرح چلا گیا۔



بابر جیسے ہی محل سرا میں داخل ہوا اس کی نانی نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔
وہ اپنی نانی سے بہت خوفزدہ رہتا تھا۔ خان زادی سے ملاقات کے فوراً
بعد نانی کے برہم رہنے کو اس نے خان زادی کی نحوست سمجھا۔
نانی ایسن نے واقعی اسے ایک بری خبر سنائی: "تم اسی وقت لڑاکا
جوانوں کی جمعیت کے ساتھ اخسی کی راہ پر چل پڑو۔ حسن یعقوب جان بچا کر
بھاگ نکلا ہے اور وہ جلد از جلد اخسی پہنچ کر قلعے پر قبضہ کر لینا چاہتا ہے
اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو اخسی میں جہانگیر مرزا کی حکومت کا
اعلان کر کے نظامِ حکومت خود سنبھال لے گا اور تمہیں معزول کرنے کی
کوشش کرے گا۔"
بابر دم لیے بغیر قاسم بیگ کے ساتھ فوج لے کر حسن یعقوب کے تعاقب
میں چل دیا۔ سارے دن کی تلاش اور جستجو کے بعد شام کے قریب اٹھتے ہوئے
گرد و غبار سے حسن یعقوب کا سراغ ملا لیکن یہ گرد و غبار اخسی کی مخالف سمت
سے اٹھ رہا تھا۔ قاسم بیگ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ حسن یعقوب کے وہ ارادے نہیں
تھے جن کا نانی ایسن نے شبہ ظاہر کیا تھا۔ بابر کے دل میں رہ رہ کر یہ خیال آتا
تھا کہ خان زادی کے لمحاتی دیدار نے اسے ایک بڑی پریشانی سے دوچار کر دیا
تھا۔ رات کی تاریکی میں حسن یعقوب نے شب خون مارا اور دونوں فوجوں میں
گھمسان کی جنگ ہوئی۔ صبح ہوتے ہوتے میدان بابر کے ہاتھ رہا اور حسن یعقوب
کی سپاہ زخمیوں اور مردوں کو چھوڑ کر فرار ہو گئی۔ دن کی روشنی میں لاشوں کے
انبار سے حسن یعقوب کی لاش برآمد ہو گئی۔ ایک تیر کنپٹی میں پیوست تھا، دوسرا
کولھے میں۔ بابر نے خدا کا شکر ادا کیا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ مغل سردار کو اندیجان
میں رکھنا اچھا نہیں ہے کیونکہ کسی دن کسی لمحے اور کہیں بھی خان زادی سے اس کی
مڈبھیڑ ہو سکتی تھی ہر چند کہ وہ زیرک اور خوبصورت دوشیزہ اسے بہت پسند آئی
تھی اور وہ اس لڑکی سے مل کر اب کوئی نئی پریشانی نہیں مول لینا چاہتا تھا
لیکن پھر یہ بھی سوچتا کہ تقدیر برامرِ ربی ہے۔ یہ فضول توہمات ہیں۔ جو خدا
چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ ایک سچے مسلمان کو وہم پرست نہیں ہونا چاہیے
دل کی گہرائیوں میں کہیں یہ خواہش بھی موجود تھی کہ خان زادی سے چند ملاقاتیں
کر کے اس وہم کو آزمانا ضرور چاہیے۔ کچھ دیر بعد اس خواہش کو ایک دوسرے خیال
نے خان زادی سے لگاؤ کا جذبہ قرار دیا۔ اسی لمحے نانی ایسن کی غضبناک شکل
سامنے آ گئی جو اسے ڈانٹ ڈانٹ کر یہ بتا رہی تھی کہ خبردار جو کسی لڑکی پر مائل
ہوا تیری شادی تو چچا سلطان احمد مرزا کی بیٹی عائشہ سلطان سے طے پا چکی
ہے۔ بابر نے محسوس کیا جیسے اس کی نانی کہہ رہی ہو کہ اگر خان زادی کے ساتھ
تیرے نام نے شہرت حاصل کی تو سارا خاندان تیرا مخالف ہو جائے گا اور فرغانہ کی
حکومت خطرے میں پڑ جائے گی۔ بابر نڈھال ہو گیا۔ وہ بڑی بے بسی کا شکار تھا۔
دوسری طرف خان زادی بھی کش مکش کا شکار تھی۔ اسے بابر اچھا
لگتا تھا لیکن وہ عمر میں اس سے چھوٹا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے بارہا اس کا تذکرہ کیا۔
نو عمری کی وجہ سے دونوں کی عمروں کا چند سالہ فرق بہت نمایاں نظر آتا تھا
لیکن آگے چل کر یہ فرق ناقابلِ محسوس ہونے والا تھا۔ خان زادی کی ماں بارہا
اس فرق کو محسوس کر کے اسے آگے قدم بڑھانے سے روکتی تھی لیکن
خان زادی کی رگوں میں مغل خون رواں تھا جس میں جرأت، دلیری،
ہوشیاری اور موقع شناسی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ یہ بھی خوب جانتی
تھی کہ اس کا باپ مغل سردار اس کے معاملاتِ قلب میں حائل نہیں ہو سکتا
تھا اور یہ کہ اس نے اپنے لیے جس شخص کا انتخاب کیا تھا وہ کوئی معمولی انسان
نہ تھا۔ وادیٔ فرغانہ کی سب سے بڑی شخصیت تھی۔ ہاں بس ایک ہی حجاب
مانع تھا، وہ یہ کہ بابر عمر میں اس سے چھوٹا تھا۔ خان زادی کو اپنے باپ سے
ایک شکایت ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے خیال میں مغل سردار معلوم نہیں
کیوں علی نواز کو بہت زیادہ منہ لگا رہا تھا۔ اگرچہ اسے علی نواز سے نفرت نہیں
تھی تو انسیت بھی نہ تھی اور یہ شخص اس وقت تو بہت زیادہ برا لگتا جب وہ
خان زادی سے اظہارِ عشق کرتا۔ جب سے اس نے یہ بتایا تھا کہ بابر، خان زادی کو
اپنے لیے منحوس سمجھتا ہے، اس کے سینے میں رنج اور افسوس کی آگ سلگ رہی تھی۔ وہ
اپنی ماں کے سامنے بہت روئی۔ علی نواز نے جب خان زادی کی یہ حالت دیکھی تو
اسے خود سے نفرت ہونے لگی۔ وہ بابر سے مل کر اس کی تصدیق کرنا چاہتی تھی کہ

ایکی

فرانسیسی نوجوان تین سال تک لندن میں رہا اور تعلیم حاصل کرتا رہا جب وہ وطن واپس جانے لگا تو اپنے انگریزی کے اُستاد سے الوداعی ملاقات کرنے گیا۔ اُس نے جذباتی آواز اور غلط سلط انگریزی میں اُستاد کا شکریہ کرتے ہوئے کہا۔ "اُستادِ محترم! آپ نے جس انہماک اور توجہ سے مجھے انگریزی پڑھائی ہے اُس کا میں شکرگزار ہوں، براہِ کرم مطلع فرمائیں کہ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

اُستاد نے جواب دیا "تم میری بس ایک ہی خدمت کرسکتے ہو۔"

"وہ کیا ارشاد؟" فرماں بردار شاگرد سراپا التجا بن گیا۔ اُستاد نے کہا۔ "جب تم وطن واپس جاؤ تو وہاں کسی کو یہ مت بتانا کہ تمہیں انگریزی میں نے پڑھائی ہے۔"

◆◆

کیا وہ اُسے واقعی منحوس تصور کرتا ہے، اسے بابر کے بڑے ہوجانے کا بھی انتظار تھا۔

علی نواز مغل سردار کی زیادہ سے زیادہ تابعداری بجا لا کر اسے زیر بار ممنونِ احسان کررہا تھا۔ خان زادی اب اُسے مشکوک نظروں سے دیکھتی تھی اور اسے ڈر تھا کہیں مغل سردار علی نواز سے متاثر ہوکر کوئی ایسا ویسا وعدہ نہ کرلے جس کا پورا کرنا خان زادی کی مرضی کے خلاف ہو۔

ایک دن دوپہر کا کھانا کھا کر مغل سردار نے قیلولے کی غرض سے جیسے ہی اپنی کمر مسہری سے لگائی، خان زادی باتیں کرنے کے لیے اس کے پاس پہنچ گئی، اب علی نواز گھر کا ایک فرد بن چکا تھا۔ خان زادی ساری باتیں علی نواز کی موجودگی ہی میں کرلینا چاہتی تھی، اس نے مغل سردار سے پوچھا "باواجان! آپ مجھے خان زادی سمجھتے ہیں یا خان زادہ؟"

مغل سردار کی مونچھ کے دونوں سرے ذرا جھک گئے تھے ان پر باری باری انگلیاں پھیرتا ہوا بولا "میں نے تجھے ہمیشہ ہی خان زادہ سمجھا ہے لیکن اس وقت تو نے یہ سوال کیوں کیا؟"

خان زادی کے چہرے پر سکون اور طمانیت پیدا ہوگئی "بس میں یہی جاننا چاہتی تھی کیونکہ آپ کے نزدیک اگر میں خان زادہ ہوں تو خان زادے کو اتنا اختیار یقیناً ملنا چاہیئے کہ اپنی زندگی کا شریکِ سفر جسے چاہے بنائے جسے چاہے مسترد کردے۔"

مغل سردار خان زادی کا اصل مفہوم پا گیا۔ اس نے علی نواز کی طرف دیکھا جس کی حالت بہت زیادہ غیر ہورہی تھی اور وہ کچھ کہنے کے لیے بہت بے چین تھا۔ ابھی مغل سردار اس کے چہرے کے کرب پر غور ہی کررہا تھا کہ علی نواز نے پہلو بدلتے ہوئے مغل سردار کو مخاطب کیا "خان زادے کو اس کا ذمے دار اور زمانہ شناس باپ کسی غلط فیصلے یا انتخاب پر متنبہ ضرور کرسکتا ہے کیونکہ نوجوان عموماً اپنے قلبی اور جذباتی معاملات میں غلط فیصلے کرجایا کرتے ہیں، اور ایک ذمے دار باپ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو کسی غلط فیصلے سے محفوظ رکھے۔"

خان زادی کا چہرہ تمتما گیا۔ بگڑ کر بولی "علی نواز! تم اس کنبے کے آدمی نہیں ہو، تمہیں ہمارے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیئے، باواجان کی بات دوسری ہے وہ اپنی ذات کی حد تک تمہاری دخل اندازی گوارا کرسکتے ہیں لیکن خود تمہیں یہ ضرور معلوم ہونا چاہیئے کہ تم کیا ہو، کون ہو؟ اور تمہیں کہاں بولنا اور کہاں چپ رہنا چاہیئے۔"

مغل سردار اس تو تو میں میں سے ذرا پریشان ہوگیا۔ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور پوچھا "اصل معاملہ کیا ہے؟ تم دونوں آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟"

خان زادی کے سُرخ سُرخ سیبوں جیسے رخساروں میں انگاروں کی حرارت آگئی "باواجان! آپ نے مجھے خاص تربیت دی ہے، میں خود مختار ہوں، اپنی زندگی کا بڑے سے بڑا فیصلہ میں خود کرسکتی ہوں، مجھے مصاحبت سے سخت نفرت ہے وہ لوگ جو بدقسمتی سے کسی دربار میں مصاحب رہ چکے ہوں ہرگز اس لائق نہیں ہوتے کہ ان کی عقل و دانش یا خودی اور خودداری پر بھروسا کیا جائے مصاحب ایک دربار سے نکلے گا دوسرا دربار تلاش کرلے گا یہاں تک کہ ایسا شخص مصاحبت کرتے ہوئے بادشاہ اور قلعے دار میں بھی کوئی فرق نہیں محسوس کریگا۔"

علی نواز اُٹھ کر کھڑا ہوگیا "مغل سردار! اس کا غصے سے بُرا حال تھا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے بابر کو چھوڑ کر اپنے ہم قوم سردار پر بھروسا کیا اور سب سے زیادہ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ایک لڑکی اپنے باپ کے روبرو مجھے ذلیل کررہی ہے اور مغل سردار سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی میری اپنی بدقسمتی سے یہی پوچھ رہا ہے کہ "اصل معاملہ کیا ہے تم دونوں آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟"

مغل سردار نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بٹھانے کی کوشش کرتا ہوا بولا "تم یہاں بیٹھو تو معاملہ کچھ نازک صورت اختیار کرگیا ہے ساری باتیں ابھی صاف ہوئی جاتی ہیں، وہ خان زادی ہو یا تم میرے لیے دونوں ہی برابر ہیں، میں مغل ہوں، انصاف پسند، منصف مزاج یقین رکھو میں زیادتی کسی پر بھی نہ ہونے دوں گا!"

انصاف پسند اور منصف مزاج مغل سردار کو ٹھنڈے دل سے کوئی

فیصلہ کرنا چاہیئے اور علی نواز کو بھی کسی ایسی شے کی امید نہیں کرنی چاہیئے جو اس کی حیثیت اور اوقات سے برتر ہو۔" خان زادی نے جوشیلے انداز میں کہا۔

"چپ رہ بالونی لڑکی" مغل سردار نے اسے ہولے سے تھپکی دی "میں کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتا" پھر کچھ توقف کے بعد مغل سردار کی آواز گونجی "میں اپنے خان زادے کو اس کی مرضی کے خلاف کسی فیصلے پر مجبور نہیں کر سکتا" خان زادی کے ہونٹوں پر فرطِ خوشی سے مسکراہٹ ابھر آئی۔

مغل سردار نے مزید کہا "اور میں اپنے خان زادے سے یہ درخواست بھی کروں گا کہ اس نے جو فیصلہ کر رکھا ہے اس پر ایک بار نظر ثانی بھی کرے کیونکہ ہمیں سرِ دست کسی ایسی شے کی تمنا نہیں کرنی چاہیئے جس کی حصولیابی اپنی دسترس اور امکان سے بالا ہو۔"

خان زادی غمگین آواز میں بولی "افسوس کہ دسترس اور امکان کی بات وہ مغل سردار کر رہا ہے جس نے اپنی ہمت اور حوصلے کے آگے دنیا کی کسی بھی شے کو اپنی دسترس اور امکان سے باہر نہیں سمجھا۔"

مغل سردار کچھ شرمسار ہو گیا "یہ بات نہیں ہے لڑکی" وہ اسے سمجھانے لگا "دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، ہمیں اندیشہ ہے کہ قلعے میں بیٹھ کر اپنے اصل حوصلے اور ہمت کی بات نہیں کرنا چاہیئے۔"

"وہ کچھ بھی ہو" خان زادی کہنے لگی "مجھے اتنی مصلحت اندیشی نہیں آتی میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ میں نے دل میں ایک بار جو فیصلہ کر لیا ہے زندگی کے آخری لمحات تک اس پر قائم رہوں گی۔"

مغل سردار نے تشویش سے پوچھا "تو نے کیا فیصلہ کر لیا ہے اپنے دل میں؟"

خان زادی نے نظریں جھکالیں "آپ لوگ اس فیصلے سے خوب واقف ہیں؟"

کچھ دیر کے لیے سناٹا طاری ہو گیا۔ پھر مغل سردار کی آواز سنائی دی۔ علی نواز سے مخاطب ہوا "مغل نوجوان! میں چاہتا ہوں کہ تمہیں تاریکی میں نہ رکھوں" پھر ذرا رک کر بولا "یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ تمہیں خان زادی کے سلسلے میں غلط توقعات نہیں لگانی چاہئیں، خان زادی اپنی مرضی کی مالک ہے میں اسے کسی بات پر مجبور نہیں کر سکتا۔"

علی نواز کے چہرے پر افسردگی چھا گئی لیکن خان زادی کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

• خان زادی نے باپ کو تشکر آمیز نظروں سے دیکھا اور وہاں سے جانے لگی لیکن باپ نے اسے روک لیا۔ اس نے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ذرا ٹھیرو، میری ایک بات سنتی جاؤ!"

خان زادی رک گئی اور بے بسی اور تجسس سے باپ کو دیکھنے لگی۔

مغل سردار نے کہا "اگر کوئی فیصلہ درست بھی ہے تو اس کے نفاذ سے پہلے خالی اوقات میں اس کے اچھے برے اور ممکن ناممکن پہلوؤں پر غور کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ مغل سردار کا مشورہ ہے، باپ کا حکم نہیں ہے" اس کے بعد ایک تائیدی لہجے خان زادی کو دیکھا اور وہاں سے چلے جانے کی اجازت دے دی۔

خان زادی بھی مغل سردار کی بیٹی تھی، جاتے جاتے کہہ گئی۔ "مجھے صرف وقت کا انتظار ہے، چند سالوں کا انتظار" اس کے بعد اس نے علی نواز پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔ بولی "عقاب اپنا نشیمن بلند پہاڑوں کی کھوہ میں بناتا ہے اسے میدانوں کی پستی سے کیا واسطہ!"

مغل سردار ہنسنے لگا۔ بولا "دیکھا میرے خان زادے کو وہ میری تربیت کے عین مطابق ہے"۔ اس کے بعد علی نواز کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ جب وہ مغل سردار کے بالکل قریب پہنچ گیا تو اس نے علی نواز کے کان میں سرگوشی سے کہا "خان زادی کے لیے تمہیں عقاب بننا پڑے گا، کچھ کر کے دکھاؤ، ورنہ یہ سمجھو کہ سرکش اور خود سر لڑکی مغل سردار کے قابو کی بھی نہیں ہے۔ تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیئے!"

علی نواز کسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے گویا مغل سردار کی بات سنی ہی نہ تھی، سر اٹھا کر بولا "تب پھر میرا خیال ہے مجھے اب یہاں مزید نہیں رکنا چاہیئے، میں اپنے دوست کے پاس چلا جاؤں گا اور پوری زندگی اس کی وفاداری اور اطاعت میں گزار دوں گا!"

"ہونہہ!" مغل سردار ناراض ہو گیا "پھر وہی مصاحبت کا خیال! اگر تم اتنے ہی دوں ہمت اور کم حوصلہ ہو تو میری خان زادی نے تمہیں ٹھیک ہی سمجھا ہے اگر تم مغلوں کی کسی معروف شاخ سے ہوتے تو اتنے کم ہمت اور غیر مستقل مزاج ہرگز نہ ہوتے۔"

علی نواز شرمسار بھی ہوا اور مغل سردار کی زد پر غصہ بھی آیا "سردار! مجھے طعنے نہ دو، میں عقاب بننے کی کوشش کروں گا محض اس امید پر کہ ممکن ہے عقاب بن کر میں کوئی اعلیٰ مقام حاصل کر لوں لیکن اس سے پہلے ایک یہ خیال بھی دل میں آتا ہے کہ میں جس شے کے سینے میں چھپی ہوئی چنگاری کو اپنی کوششوں سے شرر بار کرنا چاہتا ہوں، اسے میری کوششوں سے پہلے ہی کوئی دوسرا شرر بار نہ کر دے۔"



کے شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی میں اپنا جواب رکھتے تھے۔ ملک کی نامی گرامی شخصیتوں سے اُن کی دوستی تھی اور مطب میں اُن کی نشست و برخاست رہتی تھی۔ ایک دن مولانا عبدالمجید سالک مرحوم جو مطب میں داخل ہوئے تو دیکھا شہر کی مشہور طوائف 'نجو بی' بھی تشریف فرما ہیں۔

چشتی مرحوم سالک کو دیکھتے ہی پھڑک گئے۔ نجو سے فرمایا "نجو! یہ شہر کے مشہور شاعر صحافی اور ادیب سالک صاحب ہیں، اُٹھو اور آداب بجالاؤ۔"

نجو سرو قد اُٹھی اور جھک کر آداب بجالائی۔

اب چشتی صاحب مولانا سالک سے مخاطب ہوئے اور نجو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جناب والا! یہ لاہور کی مشہور طوائف نجو ہیں۔ گو آپ اس کوچے سے نابلد ہیں لیکن خیال ہے کہ آپ نے ان کا نام ضرور سنا ہوگا۔"

سالک صاحب نے عرض کیا "جی ہاں نام تو سنا ہے لیکن سوچتا ہوں کہ یہ نجو کیا نام ہوا بھلا۔"

چشتی صاحب کی ظرافت عود کر آئی۔ سنجیدگی سے فرمایا "جناب! لوگ انہیں نجو نجو کہتے ہیں ورنہ ان کا پورا نام تو نجات المومنین ہے۔"

مغل سردار نے حقارت سے کہا "تم لوگ عشق و محبت جیسے فضول معاملات میں کتنی زیادہ عقل ضائع کر دیتے ہو اور تمہاری سمجھ میں یہ ذرا سی بات نہیں آتی کہ ہماری کامرانیاں عقل، دل، اعصاب اور اعضا کی یکجہتی، اتحاد اور اتفاق کی تابع ہیں۔ تم نوجوان عقل، اعصاب اور اعضا کو دل کا تابع بنا کر سرخرو ہونا چاہتے ہو، بھلا یہ کس طرح ممکن ہے!"

علی نواز نے سوالیہ نظروں سے مغل سردار کو دیکھا۔

مغل سردار نے کسی قدر فکرمندی سے پوچھا "کیا یہ درست ہے کہ بابر میری خان زادی کو اپنے حق میں منحوس خیال کرتا ہے!"

بڑا اُمید افزا سوال تھا علی نواز نے فوراً جواب دیا "ہاں یہ درست ہے"

مغل سردار نے کہا "پھر تم کیوں مایوس ہوتے ہو کچھ کر گزرنے کی کوشش جاری رکھو اور نتائج خدا پر چھوڑ دو، وہ شاید تمہاری محنت اور خلوص رائیگاں نہیں جانے دے گا۔"

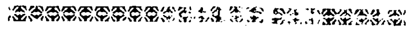


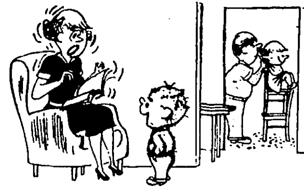
اس گفتگو کے بعد یہ طوفان بہت دنوں تک کا رہا۔ سمرقند میں بابر کے چچا سلطان احمد مرزا کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا بائسنقر تخت نشین ہو گیا۔ بابر کی نظریں رہ رہ کر سمرقند کی طرف اُٹھتی تھیں اور مایوسی سے جھک جاتی تھیں وہ زبردست تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ مغلوں اور ترخانوں کی ایک بڑی فوج جمع ہو گئی لیکن ان میں سرکشی بہت زیادہ پائی جاتی تھی، ترخان تو بہت زیادہ سر چڑھ گئے تھے۔ یہ ترخان فوج میں اس لیے شامل ہو جاتے تھے کہ انہیں جنگ و جدل کے علاوہ لوٹ مار کا فن دوسروں سے اچھا آتا تھا اور انہیں یہ رعایت ملی ہوئی تھی کہ یہ جو کچھ لوٹتے تھے سب کچھ انہی کا ہو جاتا تھا یہاں تک کہ بادشاہ بھی ان سے اپنا حصہ نہیں مانگ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کو بڑے بڑے سنگین ترین جرموں تک معافی حاصل تھی، بابر ان سب کو اپنے ارد گرد جمع ہوتے دیکھ رہا تھا اور خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ جب وہ خود کو بہت مضبوط تصور کرنے لگا تو اسے خان زادی کی یاد آئی وہ اب خان زادی سے مل کر اس کی نحوست کے اثرات کا مشاہدہ ضرور کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ بابر اس سے شدید طور پر متاثر ہے مگر اسے قبول کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔

دوسری طرف علی نواز بھی اپنی کوششوں میں لگا ہوا تھا اس نے خان زادی سے بارہا باتیں کیں لیکن پیاری باتیں ادھر اُدھر کی ہوا کرتی تھیں، بابر سمرقند جانے کی تیاریاں کر چکا تھا اس کا کہنا تھا کہ اگر حکومت کرنی ہے تو پھر سمرقند سے کرنی چاہیئے۔ اب بابر کچھ زیادہ وجیہہ صحت مند اور توانا ہو گیا تھا۔

نانی ایسن سانپ کی طرح اس کے چال چلن اور کردار کی نگرانی کر رہی تھیں، خان زادی سے وہ بھی کسی حد تک واقف تھیں، شاہی محل کے دروازے اس پر بند تھے اور اس کی خواہش تھی کہ اس کے باپ مغل سردار کو اندیجان کے باہر کسی قلعے پر متعین کر دیا جائے لیکن بابر نے مغل سردار کی بابت خود فیصلہ کیا، وہ اسے اپنے ساتھ سمرقند لے جانا چاہتا تھا کیونکہ سمرقند کے اندر اور باہر اس کے چچا زاد بھائی آپس میں لڑائیاں لڑ رہے تھے۔

اندیجان کے وسیع میدان میں مختلف اقوام اور نسلوں پر مشتمل جمع ہونے





کفایت شعاری

"امّی! ابّا جان پوچھ رہے ہیں۔ بے بی کے بال کس طرح کے کاٹوں"

والے لشکروں کا ولولہ انگیز تماشا خان زادی نے بھی دیکھا۔ وہ یہاں بابر کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے چین تھی اس نے تین سال بڑے صبر اور تحمل سے گزار دیے تھے، بابر بھی اس کی یاد سینے میں دبائے ہوئے تھا لیکن وہ دور ضرور رہا تھا وہ اپنی کم سنی کا دور کسی بڑی مشکل میں پھنسے بغیر نکال دینا چاہتا تھا اور اس کے خیال میں یہ اسی طرح ممکن تھا کہ وہ خان زادی سے دور دور رہے اور اس بات کی کوشش کرے کہ ان کا آپس میں آمنا سامنا نہ ہو۔

تین سال کے وقفے نے خان زادی کو لبالب کر دیا تھا۔ اشتیاق اور فراق نے شکوہ و شکایات سے لبریز کر دیا تھا اور وہ خود میں اتنی ہمت محسوس کرنے لگی تھی کہ اگر کسی طرح اس کا بابر سے آمنا سامنا ہو جائے تو وہ بہت کچھ کہہ گزرے گی، اس کا انجام کیا ہو گا، خان زادی کو اس بات کی ذرا بھی فکر نہ تھی۔

علی نواز بھی اس مہم میں اس توقع پر جا رہا تھا کہ شاید وہاں کچھ کارہائے نمایاں دکھا سکے جس سے خان زادی کے دل میں قدر و منزلت حاصل ہو جائے۔ اس نے چلتے چلاتے خان زادی سے ایک وعدہ لینا چاہا۔ اس نے گم سم خیالوں میں ڈوبی ہوئی خان زادی کو اکیلے میں روک لیا اور لڑکھڑائی آواز میں کہا۔ "خان زادی! میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"کہو!" خان زادی نے دل گرفتہ آواز میں کہا۔

علی نواز کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ کئی بار ہونٹ ہلے منہ کھلا اور کپکپا کر رہ گیا۔

خان زادی نے بے زاری سے کہا۔ "ڈرتے کیوں ہو، جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہہ دو۔"

علی نواز کہنے لگا۔ "آج سے تین سال پہلے تم نے ایک بات کہی تھی، معلوم نہیں وہ بات تمہیں اب بھی یاد ہے یا نہیں!"

"کون سی بات؟"

"تم نے کہا تھا کہ تم عقاب ہو جو بلند پہاڑوں کی کھو میں اپنا نشیمن بناتا ہے، تمہیں میدان کی پستی سے نفرت ہے!"

"ہاں مجھے یاد ہے، میں نے یہ کہا تھا!" خان زادی بڑے انہماک سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"آج میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا تم کسی ایسے بلند و بالا پہاڑ کی کھو میں بھی اپنا نشیمن بنانا پسند کرو گی، جو تمہارے منتخب پہاڑ سے بھی زیادہ اونچا ہو!"

خان زادی کسی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی۔ "پستیاں کس طرح بلند ہو سکتی ہیں؟ یہ بات میری سمجھ میں تو آتی نہیں۔"

علی نواز نے جواب دیا۔ "آدمی کا حوصلہ بڑی چیز ہے، اسے جامد بلندیوں اور پستیوں کی مثال سے سمجھنے کی کوشش مت کرو۔ میں کوشش کروں گا اور اپنی اس کوشش میں میں یا تو کوئی بڑا کارنامہ انجام دوں گا یا پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لوں گا۔"

خان زادی بہت اداس تھی، کوئی فیصلہ کن جواب نہ دے سکی، خاموش چپ چاپ اس کی شکل دیکھتی رہی۔

علی نواز نے کہا۔ "میں جواب چاہتا ہوں خان زادی، تمہیں اپنے وعدے پر قائم ضرور رہنا چاہیے۔"

وعدہ بہت مشکل تھا لیکن اس وقت خان زادی جن کیفیات کا شکار تھی، انہوں نے اسے کچھ بے بس کر دیا تھا۔ وہ ٹکٹکی لگائے کچھ دیر تک علی نواز کو دیکھتی رہی، پھر آہستہ سے بولی۔ "میں ایک شرط پر تم سے وعدہ کر سکتی ہوں۔"

علی نواز نے پتھر کو گداز ہوتے جو دیکھا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی، فرطِ خوشی میں کہنے لگا۔ "مجھے تمہاری شرط منظور ہے!"

خان زادی نے کہا۔ "کام مشکل ہے تم مکر تو نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں!" وہ کہنے لگا۔ "تمہیں اندازہ ہے کہ میں تمہارے ایک اشارے پر کیا کر سکتا ہوں، اس کے باوجود میں تمہیں فتح نہیں کر سکا۔ بہر حال میرا نام علی نواز ہے، میں غیر معمولی انسان بننا چاہتا ہوں اور ایک غیر معمولی انسان جو وعدہ کرے گا اسے ہر قیمت پر پورا کرے گا!"

خان زادی نے شکست خوردہ سپاہی کی طرح گردن جھکائی، آہستہ سے بولی۔ "جانے سے پہلے ایک بار میری بابر سے ملاقات کرا دو۔"

علی نواز کو جیسے لقوہ مار گیا۔ سن ہو کر رہ گیا۔ "بابر سے ملاقات؟ تم ملو گی

بابر ہے لیکن کیوں؟"

خان زادی نے بھنویں سکیڑ لیں "تم اپنا وعدہ پورا کرو۔ مجھ سے سوالات مت کرو۔"

علی نواز کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔

خان زادی نے مذبذب علی نواز کو ایک جھڑکا لگایا، کہنے لگی "مجھے مذبذب سے نفرت ہے، تمہیں فوراً فیصلہ کرنا چاہیئے۔ اگر ملانا چاہتے ہو تو کہہ دو کہ ہاں ملا دوں گا اگر نہیں ملا سکتے تو کہہ دو نہیں ملا سکتا۔ خواہ مخواہ سوچ بچار میں وقت کیوں ضائع کرتے ہو!"

"لیکن ایک بات ہے" وہ تردد سے بولا "میں بابر کو تم سے ملاقات کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش تو ضرور کر سکتا ہوں لیکن ملانے کا وعدہ نہیں کر سکتا۔"

"یہ کیوں؟"

"یہ اس لیے کہ بابر ذرا وہمی نوجوان ہے۔ اس کے دل میں معلوم نہیں کیوں یہ شبہ بیٹھ گیا ہے کہ جب وہ تم سے ملتا یا تمہیں دیکھ لیتا ہے کسی نہ کسی مصیبت میں ضرور گرفتار ہو جاتا ہے!"

خان زادی کے دل پر گھونسا سا لگا، جل کر بولی "یہ بیکار باتیں ہیں۔ تم اس سے ذکر تو کرو جا کر، اگر وہ چاہے گا تو مل لے گا اور اگر نہیں چاہے گا تو نہیں ملے گا۔"

علی نواز نے کہا "اچھا، میں کوشش کروں گا اور پوری پوری کوشش کروں گا کہ بابر تم سے ملاقات کر لے۔"

"لیکن ہم دونوں کی اس گفتگو کا علم بابا جان کو نہیں ہونا چاہیئے!"

"یہ میرا وعدہ ہے!"

"ایک بات اور" وہ اب بھی فکر مند تھی۔

"وہ کیا؟"

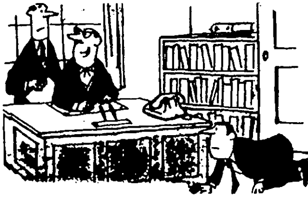
"وہ یہ کہ میں کس طرح یہ یقین کروں گی کہ تم نے بابر کو مجھ سے ملاقات کرنے پر مجبور تو کیا تھا لیکن وہ تیار نہیں ہوا!"

سوال واقعی فکر انگیز تھا۔

خان زادی کہنے لگی "تمہیں کوئی ایسی ترکیب اختیار کرنا چاہیئے کہ میں مطمئن ہو جاؤں۔"

علی نواز چکرا گیا، بولا "ایسی کوئی ترکیب اپنی سمجھ میں تو آتی نہیں، تم ہی خود سوچ کر یہ بتاؤ کہ میں کس طرح تمہیں مطمئن کر سکتا ہوں۔"

خان زادی نے کہا "بڑی آسان ترکیب ہے!"



منیجر: "جب سے میں نے اپنی میز یہاں رکھوائی ہے سارے ملازم وقت پر آنے لگے ہیں۔"

"وہ کیا؟"

خان زادی کہنے لگی "یہ طے ہے کہ بابر اپنے محل کے اس پاس تو مجھ سے ملے گا نہیں، تم کسی طرح اس کو سیب اور خوبانیوں کے اس باغ میں لے آؤ جو ویران پڑا رہتا ہے۔ تم بابر کو کسی طرح خوبانیوں کے اس جھنڈ تک لے آنا جس کے قریب سبزے پر ایک سرخ کپڑا پڑا ملے، یہ کپڑا اس بات کی علامت ہو گا کہ میں اسی جھاڑی میں چھپی ہوئی ہوں۔ تم وہیں کھڑے کھڑے بابر کو مجھ سے ملنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرنا۔ اگر اس وقت بابر مجھ سے ملنے پر نہ بھی آمادہ ہوا تب بھی مجھے تم سے کوئی شکایت نہ ہو گی۔"

"اچھا!" علی نواز نے کہا "آج دوپہر ظہر کی نماز کے بعد بابر کو لے کر وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

خان زادی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا، تیزی سے اندر گئی اور وہاں سے سرخ اور عنابی موتیوں کا قیمتی ہار لے کر واپس آئی۔ یہ ہار خان زادی خوشی کے موقعوں پر پہنا کرتی تھی، اسے علی نواز کے حوالے کر دیا۔ کہنے لگی۔

"یہ میری یادگار ہے اسے تم اپنے پاس رکھو!" پھر کچھ سوچ کر بولی "لیکن اس سے کسی غلط فہمی میں بھی مبتلا نہ ہو جانا، میں ایک بار پھر یہی کہوں گی کہ گمنام خاندان کا کوئی شخص مجھے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا، ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ اگر خاندان گمنام ہے تو اس شخص کو اپنے کارہائے نمایاں سے اپنے خاندان کو شہرت اور نیک نامی بخشنی چاہیئے۔"

علی نواز کو ایسا لگا جیسے خان زادی کا دماغی توازن درست نہیں ہے، کہنے لگا "لیکن تم اس پر بھی غور کرتی رہنا کہ جتنی میں تمہاری پرستش کر سکتا ہوں کوئی دوسرا نہیں کرے گا۔"

خان زادی ہنس دی "بے وقوف، پھر وہی پست خیالی! مجھے پرستار

نہیں لائقِ پرستش شخص درکار ہے، میں خود پرستش کرنا چاہتی ہوں، پرستش کرانا نہیں چاہتی۔"

علی نواز لاجواب ہو کر چُپ ہو رہا۔

جب علی نواز بابر کو کسی طرح راضی کر کے خوبانیوں کے جھنڈ کے پاس پہنچا تو وہ بہت حیران تھا، سامنے جھاڑی کی جڑ میں سبزے پر ایک سرخ کپڑا پڑا ہوا تھا۔ علی نواز اور بابر گھوڑوں سے نیچے اُتر کر سبزے پر بیٹھ گئے۔ شمال سے جنوب کی طرف بھاگنے والے سیاہ ابر کے ٹکڑے بہت نیچے تک آ گئے تھے۔

علی نواز نے خان زادی کی خواہشِ ملاقات کا ذکر بڑے مؤثر انداز میں کیا اور آخر میں کہا۔ "اس ناچیز نے اس اُمید پر خان زادی کو ملانے کا وعدہ کر لیا ہے کہ فرغانہ کی حکمرانی سے پہلے یہاں کا بادشاہ اس غلام کا دوست تھا۔"

بابر سوچنے لگا۔ "لیکن ہم اس وقت اُس سے کیونکر مل سکتے ہیں!!"

"کیوں؟" علی نواز نے کہا۔ "جناب اگر چاہیں تو صرف نصف ساعت کے لیے اسے ملنے کا موقع دے سکتے ہیں!"

بابر نے کہا۔ "ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمارے پاس اُس سے ملنے کا وقت نہیں ہے ہم اُسے دیکھنے کے خواہشمند ہیں، وہ ایک اور ہی بات ہے جو زبان پر نہیں آ رہی!"

علی نواز نے کہا۔ "اچھا سمجھا لیکن اس کی حیثیت ایک داشتہ سے زیادہ نہیں ہے!"

بابر نے جواب دیا۔ "وہ سب کچھ صحیح لیکن اس نازک موقع پر ہم کسی بدشگونی سے دوچار نہیں ہونا چاہتے۔ سمرقند سے واپس آ کر اس سے ضرور ملاقات کریں گے!"

علی نواز نے اصرار کیا۔ "آپ ایک سچے مسلمان ہیں، جب آپ ہی دین کے خلاف چلیں گے تو رعایا کا کیا ذکر، الناس علیٰ دین ملوکہم رعایا اپنے حکمراں کے نقشِ قدم پر چلے گی۔"

بابر کچھ پسیجا۔ دریافت کیا۔ "مگر ہم نے محسوس کیا تھا تم بھی تو اُس سے متاثر تھے کیا تم خان زادی کا دل جیتنے میں ناکام رہے ہو؟"

علی نواز ذرا گھبرا گیا۔ بولا۔ "دل جیتنا کیسا جناب، جو لڑکی اپنے بادشاہ کی پرستار ہو کوئی دوسرا اسے کس طرح جیت سکتا ہے!"

بابر کچھ سوچتا ہوا پھر بولا۔ "ہمارا دل عجب کش مکش میں مبتلا ہے اس کے دلکش چہرے کو دیکھنے کی آرزو ہے اور دل اس کی ملاقات پر آمادہ بھی نہیں ہوتا کیونکہ ہم وہم کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتے۔"

علی نواز نے مایوسی سے کہا۔ "اچھا جیسی جناب کی مرضی لیکن یہ داغ زندگی بھر دل میں موجود رہے گا کہ نیک دل اور شریف بابر نے اپنے ایک حقیر دوست اور غلام کی حقیر سی خواہش رد کر دی تھی۔"

بابر نے پوچھا۔ "اچھا تم اسے ہم سے کب مِلا سکتے ہو؟"

"جب آپ چاہیں!"

بابر نے گرد و پیش دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ "ایک ساعت بعد اسی جگہ، ہمیں ڈر ہے کہ لوگ ہمیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آ جائیں دوسری یہ کہ اگر نانی ایسن نے اس ملاقات کا حال سُن لیا تو ہماری شامت آ جائے گی۔"

زیادہ باتوں کا موقع نہ تھا اُسی وقت دونوں واپس آ گئے لیکن ایک گھنٹے بعد جب یہ دونوں دوبارہ وہاں پہنچے تو خان زادی وہاں موجود ملی۔

علی نواز ہٹ گیا، بابر آہستہ آہستہ چل کر خان زادی کے قریب پہنچ گیا۔ ذرا سی دیر کے لیے خان زادی کی نظریں بابر کے چہرے پر پڑیں اور جھک گئیں، بابر ایک وجیہہ نوجوان تھا اس وقت اُس کا عجب عالم ہوا ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکل سکا۔ خان زادی کا باپ بابر کا ملازم تھا خود بابر اس سے عمر میں چھوٹا تھا، بابر کی نانی ایسن کسی غیر شاہی خاندان کی لڑکی کو بابر کے لیے ناپسند کرتی تھی اور یہ کہ بابر اسے اپنے حق میں منحوس تصور کرتا تھا ان تفکرات نے خان زادی کی زبان کو تالا لگا دیا تھا، بابر نے خود ہی سلسلۂ کلام چھیڑا۔

"خان زادی! سُنا ہے تم ہم سے ملنا چاہتی تھیں؟"

خان زادی نے اچٹتی نظر سے بابر کو دیکھا اور شرما کر گردن جھکا لی۔

بابر نے کہا۔ "تم بولتیں کیوں نہیں، تم تو بہت دلیر اور باتونی دوشیزہ ہو؟ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے!"

خان زادی بدستور خاموش رہی، بابر نے عاجز آ کر کہا۔ "اگر تم اس طرح خاموش رہیں تو ہم بات کیے بغیر یہاں سے چلے جائیں گے!"

خان زادی نے اٹک اٹک کر پوچھا۔ "کیا آپ مجھے واقعی منحوس خیال کرتے ہیں؟"

بابر گھبرا کر بولا۔ "ایسی بات تو نہیں، تم سے کس نے کہہ دی یہ بات؟"

خان زادی نے کہا۔ "آپ سمرقند جا رہے ہیں؟"

"ہاں" بابر نے کہا۔

"میری دُعائیں آپ کے ساتھ ہیں!"

بابر نے دل میں کہا۔ "یہ کیا بات ہوئی۔" "اس کے علاوہ بھی تم ہم سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

کنفیوشس

اپنے شاگرد کے ساتھ کسی جگہ سے گزر رہا تھا کہ ایک عورت روتی ہوئی آئی اور کہنے لگی: "اے چین کے سب سے زیادہ عقلمند اور ہمدرد انسان! مجھے میرے دکھ کا بھی علاج بتا!"

کنفیوشس نے شاگرد سے کہا "اس عورت سے اس کا دکھ معلوم کر تاکہ اس کا کوئی مداوا بتایا جا سکے۔"

عورت سے پرسش کرنے کے بعد شاگرد نے بتایا کہ "اس عورت کے شوہر کو ایک چیتا کھا گیا ہے۔ اس سے پہلے یہی چیتا اس کے باپ اور بھائی کو بھی کھا چکا ہے۔"

کنفیوشس نے عورت سے کہا "جب تیرے خاندان کے کئی افراد چیتا ہڑپ کر چکا ہے تو تو یہ جگہ چھوڑ کیوں نہیں دیتی، کہیں اور چلی جا۔"

عورت نے جواب دیا "میں نے کئی بار سوچا کہ یہاں سے کسی دوسری آبادی میں منتقل ہو جاؤں لیکن یہ سوچ کر باز رہی کہ آج کل کے حکمراں ظالم ہیں اور ان ظالم حکمرانوں کے مقابلے میں یہ درندہ پھر بھی غنیمت ہے کیونکہ یہ تو محض زخمی یا ہلاک کر کے چلا جاتا ہے لیکن ظالم حاکم تو جسمانی اور روحانی اذیتیں پہنچا سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ اگر کسی عقلمند انسان کے سامنے یہ دونوں اذیتیں رکھی جائیں تو وہ ظالم حاکم کی جگہ درندے کا انتخاب کرے گا۔"

خان زادی کے ہونٹ تھرتھرائے "نہیں اور کچھ نہیں، میں صرف آپ کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔"

بابر علی نواز کو ساتھ لے کر واپس چلا گیا لیکن بابر خوفزدہ تھا اب وہ اس سانحے کا منتظر تھا جو خان زادی کی ملاقات اور دیدار کے بعد بابر پر نازل ہو سکتا تھا۔

*

سمرقند کی مشرقی فصیل کے سامنے بابر کی فوج خیمہ زن ہو گئی، بابر کا ہونے والا برادر نسبتی اور چچا زاد بھائی بائسنغر مقابلے کا تہیہ کر چکا تھا۔ سمرقند کے سامنے یام نامی گاؤں میں جب بابر کی فوج نے خیمے گاڑے تو وہاں ایک شہر آباد ہو گیا۔ نوجوان اور ناتجربہ کار بابر بہت پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا۔ یہ عجیب جنگ تھی اور سمرقند کا عجیب محاصرہ تھا۔ سمرقندی تاجر اپنا سامانِ تجارت لے کر بابر کے لشکر میں آتے اور دن بھر خرید و فروخت جاری رہتی لشکر کے ترخانوں اور مغلوں کا کام ہی یہ تھا کہ دشمن کے مالِ غنیمت کو لوٹتے پھریں۔ بابر نے تاجروں کو یہ ضمانت دے رکھی تھی کہ انہیں کوئی گزند نہیں پہنچایا جائے گا۔ اس لیے وہ لوگ نہایت آزادی اور بے خوفی سے اس لشکر میں آتے اور اپنی چیزیں فروخت کر کے شہر واپس چلے جاتے۔ لیکن ایک دن مغلوں اور ترخانوں کی نیت خراب ہوئی اور انہوں نے سمرقندی تاجروں کو لوٹ لیا۔ جب بابر کو پتہ چلا تو اس نے فوج میں سختی کے ساتھ یہ اعلان کرا دیا کہ لوٹ کا تمام سامان لوگوں کو واپس کر دیا جائے اور نظم و ضبط کا یہ عالم تھا کہ اعلان کے فوراً بعد لوٹنے والوں نے لوٹے ہوئے سامان کو واپس کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اگر کسی نے ٹوٹی ہوئی سوئی بھی لوٹ میں حاصل کی تھی تو اسے بھی واپس کر دیا گیا۔ بابر اس تنظیم اور تعمیل سے بے حد خوش ہوا لیکن مغلوں میں بابر کے خلاف نفرت پھیل گئی۔ انہوں نے لوٹ کا مال واپس تو کر دیا تھا لیکن دلوں میں بابر کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی۔ لشکر میں انتشار اور اختلاف کی خبریں برابر پھیلتی جا رہی تھیں، بابر بہت پریشان تھا اس نے سوچا کہ شاید یہ بھی خان زادی کے دیدار کی نحوستیں ہیں، بابر بہت خوفزدہ تھا۔

بابر نے یام سے لشکر اٹھایا اور یورت خان کے سبزہ زار سے گزرتا ہوا دریائے کوہک کے کنارے پہنچ گیا۔ دریائے کوہک ایک ٹیلے کی آڑ سے نمودار ہوتا تھا اور کوہک کے معنی ہی ٹیلے کے ہیں اس لیے اس دریا کا نام ہی کوہک پڑ گیا۔ اندر سمرقند والوں کا برا حال تھا۔ اس کا حکمراں بائسنغر بہت پریشان تھا۔ اس نے بابر کی لشکر کشی کے خطرات کو بہت دنوں پہلے ہی محسوس کر لیا تھا اور اپنی مدد کے لیے ازبکستان کے بہادر سردار شیبانی خان کو بلا لیا تھا۔ چنگیز خان کے سب سے بڑے بیٹے جوجی خان نے ایشیائے کوچک کے اوپر مشرق سے مغرب تک پامیر اور ارال کے آس پاس کے پورے علاقوں میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی جوجی خان کے بعد اس کے بہادر بیٹے باتو خان نے باپ کی جانشینی کے شاندار فرائض انجام دیے۔ پھر ایک ایسا زمانہ آیا کہ باتو خان کے ایک بیٹے، ازبک خان نے اسلام قبول کر لیا اور یہاں سے ایک چنگیزی خاندان ازبک خان کی نسبت سے ازبک کہلانے لگا اور یہ لوگ جس علاقے میں آباد تھے اسے ازبکستان کہا جانے لگا۔ پھر ماوراء النہر کے شہر سبز کے امیر تیمور نے چنگیز خانی اقتدار کو پارہ پارہ کر دیا اور یہ لوگ بھی شکست اور زوال کی گہرائیوں میں کہیں گم ہو گئے لیکن ایک

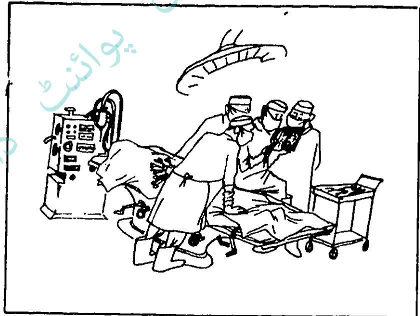
عرصے بعد ازبکوں میں شیبانی خان نامی جیالا پیدا ہوا اور اس نے ازبکستان کی حدود سے گزر کر تاشقند اور اس کے آس پاس کے جملہ قلعوں کو بزورِ قوت فتح کر لیا وہ تیموریوں کو غاصب سمجھتا تھا جنہوں نے چنگیز اور ازبک خان کی اولادوں سے ان کی حکومتیں چھین لی تھیں اور اب وہ تاریخ کے اس حساب کتاب کو چکانا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب سمرقند کے بائسنغر نے بابر کے مقابلے میں شیبانی خان سے مدد چاہی تو وہ گرگ جہاں دیدہ کی طرح حالات اور وقت سے فائدہ اٹھانے کے لیے شب و روز کی پروا کیے بغیر، حیرت انگیز طور پر سمرقند کی طرف بڑھا۔

بابر بہت خوش تھا کہ سمرقند عنقریب فتح ہو جانے والا تھا کہ ایک دن اس کے آدمیوں نے مشرق سے اٹھتے ہوئے خوفناک گرد و غبار کو دیکھا۔ بابر کا خیال تھا کہ شاید یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے غدار وزیر حسن یعقوب کی سرکردگی میں بابر سے علیحدگی اختیار کر لی تھی بابر نے سوچا اگر یہ خیال سچ نکلا تو پھر خان زادی کو خوش بخت اور سعد ماننا پڑے گا لیکن اسی دوران چند سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے بابر کے لشکر میں داخل ہو گئے، یہ بابری فوج کے جاسوس اور جانوروں کے لیے چارہ فراہم کرنے والے لوگ تھے۔ انہوں نے بابر کو ایک تشویشناک خبر سنائی۔

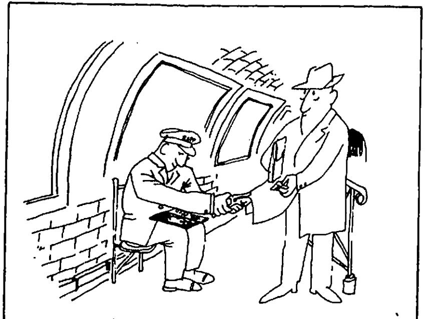
انہوں نے کہا: "جنابِ والا! یہ آنے والے ازبک ہیں جو اپنے مشہور سردار شیبانی خان کی سرکردگی میں بائسنغر کی مدد کو حاضر ہوئے ہیں۔"

بابر گھبرا گیا کیونکہ شیبانی خان اور بائسنغر، دو دشمنوں کا مقابلہ بڑا خطرناک کام تھا۔ بابر اپنے امرا کے ساتھ مشرق میں نظریں جمائے آنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ یکایک گرد و غبار کے درمیان سے گھڑسواروں کی ایک بڑی تعداد غولِ بیابانی کی طرح نمودار ہوئی۔ یہ لوگ بالوں کی ٹوپی اور دہقانی لباس میں ملبوس اپنے گھوڑوں پر تنے ہوئے بیٹھے تھے۔ چوڑے چہروں پر ابھری ہوئی جبڑوں کی ہڈیاں اور بھنچی ہوئی بھنوؤں کے نیچے منگولوں جیسی آنکھیں بڑی خوفناک

شوق









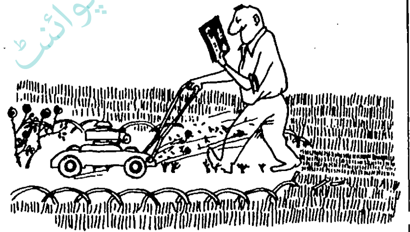
لگ رہی تھیں، بابر نے اپنے غیر حاضر امرا کو آوازیں دیں اور پھر یہ سب ازبکوں کے سامنے کے ٹیلے پر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ بار بار زمین پر پیر ٹپکنے اور اپنی دُموں کو ہلا ہلا کر مکھیاں اُڑانے والے گھوڑے خطرے کا احساس کر کے جب ایک ساتھ ہنہناتے تو ماحول بڑا دہشت ناک ہو جاتا۔ بابر نے اپنی فوج کے ذریعے ازبکوں کا راستہ روک لیا تھا۔ دونوں فوجیں آمنے سامنے پہنچ کر کھڑی ہو گئیں، بابر کا اڑتالیس سالہ ازبک حریف جذبات سے عاری نظروں سے والئ فرغانہ اور اس کی سپاہ کو دیکھ رہا تھا۔ بابر کو اس بات پر حیرت تھی کہ ازبکی سپاہ کے پیچھے خیمہ و خرگاہ کا کہیں پتہ تک نہ تھا اس نے سوچا کہ یہ لٹیرے غالباً اپنے گھوڑوں کی پشت ہی پر آرام کرتے ہیں، اسے شیبانی خان سے خوف سا محسوس ہوا لیکن اس نے اپنے چہرے بشرے یا حرکات و سکنات سے خوف کا اظہار نہ ہونے دیا۔

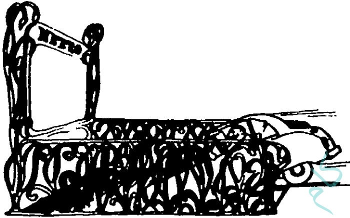
علی نواز اپنے گھوڑے کو اُچکاتا ہوا بابر کے قریب پہنچا اور اس سے اجازت طلب کی "اگر جناب اجازت دیں تو یہ ناچیز اسی وقت گھوڑا بڑھا کر شیبانی خان پر ٹوٹ پڑے اور اسے سمرقند آنے کی جسارت کا مزہ چکھا دے"

بابر نے اسے روکا "یہ ازبک سردار اتنا موم کا بھی نہیں ہے جسے تم نہایت آسانی سے ہلاک کر دو، وقت کا انتظار کرو۔"

شیبانی خان دیر تک بابر کو دیکھتا رہا ازبکی تیر فرغانہ کے شیر کو دیکھ رہا تھا، تمام قریب تھی، شیبانی خان یکایک گھوڑے کا رُخ موڑ کر اسے دوڑاتا ہوا اپنے سپاہیوں میں روپوش ہو گیا۔ ازبک سردار بائسنفر کی پیشوائی کا منتظر تھا، اس کا خیال تھا کہ مدد کا طالب بائسنفر اس کی آمد کی خبر پاتے ہی اپنی افواج کے ساتھ سمرقند سے باہر آ جائے گا اور شیبانی خان کا شاندار استقبال کر کے بابر کے خلاف متحدہ کارروائی کرے گا لیکن بائسنفر سمرقند میں

مُطالعہ









حضرت

ابو حنیفہ ؒ کے لیے حضرت امام مالکؒ نے ایک بار یہ فرمایا تھا کہ جب عقل تقسیم ہو رہی تھی تو کُل کی نصف ابُو حنیفہ کو دے دی گئی تھی اور بقیہ نصف پوری دُنیا میں تقسیم ہوئی تھی۔ حضرت ابو حنیفہ کا فقہی امور اور قانونی معاملات میں عقل کا صحیح اور برمحل استعمال مشہور ہے۔ کسی شخص نے اُن کی ذہانت کا امتحان لینے کے لیے اُن کے سامنے ایک پیچیدہ مقدمہ پیش کیا۔ اُس نے کہا "جناب والا! چار دوست کہیں موجود گفتگو میں مصرُوف تھے۔ اچانک کسی طرف سے سانپ نمودار ہُوا اور کسی ایک پر چڑھ گیا۔ اس نے پھرتی سے جھٹکا دیا، سانپ دُوسرے پر جا گرا۔ دُوسرے نے بھی چستی کا مظاہرہ کیا اور سانپ تیسرے شخص کو منتقل ہو گیا۔ تیسرے شخص نے بھی جھٹکا دے کر نجات حاصل کر لی لیکن چوتھا شخص ابھی جھٹکا نہ دے سکا تھا کہ سانپ نے اُسے ڈس لیا اور وہ مر گیا۔ اب آپ یہ فیصلہ فرمائیں کہ تینوں زندہ دوستوں پر اگر مقدمہ چلایا جائے تو چوتھے دوست کی موت کا سبب کون قرار پاتے گا؟"

حضرت ابُو حنیفہؒ نے جواب دیا "کوئی بھی نہیں، چوتھے نے اپنی سُستی کی سزا بھگتی۔ کیونکہ مقدمے کی رُوداد سے ہمیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ سانپ ایک آفتِ ناگہانی تھا اور اس آفت سے چُستی اور مستعد دوستوں نے تو نجات حاصل کر لی لیکن چوتھا جو سُست تھا اس آفت کا شکار ہو گیا۔"

محصوُر بابر سے خوفزدہ شیبانی کے استقبال یا ملاقات کی ہمت تک نہ کر سکا۔ شیبانی خان کو شبہ گزرا کہ کہیں یہ اُس کے خلاف بابر اور بائسنغر کی کوئی چال نہ ہو ازبکوں نے اپنے گھوڑے کی دُموں کے پرچموں کو ہوا میں لہرایا اور بابر کے مقابلے سے پیچھے ہٹنے لگے۔

رات کی تاریکی میں دونوں ہی حریف ایک دُوسرے کی نظروں سے محفوظ ہو گئے۔ شب بیداری میں مصروف ہو گئے۔ بابر شیبانی خان کے مقابلے سے گھبراتا بھی تھا۔

جب صبح بابر نے ازبک لشکر پر نظریں ڈالیں تو وہاں میدان صاف تھا اور ایک ازبک بھی وہاں موجود نہ تھا۔ شیبانی خان کے جاتے ہی بائسنغر اپنے مستقبل سے مایوس ہو گیا۔ اس نے چپ چاپ سمرقند چھوڑ کر جنوب کی راہ لی۔ اس کے چلے جانے کے بعد شہر والوں نے بابر سے کچھ وعدے لیے۔ ان میں ایک وعدہ یہ بھی تھا کہ بابری سپاہ سمرقند میں لوٹ مار نہیں کرے گی۔ بابر نے اس کا وعدہ کر لیا۔

سمرقند کے دروازے کھُل گئے اور بابر اپنی سپاہ سمیت اپنے جدّ اعلیٰ تیمور کے شہر میں داخل ہو گیا۔ بابر نے اپنے لشکر میں یہ اعلان کرا دیا کہ سمرقند میں لوٹ مار حرام ہے۔ مغل اور ترخان اب تک اس توقع میں بابر کا ساتھ دے رہے تھے کہ جب سمرقند فتح ہو گا تو انہیں شہر کو لوٹنے کی عام اجازت ہو گی اور وہ جی بھر کے لوٹ مار کریں گے لیکن بابر امیر تیمور کے اس قیمتی شہر کو لوٹ مار کی تباہی سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ مغلوں اور ترخانوں نے بابر کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی لیکن ان میں بددلی بھی پیدا ہو گئی۔ علی نواز بابر کے پاس پہنچا اور اسے خبردار کیا "جناب والا! مغل اور ترخان بہت دل برداشتہ ہیں۔ انہیں مالِ غنیمت کی ہوس ہے۔ ناچیز کی رائے ہے انہیں لوٹ مار کرنے کی اجازت دے دینی چاہیئے!"

بابر نے اپنے فولادی عزم کا اظہار کیا "ایسا نہیں ہو سکتا ہم اپنے دادا امیر تیمور کے اس قیمتی شہر کو اپنے حکم سے تباہ نہیں ہونے دیں گے!"

علی نواز نے افسوس سے کہا "اگر انہیں لوٹ مار کا حکم نہ ملا تو وہ اس لشکر سے علیحدگی اختیار کر لیں گے اور اس نازک موقع پر فوج کے بڑے حصے کا باغی ہو کر علیحدہ ہو جانا نہایت تشویش ناک بات ہے۔"

لیکن بابر اپنا فیصلہ بدلنے پر آمادہ نہ تھا۔

وہ سمرقند کی تسخیر پر بہت خوش تھا۔ وہ بے چینی سے امیر تیمور کے چومنزلہ محل کو ک سرائے (نیلا محل) میں داخل ہو گیا۔ اس نے عظیم تختِ شاہی کا معائنہ کیا جسے ایک بڑی پتھر کی چٹان کو تراش خراش کر بنایا گیا تھا۔ اس تخت کی لمبائی چودہ گز اور چوڑائی سات گز تھی اُس پر طرح طرح کے اُبھرواں نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ اچانک اس کی نظریں تخت کے اس حصے پر پڑ گئیں جس میں دراڑ پڑ چکی تھی۔ بابر کا دل لرز گیا۔ اسے خدشہ محسوس ہوا کہ یہ دراڑ کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔ یہ تیموریوں کے زوال کی علامت تو نہیں ہے۔ یہاں سے ہٹ کر وہ چہل ستون میں داخل ہو گیا۔ یہ دو منزلہ عمارت کوہک کے دامن میں ایک میدانی باغ کے اندر واقع ہے۔ ان محلات اور آثارِ تیموریہ میں گھومتے ہوئے بابر خود کو تیمور کا سچا اور اولوالعزم جانشین تصور کر رہا تھا۔

رات کے سناٹے میں جب حالات کا جائزہ لینے بیٹھا تو اسے معلوم ہوا کہ مغلوں اور ترخانوں کی بڑی تعداد اس کا ساتھ چھوڑ کر سمرقند سے رخصت ہو چکی ہے۔ ان جانے والوں میں مشہور مغل جرنیل سلطان احمد تنبل بھی شامل تھا۔ اس خبر سے بابر پریشان ہو گیا۔ اس نے علی نواز کو حکم دیا کہ وہ سمرقند میں موجود بابری سپاہ کی گنتی کرے اور یہ بتائے کہ اب کتنی فوج باقی رہ گئی ہے۔

فوجی اعداد و شمار کی صحیح ترین تعداد جب معلوم کی گئی تو پتہ چلا کہ اب کُل ایک ہزار سپاہی باقی رہ گئے ہیں اس نے فوراً اندیجان ہرکارے روانہ کر دیئے اور وہاں سے فوجی امداد طلب کی۔

بابر بڑی دیر تک ٹہلتا رہا اور کسی مسئلے پر غور کرتا رہا۔ پھر اس نے علی نواز کو طلب کیا۔

اس نے علی نواز سے کہا "علی نواز! تم دیکھ رہے ہو کہ ہم کتنی مشکلات میں گھر گئے ہیں سارے مغل اور ترخان امرا اور فوجی ہمیں چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے!"

علی نواز نے جواب دیا "اس ناچیز نے تو پہلے ہی جناب والا کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا تھا اگر سمرقند کی لوٹ مار کی بابت حضور والا جذباتی روش نہ اختیار کرتے تو شاید آج ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا"

"خیر چھوڑو ان باتوں کو" بابر نے بے نیازی سے کہا "ہم نے مغل سردار کے لیے ایک نیا فیصلہ کیا ہے ایک تکلیف دہ وہی اور دردناک فیصلہ!"

علی نواز بابر کی صورت دیکھنے لگا۔

بابر نے کہا "ہم مغل سردار کو اندیجان سے ہٹا کر خجند کا قلعہ اس کی تحویل میں دینا چاہتے ہیں اس سے ہمیں دو فائدے حاصل ہوں گے" پھر کچھ رک کر بولا "پہلا فائدہ تو یہ کہ مغل سردار نیا نیا ہمارے دربار سے وابستہ ہوا ہے اندیجان میں ایک سے ایک سازشی پڑا ہے ان کی صحبت میں رہ کر کبھی بھی خراب ہو سکتا ہے"

علی نواز کے یہ دل کی بات تھی" بابر کہتا رہا "پھر ہم خان زادی سے پیچھا بھی چھڑانا چاہتے ہیں اس کی نحوستیں ناقابل تردید حقیقت ہیں"

جواب میں علی نواز کیا کہہ سکتا تھا خاموش رہا۔

کئی دن بعد اندیجان سے کئی آدمی آئے اور انہوں نے بابر کو بڑی تشویش ناک خبریں سنائیں کہ روٹھ کر جانے والے امرا اور فوجی اندیجان پہنچ چکے ہیں اور وہاں بابر کے بھائی جہانگیر مرزا کو تخت نشین کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

انہی میں مغل سردار بھی شامل تھا وہ اپنے خاندان کو لے کر سمرقند میں بابر کے پاس چلا آیا تھا۔ اس نے اپنے آنے کی یہ وجہ بیان کی کہ اب اندیجان پر عملاً بابر کی حکومت نہیں رہی سلطان احمد تنبل کی قیادت میں اندیجان پر باغیوں کا قبضہ ہو چکا ہے اور انہوں نے اقتدار حاصل کرتے ہی مغل سردار کو معزول کر دیا۔ بابر ڈرا کہ اس پریشان حالی میں کہیں خان زادی سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ بالآخر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا جب بابر نے مغل سردار کو خجند کی قلعے داری کے کاغذات دیئے تو اس نے بابر کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

چہل ستون کے وسیع باغ میں ٹہلتے ہوئے بابر اندیجان کی تشویش ناک خبروں کا تجزیہ کر رہا تھا اسی دوران ایک درخت کی آڑ سے نکل کر خان زادی اس کے سامنے آ گئی۔ لمبی لمبی سیاہ زلفیں دو حصوں میں تقسیم ہو کر شانوں سے گزر کر سینے پر آ گئی تھیں پورا جسم سیاہ لباس میں ڈھکا ہوا تھا۔ سیاہ بالوں اور سیاہ لباس میں سے سرخ تمتمایا ہوا چہرے کا رنگ ایسا لگتا تھا جیسے مخملیں آگ کا ٹکڑا۔ بابر اسے دیکھتے ہی پریشان ہو گیا وہ جس اخلاق اور ضابطے کا آدمی تھا اس میں تُند خوئی یا بداخلاقی تھی ہی نہیں وہ پتھر کے ایک چبوترے کی طرف بڑھتا ہوا بولا "آؤ خان زادی! کہو کیسے آنا ہوا؟"

خان زادی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی بابر کے ساتھ ہو گئی۔ دونوں پتھر پر درمیان میں ذرا فاصلہ دے کر بیٹھ گئے۔ خان زادی نے کہا "خان زادی سلطان کی مہربانی کا شکریہ ادا کرنے آئی ہے!"

"کیسا شکریہ؟ کیسی مہربانی؟" بابر نے حیرت سے پوچھا۔

خان زادی نے جواب دیا "بابا جان اندیجان سے نکل کر پریشان ہو رہے تھے لیکن سلطان نے خجند کی قلعے داری بخش کر ہم سب کے لیے تشکر بے پایاں کی راہ کھول دی"

بابر نے بے نیازی سے کہا "یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کا تم لوگ یوں شکریہ ادا کرو"

اسی لمحے بابر کو پے در پے کئی چھینکیں آئیں اور اس کا جسم کپکپانے لگا بابر کو ایسا لگا جیسے اس کے جسم میں آگ سی لگ گئی ہے وہ ہمت کر کے کھڑا ہو گیا بولا "اچھا خان زادی! شکریہ ہمیں اجازت دو ہماری طبیعت خراب ہو رہی ہے!"

خان زادی بابر کے قریب پہنچ گئی اور ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ بابر کے بائیں ہاتھ پر رکھ دیا وہ واقعی جل رہا تھا۔ وہ بدقت تمام بابر کا ہاتھ پکڑ کر چہل ستون میں لے گئی۔

بابر کی علالت کی خبر چاروں طرف آگ کی طرح پھیل گئی مغل سردار اپنی بیوی اور خان زادی کے ذریعے شریف الطبع اور نیک دل نوجوان بابر کی تیمار داری میں لگا ہوا تھا۔ علی نواز الگ پریشان تھا وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ خان زادی بابر کی جان ہی نہ لے لے یہ جب بھی بابر سے ملتی ہے وہ کسی نہ کسی مصیبت کا شکار ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اب وہ اندیجان سے بھی ہاتھ دھو چکا تھا۔

اس نے خان زادی سے کہا۔ "خان زادی! تم بُرا نہ ماننا، میں تم سے کچھ ناخوشگوار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

خان زادی نیم جان اور تقریباً مدہوش بابر کے حلق میں روئی کے پھائے سے پانی ٹپکاتی ہوئی بولی۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم اس وقت کون سی بات کرنا چاہتے ہو، کچھ بھی ہو میں نزع کے عالم میں گرفتار اس شخص کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی!"

علی نواز نے کہا۔ "جب بابر کو ہوش آئے گا تو شاید یہ بھی تمہیں اپنے اس پاس دیکھ کر پریشان ہو جائے گا۔ اس لیے ان حالات میں تمہارا یہاں سے چلا جانا ہی غنیمت ہے۔"

خان زادی نے ترشی سے کہا۔ "اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تم مجھے بابر کے پاس سے ہٹا دو تو سن لو کہ تم اپنے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو گے!"

اسی وقت چند امرا کے ساتھ ایک شخص اندر داخل ہوا اور بابر کے قریب کھڑے ہو کر اس کی نازک حالت پر غور کرنے لگا۔ قاسم بیگ ساتھ تھا۔ اس نے کہا۔ "اب تم خود بھی یہ اندازہ لگا سکتے ہو کہ بادشاہ اس لائق ہرگز نہیں ہے کہ اندیجان میں اپنی نانی اور ماں کی مدد کو پہنچ سکے۔"

وہ شخص دھیرے دھیرے اثبات میں گردن ہلانے لگا۔ جب وہ باہر چلا گیا تو علی نواز نے قاسم بیگ سے پوچھا۔ "یہ کون تھا؟"

قاسم بیگ نے جواب دیا۔ "یہ بادشاہ کی نانی اور ماں کا ایلچی تھا۔ اندیجان میں جہانگیر مرزا کو برسرِ اقتدار لا کر سلطان احمد تنبل حکومت کرنا چاہتا ہے لیکن بادشاہ کی عقلمند نانی دشمنوں کے اس منصوبے کو ناکام بنا دینا چاہتی ہے اور چاہتی ہے کہ بادشاہ فوج لے کر جلد از جلد اندیجان پہنچ کر باغیوں کو ٹھکانے لگا دے۔"

علی نواز نے افسوس سے کہا۔ "اگر یہ بات تھی تو تم نے اس ایلچی کو نیم جاں بادشاہ کے روبرو لا کر بڑی سنگین غلطی کی ہے۔ جب دم توڑتے ہوئے بابر کو اس نے دیکھا ہو گا تو وہ یقیناً بادشاہ کی زندگی سے مایوس ہو گیا ہو گا اور ان موقعوں پر بڑے بڑوں کی وفاداریاں ڈگمگا جاتی ہیں اور آدمی باآسانی غداری پر مائل ہو جاتا ہے۔"

قاسم بیگ اپنی غلطی پر نادم ہو کر واپس چلا گیا۔



بابر کی خطرناک علالت نے اسے کچھ اور دوستوں سے بھی محروم کر دیا۔ انہوں نے بابر کی موت کو یقینی سمجھ کر دوسرے درباروں کا رخ کیا لیکن وہ حیرت انگیز طور پر صحت یاب ہونے لگا۔ مغل سردار ابھی تک سمرقند میں ٹھہرا ہوا تھا وہ اگر چاہتا تو خجند پہنچ کر قلعے داری کا منصب سنبھال لیتا لیکن اس کے خیال میں قریب المرگ بابر سے زیادہ خجند کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔

جب بابر کچھ چلنے پھرنے کے لائق ہو گیا تو اسے اندیجان کی فکر نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ اس نے اپنے بچے کھچے ساتھیوں کو یکجا ہونے کا حکم دیا۔ اس موقع پر مغل سردار نے پیش کش کی کہ وہ خجند کی قلعے داری کے بجائے اس کے ساتھ اندیجان کو بچانے کی جدوجہد میں حصہ لے گا۔

اُداس اُداس اور ہر وقت فکر مند رہنے والا بابر، چہل ستون کے دروازے کے سنگی تختِ تیموری پر بیٹھ کر مشتبہ مستقبل کی بابت سوچ رہا تھا کہ یکایک اسے اپنے پیچھے کسی کی آہٹ محسوس ہوئی۔ بابر نے گھوم کر دیکھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس خان زادی آہستہ آہستہ اس کی طرف آ رہی تھی۔ بابر کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور بھنویں کراہت سے سکڑ گئیں۔

خان زادی کسی ادب و احترام کا اظہار کیے بغیر بابر کے سامنے تخت کے درز پر بیٹھ گئی۔ بابر کو افسوس ہوا کہ اس کی بدنصیبی یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ لوگوں کے دل سے احترامِ شاہی تک دور ہو چکا ہے۔

خان زادی ٹکٹکی لگائے کچھ دیر تک بابر کو دیکھتی رہی۔ بابر نے محسوس کیا خان زادی کی ویران آنکھوں میں خشک ہو جانے والے آنسوؤں کی ہلکی سی تہہ موجود ہے۔

خان زادی نے پوچھا۔ "اب طبیعت کا کیا حال ہے؟"

بابر کے شاہانہ مزاج کو یہ بے تکلفی پسند نہ آئی۔ بڑی بے رُخی سے بولا۔ "غنیمت ہے۔"

خان زادی نے کچھ سکوت اختیار کیا۔ گویا وہ کوئی خاص بات کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے لیے کسی مناسب لب و لہجے اور الفاظ کے انتخاب میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ بابر کی نگاہیں بھی کسی سحر زدہ کی طرح خان زادی کے چہرے پر ٹک کر رہ گئیں۔

خان زادی نے آہستہ سے کہا۔ "باوا جان آپ کی ملازمت ترک کرنا چاہتے ہیں؟"

بابر کو جیسے کسی زہریلے کیڑے نے ڈنک مار دیا۔ اسے شبہ گزرا کہ غالباً مغل سردار بھی بے وفائی کرنے والے امرا میں شامل ہونے جا رہا ہے۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں؟ انہیں تو ہم نے خجند کی قلعے داری کا منصب عطا کیا ہے۔"

خان زادی نے جواب دیا۔ "ہاں وہ آپ کی عنایات اور ذرہ نوازی کے بہت شکر گزار ہیں لیکن آپ کے مفادات اور خوش بختی کی خاطر اب وہ مزید وابستگی پسند نہیں کرتے۔"

بابر نے غور سے خان زادی کے سفید لباس کو دیکھا اُسے تعجب ہوا کہ اپنے پسندیدہ سُرخ لباس میں نظر آنے والی لڑکی آج سفید لباس میں کتنی مغموم اور اُداس نظر آ رہی تھی، اس نے کہا "مغل سردار کو کیا معلوم کہ میری خوش بختی اور بدبختی کا تعلق کن چیزوں سے ہے!"

"ہاں پہلے انہیں یہ بات نہیں معلوم تھی" خان زادی نے جواب دیا۔ "لیکن سمرقند کے دورانِ قیام انہیں آپ سے متعلق ایک ایسی شے کا ضرور علم ہو گیا ہے جو آپ کی پریشانیوں اور مصیبتوں کا سبب بن گئی ہے!"

"یعنی؟" بابر نے خان زادی کے دل میں تیر جانے والی نظروں سے اسے دیکھا "خان زادی! تمہارا یہ اشارہ کس کی طرف ہے!"

خان زادی نے جواب دیا "خود اپنی طرف۔ باواجان کو یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ جب بھی آپ مجھے دیکھتے ہیں، کسی نہ کسی پریشانی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اب اس کا علاج انہوں نے یہ تجویز کیا ہے کہ وہ آپ سے علیحدگی اختیار کر کے کاشغر کے اُس پار چین چلے جائیں اور وہاں قسمت آزمائی کریں۔"

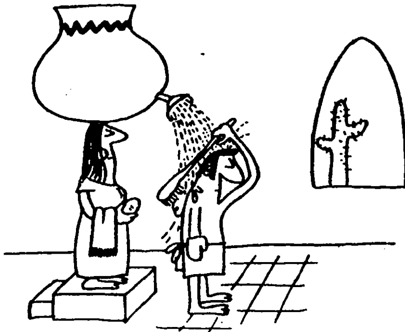
نیک دل بابر تڑپ اُٹھا۔ کہنے لگا "نہیں، ہم تمہارے باواجان کو کہیں بھی نہیں جانے دیں گے، ہم تمہیں ایسا ہرگز نہیں سمجھتے، تم لوگ ان وسوسوں کو اپنے دلوں سے نکال دو۔"

خان زادی تخت کے درز سے ہٹ کر بیٹھ گئی، اس نے درز کی ٹیڑھی میڑھی لکیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں مشیّتِ ایزدی کی قائل ہوں، خُدا جو چاہتا ہے کرتا ہے، اُس نے جس دن اِس پتھر میں یہ درز پیدا کی تھی شاید اسی دن سے تیموریوں پر زوال کا آغاز ہوا، میں تو باواجان کے ساتھ بہت بعد میں آئی ہوں۔"

بابر بھی خُدا کی مرضی اور تقدیرِ الٰہی کا بڑا قائل تھا، خان زادی کی باتوں نے اسے اور زیادہ قائل کر دیا۔ "اچھا!" بابر کہنے لگا، "تم اپنے باواجان سے کہو کہ اپنے اس فیصلے کو اُس وقت تک کے لیے ملتوی کر دیں، جب تک اندیجان کا کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ اگر ہم اندیجان کو باغیوں سے بچا لیتے ہیں تو تمہارے باواجان کو کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں رہے گی اور بصورتِ دیگر وہ اپنی مرضی اور ارادوں کے مالک ہوں گے۔"

شاید اس دن پہلی بار بابر نے علی نواز سے خان زادی کا ذکر خود سے کیا۔ بولا "علی نواز! کیا تم بھی یہی سمجھتے ہو کہ خان زادی ہمارے حق میں سعد اثرات نہیں رکھتی؟"

علی نواز کی تو اس سوال کے جواب میں اغراض پوشیدہ تھیں، کہنے



لگا "ہاں کچھ لوگ کچھ لوگوں کو راس نہیں آتے اسی طرح خان زادی بھی جناب کو راس نہیں آ رہی ہے!"

بابر نے ترشی سے جواب دیا "لیکن ہم خود ایسا نہیں سمجھتے۔ تقدیر کیا ہے، امرِ ربّی ہے، امرِ ربّی میں یہ فانی لوگ کس طرح اثر انداز ہو سکتے ہیں۔"

علی نواز سہم گیا اسے شبہ گزرا کہ شاید بابر خان زادی سے شدید محبّت کرنے لگا ہے، ورنہ چند دنوں پہلے تک اسی وسوسے کا خود اس نے بھی اظہار کیا تھا۔

بابر اپنی مختصر جمعیت لے کر سمرقند سے نکلا اور کچھ دور بڑی شاہراہ پر مشرق کی طرف گھوڑا دوڑاتا رہا، پھر یہ شاہراہ شمال کو گھوم گئی، چند فرسخ کے بعد یہ عظیم شاہراہ دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی تھی، اُس کا ایک حصّہ بالکل شمال میں تاشقند کی طرف چلا گیا تھا۔ دوسرا مشرق کو چلا گیا تھا، جو خجند کے اندر سے ہوتا ہوا براہِ اخشی اندیجان کو جاتا تھا۔ بابر اپنی جمعیت کے ساتھ مشرق کو مڑ گیا اور تیز دوڑتے ہوئے گھوڑے لمحہ بہ لمحہ خجند کی طرف بڑھے، اس جمعیت میں شاہی کر و فر کا شائبہ تک نہ پایا جاتا تھا، چنانچہ راہ میں ملنے والے تجارتی قافلوں اور بستیوں نے انہیں اس سے زیادہ اہمیت نہیں دی جو ایک دربار سے دوسرے دربار کا رُخ کرنے والی قسمت آزما جمعیتوں کو دی جاتی تھی۔

جب یہ تھکی ہاری جمعیت خجند کے قلعے میں داخل ہوئی تو وہاں اندیجان کے مفرور بد اندیش پہلے ہی جمع ہو چکے تھے، انہوں نے دل شکستہ بابر کو یہ خبر سنائی کہ سلطان احمد تنبل باغی جمعیت کے ساتھ اندیجان میں داخل ہو چکا ہے، اب وہاں کچھ بھی نہیں رہا۔ اس کی دوسری ماں کے بیٹے جہانگیر مرزا کو اس کی جگہ حکمراں بنا دیا گیا ہے اور بابر کے ایک ایک طرفدار کو نہایت

سفاکی سے قتل کر دیا گیا یہاں تک کہ اس کے پیر مولانا قاضی کو بھی قلعے کی دیوار کے نیچے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔" بابر سو دیا آہستہ سے کہنے لگا۔ "بلاشبہ مولانا قاضی پیرِ کامل تھے، ہمیں یقین ہے کہ جن لوگوں نے انہیں پھانسی دی ہے، جلد ہی بے نام و نشان ہو جائیں گے!"

اس نے سوچا کہ جس اندیجان کے لیے اس نے سمرقند کو چھوڑا تھا وہ مل نہ سکا اور ہاتھ سے سمرقند بھی گیا۔ ذرا سی دیر کے لیے خان زادی کا خیال ذہن میں آیا۔ اس نے سوچا کہ کیا اس مشیتِ الٰہی میں خان زادی کا کوئی دخل ہو سکتا ہے؟" لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ایک سچے مسلمان کی طرح خان زادی کو بے قصور اور امرِ ربی کو تقدیرِ مبرم تسلیم کر لیا۔

شام ہونے کو تھی مغل سردار نے اپنے مختصر سامان کو کتنی خچروں پر لادا اور بیوی اور خان زادی کو گھوڑوں پر سوار کر کے بابر کو الوداع کہنے چلا گیا۔

بابر قلعے کے باہر آ گیا اس نے پا بہ رکاب قافلے کو دیکھ کر پریشانی سے پوچھا "کہاں؟"

مغل سردار نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "مجھے خان زادی سے معلوم ہوا تھا کہ ہم بیٹھے پا گیا ہے کہ جب تک اندیجان کا کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا ہمیں آپ کے ساتھ ہی رہنا چاہیے اور اگر بدقسمتی سے اندیجان کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو پھر ہمیں یہ اختیار حاصل ہو گا کہ آپ سے جدا ہو جائیں۔"

بابر نے بدقت تمام کہا "مغل سردار! جو کچھ ہوا مشیتِ ایزدی کے مطابق ہوا۔ میں نہیں چاہتا خان زادی کو خطاکار ٹھہرا کر بلاوجہ بارگاہِ خداوندی میں شرمسار یا گناہگار نہیں ہونا چاہتا۔ تم لوگ ہمارے ساتھ چلو اور کوششوں میں ہمارا ساتھ دو، ہو سکتا ہے قسمت پھر جائے اور اقبال مندی واپس آ جائے۔"

خان زادی کی سوگوار آواز سنائی دی، وہ مغل سردار سے کہہ رہی تھی "بابا جان! جلدی کیجیے رات ہو رہی ہے ہمیں جلد از جلد کسی سرائے تک پہنچنا ہے۔"

علی نواز بھی آ گیا اور یہاں کا یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا۔

بابر نے مغل سردار سے کہا "شام قریب ہے اب اس وقت کہاں جاؤ گے تم لوگ؟"

مغل سردار نے کہا "جب جانا ہی ہے تو اس میں صبح شام کی کیا فکر ہمیں جلد از جلد کسی سرائے تک پہنچنا ہے۔"

خان زادی مغل سردار کو دیکھنے کے بہانے بابر کو حسرت و یاس سے دیکھ رہی تھی۔

مغل سردار ذرا آگے بڑھا اور بابر کو سینے سے لگا لیا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس کے بعد اس نے علی نواز کو بھی سینے سے لگا لیا اور علیحدگی کے بعد مغل سردار نے معنی خیز نظروں سے علی نواز کو دیکھا اور کہنے لگا "اگر تم چاہو تو ساتھ چل سکتے ہو!"

خان زادی نے باپ کے یہ الفاظ سن لیے چیخ کر بولی "بابا جان جلدی کیجیے ہم بدنصیب فرغانہ کے کسی شخص کو بھی اپنے ساتھ نہ لے جائیں گے" پہلے تو شاید علی نواز مغل سردار کی پیش کش کی تائید میں اس کے ساتھ ہو بھی لیتا لیکن خان زادی کی باتوں نے اس کی خاندانی غیرت کو بیدار کر دیا۔ اس نے بابر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مغل سردار! میں اس مصیبت کے وقت اپنے دوست، آقا اور بادشاہ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔"

"اچھا دوستو! خدا حافظ" کہتا ہوا مغل سردار اُچک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ یہ قافلہ شمال کی طرف روانہ ہو گیا۔ بابر اور علی نواز وہیں کھڑے انہیں جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ خان زادی نے اپنا گھوڑا مغل سردار سے ذرا آگے رکھا تھا جس سے اسے یہ فائدہ ضرور حاصل تھا کہ جب مغل سردار گھوم کر بابر اور علی نواز کو دیکھتا تو وہ خود بھی نہایت محتاط انداز میں گھوم کر بابر کی ایک جھلک دیکھ لیتی۔

تھوڑی دیر بعد تاریکی زیادہ گہری ہو گئی اور دونوں کو اپنے سے فاصلے پر نظر آنے والے افراد سیاہ دھبوں کی شکل میں دکھائی دیتے رہے پھر یہ قافلہ آہستہ آہستہ ایک ٹیلے پر چڑھتا نظر آیا اور کچھ ہی دیر بعد ٹیلے کے دوسری طرف نشیب میں اُتر کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کچھ نظر نہ آنے کے باوجود دونوں نے ذرا دیر تک ٹیلے پر نظریں جمائے رکھیں اور پھر جیسے خواب سے چونک کر بوجھل قدموں سے خجند کے قلعے میں داخل ہو گئے۔ دونوں ہی اشکبار تھے، بابر نے حلق میں اٹکتی ہوئی آواز میں جیسے اپنے آپ سے کہا "کچھ بھی نہیں رہا، نہ اندیجان، نہ سمرقند نہ خان زادی۔"

کات تو خاتون میں

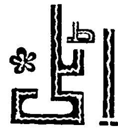
کمالُ الدّین

ڈی کیمران سے ہم نے گزشتہ شماروں میں
چند خوبصورت منتخب داستانیں
شائع کی تھیں۔ اُن میں سے ایک کہانی
"وفا" آپ کو یاد ہوگی۔ "وفا" میں ایک حسین خاتون کے
بے پناہ ایثار و قربانی کے واقعے کو مُصنّف
نے بڑے تاثّر سے قلمبند کیا تھا۔ وہی مُصنّف اب
تصویر کا دُوسرا رُخ
پیش کرتا ہے، اُسے بھی ملاحظہ فرمائیے:



شرابی کی بیوی

پہلی داستان



کے کسی شہر میں توفانو نامی ایک شخص رہا کرتا تھا۔ اُس کی نوجوان بیوی جینیا اپنے بے مثال حُسن وجمال کے باعث دُور دُور تک مشہور تھی۔ حُسن وجمال کی اس شہرت نے شوہر کو اُس کی طرف سے بدگمان کر دیا تھا اور وہ جینیا کی وفاداری پر شک کرنے لگا تھا۔ بیوی کو اپنے شوہر کی شکی طبیعت پر بڑا غصہ تھا۔ اُس نے کئی بار توفانو سے یہ معلوم کرنا چاہا کہ آخر اُس کے شک کی بنیاد کیا ہے لیکن شوہر کبھی اس سوال کا کوئی واضح اور معقول جواب نہ دے پاتا اور وقتی طور پر بات ختم ہو جاتی۔ مگر جینیا جب اس صُورتِ حال سے بہت زیادہ پریشان ہو گئی تو اُس نے فیصلہ کیا کہ توفانو کو اس بے بنیاد شک کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔

اسی محلے میں ایک نوجوان شخص رہتا تھا جس کی ایک مدت سے جینیا پر نظر تھی اور وہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس حسینہ سے راہ ورسم پیدا کرے۔ جینیا بھی اس نوجوان کو کچھ کچھ پسند کرتی تھی۔ چنانچہ اُس نے اس نوجوان کو اپنے قریب ہونے کے موقعے دینے شروع کر دیے۔ نتیجہ دونوں کے بے تکلفانہ مراسم کی صُورت میں ظاہر ہوا لیکن توفانو کی وجہ سے جینیا کے لیے اپنے محبوب سے کھلم کھلا تعلقات رکھنا مشکل تھا اس لیے اس نے یہ دیوار ڈھانے کا ایک منصوبہ بنایا۔

توفانو شراب کا رسیا تھا اور بلا نوش کہلاتا تھا چنانچہ جینیا نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اُسے رات کے وقت بہت زیادہ شراب پلاتی اور جب وہ نشے میں چُور ہو جاتا تو اسے چارپائی پر ڈال دیتی اور چپکے سے اپنے آشنا کو بلا لیتی۔

ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ شوہر کو شراب کے نشے میں دُھت چھوڑ کر اپنے محبوب نوجوان کے ساتھ رات کو گھر سے باہر بھی جانے لگی۔ وہ ہمیشہ صبح سے پہلے ہی گھر واپس آجاتی۔ توفانو کے متعلق اسے یقین رہتا تھا کہ وہ سُورج نکلنے سے قبل ہوش میں نہیں آئے گا۔

دُوسری طرف توفانو بہت دنوں سے یہ بات محسوس کر رہا تھا کہ اُس کی حسین بیوی اسے تو خوب شراب پلا دیتی ہے لیکن خود کبھی نہیں پیتی اُس نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میرے سو جانے کے بعد میری بیوی کسی اور مرد کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہو؟ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ حقیقت کا پتہ ضرور چلائے گا۔

دُوسری شام اُس نے شراب کا ایک قطرہ بھی نہیں پیا مگر جب گھر میں داخل ہوا تو ایسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگا اور اس طرح لڑکھڑانے لگا، جیسے آج اُس نے اپنے معمول اور ظرف سے زیادہ شراب پی لی ہو جینیا نے یہ حال دیکھا تو اُس نے توفانو کو مزید شراب پلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور روز کی طرح اُسے چارپائی پر لٹا کر اپنے آشنا کے پاس چلی گئی۔ اُس کے جاتے ہی توفانو نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اور کھڑکی کے پاس بیٹھ کر اُس کا انتظار کرنے لگا۔ اُس کی نگاہیں سامنے کی تاریک اور سنسان گلی پر لگی ہوئی تھیں اور وہ بے چینی سے اپنی ہرجائی بیوی کی واپسی کا منتظر تھا۔

جب جینیا واپس آئی اور اُس نے دروازہ اندر سے بند پایا تو بہت زیادہ پریشان ہوئی۔ اُس کی نظریں کھڑکی میں بیٹھے ہوئے اپنے شوہر پر نہیں پڑیں۔ اُس نے کئی بار زور زور سے دروازے کو دھکا دیا اور کوشش کی کہ دروازہ توڑ دے۔ توفانو اُس کی پریشانی سے خوش ہو رہا تھا۔ اُس نے اسے دیر تک طاقت آزمائی کرنے دی۔ جب بات برداشت سے باہر ہو گئی تو بولا "اے بدذات عورت! کھیل ختم ہو چکا۔ اب تُو اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ وہیں واپس جا جہاں سے آئی ہے۔ یاد رکھ اب تُو اس وقت تک اس دہلیز کے اندر قدم نہیں رکھ سکتی جب تک میں تیرے گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر بات صاف نہ کر لُوں۔"

جینیا خوشامد پر اُتر آئی۔ اُس نے حیلے سے اپنے شوہر کو بتایا کہ اگر تمہارے دل میں میری غیر موجودگی سے کوئی شُبہ پیدا ہو گیا ہے تو یقین کرو وہ بے بنیاد ہے کیونکہ میں نیند نہ آنے کے باعث اپنی سہیلی کے پاس دل بہلانے کے لیے چلی گئی تھی۔" اُس نے عذر پر عذر پیش کیے۔

توفانو کے لیے اب ہر دلیل بے اثر تھی۔ وہ اُس کی کوئی بات سُننے کو تیار نہ تھا۔ وہ غصے میں بھرا بیٹھا تھا اور اُس کے کرتوت سے پورے محلے کو مطلع کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جینیا کی چرب زبانی اور چاپلوسی بیکار رہی۔ جینیا نے جب یہ دیکھا کہ توفانو پر اُس کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تو وہ دھمکیوں پر اُتر آئی اور کہنے لگی۔

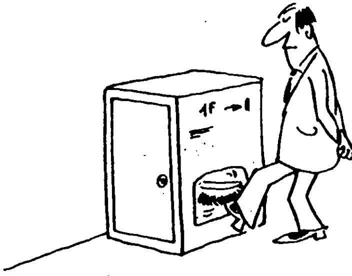
" بہتر ہے کہ دروازہ کھول دو ورنہ میرا نام جینیا ہے اگر تم سیدھی طرح دروازہ نہیں کھولو گے تو میں تمہاری زندگی اجیرن کر دوں گی۔"

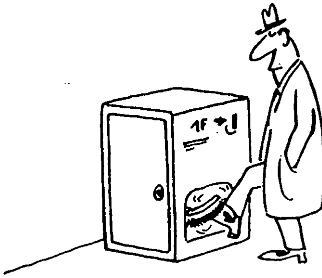
" وہ تو پہلے ہی کر چکی ہو اب اس سے زیادہ اور کیا ہو گا" ــ

توفانو نے جواب دیا۔
جینیا کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح تم مجھے بدنام کرنا چاہتے ہو۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ بیٹھے ہو۔ اس رسوائی سے بچنے کے لیے میرے پاس ایک راستہ موجود ہے اور وہ یہ کہ میں کنویں میں چھلانگ لگا دوں گی۔ کنواں ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ جب کنویں سے میری لاش برآمد ہوگی تو لوگ لامحالہ یہی سمجھیں گے کہ تم نے نشے کی حالت میں مجھے دھکا دے دیا ہوگا۔ پھر تمہیں یا تو یہاں سے فرار ہونا پڑے گا یا قانون کا شکنجہ میرے قتل کے جرم میں تمہاری گردن کس لے گا۔"

توفانو نے جینیا کی اس دھمکی کا بھی کوئی اثر نہ لیا اور اپنے ارادے پر مضبوطی سے جما رہا۔ جینیا نے پھر کہا "اب میں تمہاری بیوقوفی مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ خدا تمہیں معاف کرے۔ میں اپنی سوت کاتنے کی لکڑی تمہارے پاس امانتاً چھوڑے جا رہی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چل دی اور کنویں کے پاس پہنچ گئی۔ اندھیرے کی وجہ سے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ جینیا نے بڑی دقت سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور بلند آواز میں یہ کہتے ہوئے کنویں میں پھینک دیا کہ "خدا مجھے معاف کرے۔"
کنویں کا چھما کا سن کر توفانو کے ہوش اڑ گئے۔ وہ یہی سمجھا کہ جینیا نے کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ وہ فوراً ایک مضبوط لمبی رسی لے کر کنویں کی طرف دوڑا تاکہ جینیا کو باہر نکال سکے۔
جینیا چھپتی چھپاتی گھر کے پاس آ کر دیوار سے لگی کھڑی تھی جیسے ہی اس کا حواس باختہ شوہر گھر سے باہر نکلا۔ اس نے چپکے سے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا اور کھڑکی کے پاس جا بیٹھی۔

توفانو کنویں سے تھک ہار کر واپس آیا تو پانسا الٹ چکا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ وہ پچھتاوے سے ہاتھ ملنے لگا اور مسمسی صورت بنا کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ ابھی وہ جینیا سے مخاطب ہونے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ جینیا کی گرج چمک سنائی دی۔ وہ دانت پیس پیس کر کہہ رہی تھی "اچھا تو جناب کی شراب نوشی اس حد تک بڑھ گئی ہے، معلوم ہوتا ہے، بالکل مت ماری گئی۔ اب آپ پانی کے کنویں سے بھی شراب کشید کرنے تشریف لے جانے لگے۔"
توفانو کا انداز بدل گیا وہ ایک لمحے میں صورتِ حال کی نازک نوعیت







سمجھ گیا اور بیوی کی خوشامد کرنے لگا "اچھی جینیا! مجھے معاف کر دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ دروازہ کھول دو مجھے اندر آنے کی اجازت دے دو۔"
جینیا نے اپنی آواز اتنی بلند کر لی کہ پڑوسیوں کے کانوں تک پہنچ سکے۔ اس نے کہا "شرابی، نشے باز! مقدس صلیب کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اب تم اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتے۔ میں تمہاری حرکتوں

ستے تنگ آ چکی ہوں۔ میں گلا پھاڑ پھاڑ کر دُنیا والوں کو بتاؤں گی کہ تم
کس قماش کے آدمی ہو دِن بھر کیا کیا گل کھلاتے ہو اور راتوں کو کتنی دیر
سے گھر لوٹتے ہو۔"

جنیا کی اس سینہ زوری اور دیدہ دلیری پر توفانو کو بھی غصہ آ گیا۔
وہ غصے سے بے قابو ہو کر جنیا کو زور زور سے گالیاں دینے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا
کہ محلے والے جاگ پڑے۔ گھروں میں بتیاں جل اٹھیں اور کھڑکیوں میں
سَر ہی سَر نظر آنے لگے۔ جنیا نے اس موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھانے
کے لیے اُونچے سُروں میں رونا دھونا شروع کر دیا اور بڑی مظلومیت سے
شوہر کی بلانوشی کا قصہ نمک مرچ لگا کر محلے والوں کو سنانے لگی۔

"یہ اوباش روزانہ آدھی آدھی رات کو شراب کے نشے میں دُھت ہو کر
گرتا پڑتا گھر آتا ہے اور مجھ پر ظلم توڑتا ہے۔ اس ظالم نے میری جان
ضیق میں کر رکھی ہے۔ میں نے بہت دُکھ جھیل لیے مگر اب پانی سَر سے
اونچا ہو چکا ہے۔ اب میں مزید دُکھ برداشت نہیں کر سکتی۔ اسی لیے آج
میں نے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر رکھا ہے۔"

لوگ گھروں سے نکل نکل کر توفانو کے گرد جمع ہو چکے تھے۔
سب کے دِلوں میں جنیا کے لیے رحم اور توفانو کے لیے قہر کے جذبات
پیدا ہو چکے تھے چہ میگوئیوں کا بازار گرم تھا۔

توفانو کے لیے بپھرے ہوئے پڑوسیوں کے سامنے صفائی
پیش کرنا ضروری تھا۔ اس لیے اُس نے انصاف طلب لہجے میں سب
پورا واقعہ سُنا دیا۔

مگر جنیا اور چراغ پا ہو گئی۔ اُس نے سینے پر دو ہتڑ مارتے
ہوئے کہا "یہ جھوٹا ہے، بدکردار ہے۔ اپنے دِل کی کالک میرے منہ پر
ملنا چاہتا ہے۔ آپ لوگ خود دیکھ لیجیے کہ یہ شخص کس قسم کا ہے۔ آپ
لوگ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اگر اس کی بات سچی ہوتی تو یہ اس طرح سڑک پر
کھڑا ہُوا نہ ملتا بلکہ میری جگہ گھر میں بیٹھا ہُوا ہوتا۔ خدا کی قسم اُس وقت
یہ شخص جو بات کہتا آپ اس پر یقین کر لیتے۔ بس اسی سے اس کے کردار
کا اندازہ لگائیے۔ کس ڈھٹائی سے یہ اپنا الزام میرے سر رکھ رہا ہے۔
آپ لوگوں نے کنوئیں میں کسی چیز کے گرنے کی ہولناک آواز سُنی ہو گی۔ یہ
اسی آوارہ کی حرکت تھی۔ اس نے مجھے ڈرانے کے لیے شاید کوئی
بھاری چیز کنوئیں میں پھینکی ——— لیکن جب میں نے اس کا بھی کوئی اثر
نہیں لیا تو یہ خوشامد پر اُتر آیا۔ میں ایک تو بے زبان دُکھیاری ہوں تنگ آ کر
کئی بار طے کر چکی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے۔ میں محلے والوں کے سامنے
اسے رسوا کروں گی۔ خدا کے لیے اب آپ ہی اسے سمجھائیے، اسے
کچھ غیرت دلائیے۔"

ویسے تو عورت کی بات پر آنکھ بند کر کے یقین کر لینا مردوں
کی پرانی کمزوری ہے لیکن بھلا جنیا کی مُدلل بات کون نہ مانتا۔ تقریباً
سبھی لوگوں نے غریب توفانو پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ کر دی۔ جو
جس کے منہ میں آیا اُس نے کہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ توفانو کے لیے اس کے
سوا جان چھڑانے کا کوئی طریقہ نہ رہا کہ وہ سب کے سامنے ناک رگڑ کے
جنیا سے معافی مانگے اور آیندہ کے لیے قسم کھائے کہ ایسی کبھی
حرکت کا مرتکب نہیں ہو گا۔

بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ دُوسرے روز جنیا کے میکے والوں
کو جب اس واقعے کی اطلاع پہنچی تو وہ دوڑے دوڑے آئے اور
اُنہوں نے جنیا اور محلے والوں کے چشم دید بیانات سُنے تو توفانو
پر برس پڑے۔ جنیا میکے والوں کے سامنے اور شیر ہو گئی۔ اُس نے
اپنے رشتے کے ایک نوجوان بھائی کی شہ پا کر بوریا بستر باندھا
اور میکے چلی گئی۔

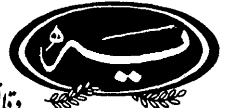
جنیا کے جانے کے بعد توفانو کا گھر سُونا اور دِل اُداس ہو گیا۔
وہ رہ رہ کر اپنی حماقت پر افسوس کرتا اور سوچتا کہ ممکن ہے، جنیا کے
متعلق اُس کا قیاس غلط اور شُبہ بے سروپا ہو۔ اسے خوبصورت جنیا
سے شدید محبت تھی۔ اسی محبت نے رفتہ رفتہ اُسے یہ یقین کرنے پر
مجبور کر دیا کہ جنیا ایک معصوم اور پاکباز عورت ہے۔ "میں نے واقعی
اُس کا بہت دِل دُکھایا ہے۔ اب میں کبھی اُس پر شک نہیں کروں گا۔"
اُس نے عزم کیا۔

تقریباً ایک ہفتے کی کربناک تنہائی جھیلنے کے بعد توفانو اپنے
خاندان کے بڑے بوڑھوں کی خدمت میں حاضر ہُوا اور اُن سے
عرض کی کہ وہ مہربانی کر کے اس معاملے میں پڑیں اور رُوٹھی ہُوئی جنیا کو
گھر واپس لانے کے لیے اس کی مدد کریں۔

آخر توفانو کو اپنے اور جنیا کے خاندانی بزرگوں کے سامنے
ایک بار پھر جنیا سے معافی مانگنی پڑی اور یہ عہد کرنا پڑا کہ وہ آیندہ
جنیا پر خواہ مخواہ شک نہیں کرے گا اور شراب کبھی سُونگھے گا بھی نہیں ———
جنیا نے اُسے معاف کر دیا اور اُس کے ساتھ چلی آئی۔

تاجر کی بیوی

دوسری داستان ✱ کمال الدین



شہر آمی کے ایک دولتمند شخص کی سرگزشت ہے۔

وقائع نگاروں نے اس کا نام نہیں لکھا۔ اُس کی بیوی ایک نہایت حسین عورت تھی اور وہ اُسے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہتا تھا لیکن اُس پر اتنا ہی شک بھی کرتا تھا۔ اُسے خوب معلوم تھا کہ اس کی بیوی اُس کی خوشیوں کا خزانہ ہے۔ لیکن معلوم نہیں کس طرح اُس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ شہر کا ہر شخص اُس کی بیوی کا محبوب ہے۔ ان شکوک نے اسے اپنی بیوی کی سخت نگرانی پر مجبور کر دیا اور ہوتے ہوتے نگرانی میں ایسی شدت پیدا ہو گئی کہ کوئی شخص کسی چور اور قاتل کی بھی اس طرح نگرانی نہ کرے گا۔ وہ کسی تقریب میں شرکت تک نہ کر سکتی تھی یہاں تک کہ عبادت کے لیے گرجا میں جانے کی بھی ممانعت تھی۔ اُس کے لیے گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھنا منع تھا۔ مکان کی کھڑکیاں بند کر دی گئی تھیں۔ سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ یہ سب کچھ ایک بے خطا خاتون کے لیے ہو رہا تھا۔ عورت بے چاری بہت پاکباز اور وفا شعار تھی تنہائی اور بے اعتباری کے احساس نے اُسے تصویرِ غم بنا کر رکھ دیا۔ دِل بہلانے کی کوئی صُورت نظر نہ آتی تھی'' بے چین اور متلاشی نگاہیں در و دیوار سے ٹکرا کر واپس آ جاتی تھیں۔ وہ بہت دِنوں تک اسی کشمکش و پیچ میں رہی کہ اس مُصیبت کا حل کیا ہو؟ آخر اُس کا خیال اپنے پڑوسی کی طرف گیا۔ اس پڑوسی کا گھر اُس کے مکان سے ملحق تھا۔ اُس نے دونوں مکانوں کی مشترک دیوار کی طرف غور سے دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ اگر دیوار میں کسی ایسی جگہ سوراخ کر دیا جائے جس پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے، تو میری اُلجھن کا حل نکل سکتا ہے اُس نے سوچا کہ پہلے پڑوسی نوجوان سے مراسم پیدا کیے جائیں اور پھر ترکیب سوچی جائے کہ وہ میرے گھر میں کس طرح داخل ہو۔ اگر یہ کام ہو گیا تو میں اپنے شوہر

سے انتقام بھی لے سکوں گی اور میری تنہائی بھی دُور ہو جائے گی۔ پھر یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک میرا شوہر مجھ پر شک کرنے سے باز نہیں آجاتا۔

چنانچہ جب دُوسرے دِن اُس کا شوہر حسبِ معمول گھر مقفل کرکے باہر چلا گیا تو خوبصورت عورت نے دیوار کا بغور جائزہ لیا اور پھر اُس نے اپنے مقصد کے لیے اُس کوٹھری کا انتخاب کیا جس میں گھر کا کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ اس کوٹھری کی دیوار اُس نے تھپتھپا کر دیکھی تو وہ کچھ کھوکھلی معلوم ہوئی۔ پھر اُس نے چھینی سے دھیرے دھیرے دیوار پر ضربیں لگانی شروع کر دیں۔ اس طرح وہ جلد ہی ایک معمولی سا سُوراخ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کے بعد اُس نے اپنی ایک آنکھ سُوراخ میں لگائی تو پتہ چلا کہ دیوار کے پار اُس نوجوان ہی کا کمرہ ہے۔ اُس نے زیرِ لب کہا اگر یہ کمرہ نوجوان فلیبو کا ہے تو میں گویا اپنی منزل کا نصف راستہ طے کر چکی ہوں۔

اُس کے دِل میں مسرت و انبساط کی ایک لہر دوڑ گئی۔ عورت نے اپنی معتمد نوعمر خادمہ کو بُلایا اور اسے بھی اس راز میں شریک کر لیا۔ خادمہ کو اپنی مالکن کی بے بسی پر بہت افسوس ہوتا تھا اور وہ اس کی حالتِ زار دل ہی دل میں کُڑھتی رہتی تھی۔ عورت نے خادمہ سے یہ تصدیق کر لی کہ یہ کمرہ نوجوان فلیبو ہی کا ہے اور وہ اس میں تنہا سوتا ہے۔

پھر دُوسرے دِن وہ اس سُوراخ کے پاس گئی اور ایک چھوٹی سی کنکری دُوسری طرف اُچھال دی۔ نوجوان ہکا بکا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ عورت نے دوسری کنکری اُچھالی اور اس بار نوجوان کی نظریں سُوراخ پر پڑ ہی گئیں۔ وہ تیزی سے سُوراخ کے پاس پہنچا۔ عورت نے آہستہ سے اسے پکارا۔ "فلیبو۔"

فلیبو نے اپنی ایک آنکھ سوراخ سے لگائی تو دُوسری طرف ایک آنکھ جگر جگر کرتی محسوس ہوئی۔ وہ حیران و پریشان ہو گیا اور ابھی کسی نتیجے پر نہ پہنچا تھا کہ عورت نے پھر اس کا نام پکارا۔ "فلیبو! یہ میں ہوں تمہاری پڑوسن۔ تمہارے آس پاس کوئی ہے تو نہیں؟"

فلیبو نے اسے دیکھنے کی کوشش کی اور جواب دیا: "نہیں یہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہوں۔ کہو کیا کام ہے؟"

عورت نے کہا: "یہ سُوراخ اتنا بڑا کر دو کہ ہم دونوں اچھی طرح ایک دُوسرے کو دیکھ سکیں۔"

فلیبو چکرا گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے؟ اُس نے پوچھا۔ "یہ سُوراخ دیکھ کر تمہارا شوہر کیا کہے گا؟"

"سُوراخ ذرا بڑا تو کرو اور باتیں بعد میں پُوچھنا۔"

نوجوان فلیبو سب کچھ سمجھ گیا۔ وہ خوش ہوا کہ تقدیر گھر بیٹھے اُس کے لیے ایک پری بھیج رہی ہے۔ اُس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور چھینی ہتھوڑی سنبھال لی اور پھر جلد ہی دیوار میں اتنا بڑا سُوراخ ہو گیا کہ دونوں پیاسے ایک دُوسرے کو اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ جیسے ہی عورت کے سحر انگیز سراپا پر اُس کی نظر پڑی وہ اُس پر دل و جان فدا کر بیٹھا۔

دونوں ایک دُوسرے کو اشتیاق اور آرزو سے دیکھتے رہے۔ اس کے بعد عورت نے پہل کی اور فلیبو کو اپنی بے کسی کی مفصل روداد بے کم و کاست سُنا دی۔ فلیبو پر بہت اثر ہوا۔ اُس نے صرف اتنا پوچھا: "اگر تمہارے شوہر کو پتہ چل گیا تو.....؟"

عورت جذباتی ہو کر بولی: "میری جان فلیبو! اس تنہائی نے مجھے چُوس لیا ہے۔ اب کچھ بھی ہو میں یہ تنہائی دُور کرنا چاہتی ہوں، تم اس بڑے شگاف کے پاس روزانہ آجایا کرو۔" پھر عورت نے کچھ جھجک کر پوچھا: "کیا میں تمہیں اچھی لگتی ہوں۔"

"اچھی۔" فلیبو جھینپ سا گیا۔ "میں اس خوش نصیبی پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے۔ کاش تم جو کچھ کہہ رہی ہو وہ سچ ہو۔"

"مجھ پر یقین کرو۔" عورت نے جواب دیا۔

فلیبو دنگ تھا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے یا حقیقت سے دوچار ہے۔ اس نے سوچا کہ جن حالات نے اس حسین عورت کو میرے سامنے لا کھڑا کیا ہے وہ یقیناً مجھے کچھ اور قدم بڑھانے پر مجبور کر دیں گے۔

اس دِن کے بعد دونوں کا دستور ہو گیا کہ ہر روز گھنٹوں سُوراخ سے لگے کھڑے رہتے اور دُنیا جہان کی باتیں کرتے۔ فلیبو عورت کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا اور راز و نیاز کی باتیں کرتا رہتا۔ عورت بھی گرمجوشی سے اُس کا پُورا ساتھ دیتی۔

کرسمس کے موقع پر عورت نے اپنے شوہر سے درخواست کی کہ اُسے گرجا جانے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح پادری کے سامنے رو رو کر اپنے گناہوں کا اعتراف کر سکے۔ شوہر نے حیرت سے پوچھا: "کیسے گناہ؟ کیا تم نے کوئی گناہ کیا ہے؟"

"کیوں۔" خاتون نے کہا: "کیا تم نے مجھے فرشتہ سمجھ رکھا ہے؟"

میں بھی دُوسری عورتوں کی طرح اپنے سینے میں دِل رکھتی ہوں اور
دِل خواہشوں سے خالی نہیں ہوتا۔"
اُس کا شوہر اُلجھن میں مبتلا ہوگیا کہ آخر کس طرح اپنی بیوی کے
گناہوں کا راز معلوم کرے۔ وہ کچھ سوچ بچار کے بعد بولا "اچھا میری
طرف سے تمہیں گرجا میں جا کر پادری کے رُوبرُو اعترافات کرنے کی اجازت
ہے لیکن یہ یاد رکھنا کہ اعترافات کے لیے تم صرف ہمارے خاندانی گرجا
میں جا سکو گی اور وہاں کا مستقل پادری یا اس کا کوئی نامزد کیا ہوا پادری
ہی تمہارے اعترافات سُن سکے گا۔ نیز یہ کہ تم کسی قیمت پر بھی اعترافات
کے بعد وہاں ٹھہرو گی نہیں بلکہ فوراً واپس آجاؤ گی۔"
بیوی نے اُس کی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کا وعدہ کرلیا۔
کرسمس کے دِن وہ علی الصباح اٹھی، نہائی دھوئی خوبصورت
لباس پہنا اور گرجا کی طرف چل دی۔ ادھر اس کے شوہر نے بھی نہا دھو
کر کپڑے پہنے اور وہ بھی اسی گرجا کی طرف چل دیا اور بیوی سے قبل
ہی گرجا پہنچ گیا۔ گرجا کے بڑے پادری سے اُس نے پہلے ہی یہ معاملہ
طے کر رکھا تھا کہ پادری کی جگہ وہ خود راہبوں کا جُبہ پہن کر بیٹھے گا۔
اور سَر اور گردن رُومال میں چھپا کر خود اپنی بیوی کے اعترافات سُنے گا۔
چنانچہ وہ پادری کی جگہ بیٹھ گیا اور بیوی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔
جب وہ خاتون بھی وہاں پہنچ گئی تو پادری نے کہا کہ وہ خود
تو اس کے اعترافات نہیں سُن سکتا البتہ اپنے ایک ماتحت کو اس کام پر
مامور کر دے گا۔ یہ کہہ کر اس نے اسے اسی کمرے میں بھیج دیا جہاں اس
کا شوہر پادری کے بھیس میں بیٹھا اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ ابھی دن پوری
طرح طلوع نہیں ہوا تھا اور کچھ اندھیرا باقی تھا۔ اور شوہر نے اپنی
آنکھوں اور چہرے کا بیشتر حصہ چھپا رکھا تھا۔ اس کے باوجود خاتون
نے دیکھتے ہی اسے پہچان لیا اور دِل میں کہنے لگی "میرے خدا! یہ پاپی
پادری بنا ہوا میرے اعترافات سُننا چاہتا ہے؟ بہت خُوب!
آج میں بھی اُسے ایسے چکر میں ڈالوں گی کہ کیا یاد کرے گا۔ چنانچہ اُس نے
پادری پر کسی طرح بھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اسے پہچان چکی ہے۔ وہ
شوہر کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ شوہر نے اپنی آواز چھپانے کے لیے
کچھ کنکریاں مُنہ میں ڈال رکھی تھیں اور مطمئن تھا۔ بیوی نے معمولی معمولی
اعترافات کے بعد اپنے پادری شوہر سے کہا "مقدس باپ! میں ایک
پادری کے عشق میں بُری طرح گرفتار ہوں اور وہ بھی مجھ پر جان چھڑکتا
ہے۔ روزانہ رات کو پادری میرے پاس آجاتا ہے اور محبت کے
مزے لُوٹتا ہے۔"
ابھی وہ یہیں تک کہہ سکی تھی کہ اُس کے شوہر نے یہ محسوس کیا
کہ کسی نے اُس کے دِل میں خنجر اُتار دیا ہے لیکن ابھی وہ اور باتیں بھی
جاننا چاہتا تھا اس لیے بے حِس و حرکت بیٹھا رہا۔ "یہ کس طرح؟" اس نے
عورت سے دریافت کیا۔ "تمہارا شوہر کہاں ہوتا ہے؟ کیا وہ تمہارے
پاس نہیں سوتا؟"
خاتون نے اثبات میں جواب دیا۔
"تو یہ کس طرح ممکن ہے؟" پادری نے پھر سوال کیا۔ "پادری تمہارے
ساتھ کس طرح سوتا ہے؟"
"جناب!" اس نے معصومیت سے جواب دیا۔ "وہ میرے کمرے
میں کس طرح داخل ہوتا ہے؟ یہ میں نہیں جانتی لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں
کہ دروازے میں کتنا ہی مضبوط تالا کیوں نہ لگا ہو اس کا ہاتھ لگتے ہی
وہ کھل جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب وہ میرے کمرے کے دروازے
پر پہنچتا ہے تو چند الفاظ بڑبڑاتا ہے جن کے اثر سے میرا شوہر گہری نیند
سو جاتا ہے۔"
"یہ تو بہت بڑا گناہ ہے۔ تمہیں فوراً اس سے توبہ کرنی چاہیئے
اور آئندہ اس سے بچنا چاہیئے۔" پادری نے بدقت تمام کہا۔
"جناب افسوس کہ اس سے بچنا میرے بس میں نہیں ہے کیونکہ
میں بھی اُس سے دیوانہ وار محبت کرتی ہوں۔"
"تو پھر میں اس صورت میں گناہوں سے تمہاری نجات کا ذمہ
نہیں لے سکتا۔"
"خدا رحم کرے۔" خاتون نے شرمساری اور غم کے مصنوعی
لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو یہاں جھوٹی اور غلط باتیں بتانے نہیں آئی ہوں
یقین کیجیے اگر اس حرکت سے گریز کرنا میرے بس میں ہوتا تو میں ضرور
کرتی۔"
"محترمہ!" پادری نے کہا۔ "میرا دِل بہت مغموم ہے کیونکہ میں
دیکھ رہا ہوں کہ آپ ایمانداری سے اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہی
ہیں چنانچہ اب میں آپ کے لیے اتنا ہی کرسکتا ہوں کہ خدا کے حضور
آپ کی مغفرت کے خیال سے چلہ کشی کروں شاید اس سے آپ کو کوئی
فائدہ ہو جائے۔ میں وقتاً فوقتاً اپنے ایک نوجوان ماتحت کو آپ کے پاس

بھیجتا رہوں گا آپ اُسے یہ بتاتی رہیں کہ میری چلّہ کشی سے آپ کو کوئی فائدہ پہنچا یا نہیں تاکہ میں کوئی دُوسرا قدم اُٹھا سکوں۔"

"نہیں جناب آپ ایسا نہیں کریں گے کیونکہ میرا شوہر ذرا شکّی ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہ کسی وقت آپ کے ماتحت کو دیکھ لے اور یہ سوچے کہ میں نے اُسے کسی بُری نیت سے بلایا تھا۔ وہ میرا جینا دوبھر کردے گا۔"

"معزز خاتون!" پادری کی نرم لیکن مردانہ آواز اُبھری۔ "آپ اطمینان رکھیں۔ میں یہ معاملات کچھ اس طرح ترتیب دُوں گا کہ آپ کا شوہر آپ سے کبھی ایک لفظ تک نہیں کہہ سکے گا۔"

"بس میں اس سے زیادہ کچھ بھی نہ عرض کروں گی۔" خاتون نے جواب دیا۔

اس طرح اُس کے اعترافات ختم ہوگئے اور وہ غائب ہوگئی۔ اس کے بعد وہ اُٹھی اور گرجا کی عبادت میں شریک ہوئی۔ ادھر اُس کا شوہر بھی اپنی جگہ سے اُٹھا۔ غم و غصّہ سے اس کا رُواں رُواں جل رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی چُغہ وغیرہ اُتار پھینکا اور گھر واپس آکر اس اُدھیڑ بن میں لگ گیا کہ کس ترکیب سے پادری اور بیوی کو یکجا پکڑے اور اپنے انتقام کی آگ بُجھائے۔

بیوی نے گھر میں شوہر کے اندرونی کرب کو اُس کے چہرے سے محسوس کرلیا۔ وہ خوب سمجھ رہی تھی کہ شوہر حقیقت حال کو سمجھنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے اور چہرے پر بناوٹی سکون پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بالآخر اُس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ رات گھر سے باہر رہ کر پادری کی آمد کا انتظار کرے گا۔ چنانچہ اُس نے بیوی سے کہا "آج رات میں ایک کام سے باہر جارہا ہوں۔ اس لیے مکان کے تمام دروازوں کو تالے لگا کر سونا۔"

"بہت بہتر ہے۔" خاتون نے جواب دیا۔

جب شوہر باہر چلا گیا تو بیوی گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر دیوار کے شگاف کے پاس پہنچی اور ترنم ریز ہلکی آواز میں فلیو کو آواز دی۔ وہ فوراً ہی سامنے آگیا۔ عورت نے صبح کی تمام کارروائی سے اُسے آگاہ کیا اور شوہر کے حالیہ پروگرام کی بابت بھی بتایا۔ اُس نے کہا "لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا شوہر مکان کے آس پاس کہیں چھپ کر گھر کے صدر دروازے کی نگرانی کرے گا۔ اس چکر میں ساری رات گھر میں داخل نہ ہوگا۔ لہٰذا تم چھت کے راستے رات کو میرے پاس آجانا۔ اِس طرح ہم دونوں کچھ اور قریب رہ سکیں گے۔"

فلیو بہت خوش ہُوا۔ کہنے لگا "بڑی خوشی کی بات ہے۔ تم میری طرف سے مطمئن رہو میں ضرور آؤں گا۔"

جب رات آئی تو اُس کا شوہر ہتھیاروں سے آراستہ ہوا اور مکان کی آخری منزل کے ایک کمرے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اُدھر بیوی نے شوہر کی ہدایت کے مطابق دروازے اندر سے مقفل کرلیے۔

اس طرح اب صُورتحال یہ تھی کہ شوہر سب سے نچلی منزل کے ایک کمرے میں آہٹوں پر کان لگائے بیٹھا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ اب اگر وہ خود اپنے گھر میں داخل ہونا چاہتا تو ممکن نہ تھا۔ ادھر نوجوان فلیو چھت پر سے ہوتا ہوا عورت کے کمرے میں جا پہنچا اور دونوں سرگشتہ راہ سیاحوں نے ایک دُوسرے کو اچھی طرح دریافت کیا۔ صبح کے قریب فلیو عورت سے جُدا ہوگیا اور جس راستے سے آیا تھا، اُسی راستے واپس چلا گیا۔

ادھر تھکا ماندہ اور بھوکا پیاسا شوہر رات بھر سردی میں ٹھٹھرتا اور پادری کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔ اُس نے نہایت مستعدی سے نگرانی جاری رکھی تھی لیکن صبح کے قریب نیند نے غلبہ پالیا اور وہ اسی کمرے میں سورہا۔ جب آنکھ کُھلی تو چاروں طرف دُھوپ پھیل چکی تھی اور اُس کے گھر کا دروازہ اُس کے انتظار میں کُھلا ہُوا تھا۔ وہ چُپ چاپ گھر میں داخل ہوا اور ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد باہر نکلا اور ایک نوجوان کو پادری کے لباس میں اپنی بیوی کے پاس بھیجا اور معلوم کیا کہ آیا وہ پادری جس سے خاتون محبت کرتی ہے گزشتہ رات اس سے ملنے آیا تھا یا نہیں۔ عورت نے کہلا بھیجا "نہیں وہ نہیں آیا۔"

اس کے بعد اس شخص نے اسی طرح معلوم نہیں کتنی راتیں آخری منزل کے کمرے میں سردی سے ٹھٹھرتے اور پادری کا انتظار کرتے گزار دیں اور ان تمام راتوں میں اُس کی حسین بیوی فلیو سے ملتی اور اُسے قریب کرتی رہی۔ آخر شوہر کی طاقت برداشت جواب دے گئی اور اُس نے اپنی بیوی سے پوچھ ہی لیا "بتاؤ تم نے اُس پادری کے سامنے اپنے کن گناہوں کا اعتراف کیا تھا؟"

عورت نے جواب دیا "مذہب آپ کو اس بات کی

اجازت نہیں دیتا کہ آپ مجھ سے کوئی ایسا سوال کریں۔"

"بدکار عورت!" شوہر ھنیکارا۔ "تیرے دل میں کیا ہے۔ میں خوب جانتا ہوں۔ یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ تُو نے اس پادری سے کیا کہا تھا اور اب میں یہ جاننا چاہتا ہوں اور جان کر رہوں گا کہ وہ کون پادری ہے جس کے عشق میں تُو مبتلا ہے؟ ——— بتا ورنہ آج میں تجھے جیتا نہ چھوڑوں گا۔"

"یہ بات غلط ہے کہ میں کسی پادری کے عشق میں مبتلا ہوں۔" خاتون نے سکون سے جواب دیا۔

"جھوٹ، بالکل جھوٹ"۔ شوہر کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "کیا تُو نے پادری کے سامنے یہ نہیں کہا تھا کہ تُو ایک پادری سے محبت کرتی ہے اور وہ پادری بھی تجھے چاہتا ہے۔"

"یہ بات تم ایک پادری سے کبھی نہیں اُگلوا سکتے۔" خاتون نے کہا۔ "تم یہ سب کس طرح کہہ سکتے ہو، میں نے تو اُس سے کوئی ایسی بات نہیں کی۔"

"میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ وہ پادری کون ہے۔ میں اب مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔"

وہ مسکرانے لگی۔ "بھلا یہ بھی کوئی معمولی بات ہے جو میں تمہیں بتا دوں"۔ پھر پُرسکون لہجے میں کہنے لگی۔ "کچھ بھی ہو تمہارے سر میں عقل ہرگز نہیں ہے۔ ——— جب سے تم نے میرے خلاف اپنے دل میں شک کو جگہ دی ہے۔ اس وقت سے آج تک تم نے میرے ساتھ نہایت سنگدلانہ سلوک کیا ہے اور مجھے خوشیوں سے محرُوم رکھا ہے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس طرح تم چشمِ باطن سے محروم ہو اسی طرح میں چشمِ ظاہر سے محرُوم ہوں۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ میں نے پہلی ہی نظر میں اس پادری کو پہچان لیا تھا جس نے میرے اعترافات سُنے تھے اور بھلا میں اس پادری کو کیوں نہ پہچانتی؟ وہ تو میری زندگی تھا، میرے دل کی دھڑکن تھا، میری نس نس کا مالک تھا۔ کیوں! ہونا؟ تمہی تو تھے وہ پادری! چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جو کچھ تم جاننا چاہتے ہو تمہیں صاف صاف بتا دیا جائے۔ بہرحال اگر تم اتنے ہی عقلمند اور دانا شخص تھے جتنا خود کو سمجھتے ہو تو اپنی بیوی کے راز دریافت کرنے کے لیے وہ طریقہ کبھی نہ اختیار کرتے اور نہ ہی اعترافات سُننے کے بعد بے بنیاد شبہات میں مبتلا ہوتے بلکہ جو کچھ میں نے تمہیں بتایا تھا اسے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرتے اور مجھے بے قصور اور بے گناہ تسلیم کرتے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں ایک پادری کے عشق میں مبتلا ہوں اور اب میں تم سے پوچھتی ہوں کہ کیا وہ تم ہی نہ تھے جس سے میں محبت کرتی تھی۔ جس وقت میں نے وہ اعتراف کیا تھا۔ اُس وقت تم پادری کے رُوپ میں تھے۔ اور میں نے تمہیں یعنی پادری کو اپنا محبُوب کہا تھا۔ کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میرے گھر کا کوئی دروازہ بھی ایسا نہیں جس سے وہ داخل نہ ہو سکتا ہو۔ لہٰذا تم ہی بتاؤ کہ میرا یہ کہنا کیا غلط تھا اور پھر میں نے یہ بھی کہا تھا کہ پادری رات کو میرے پاس آ کر سویا کرتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ کون سی رات ایسی گزری جس میں ہم دونوں ساتھ نہ رہے ہوں۔ تم نے میرے پاس اپنا آدمی بھیج کر یہ معلوم کیا تھا کہ تمہاری عدم موجودگی میں پادری آیا تھا یا نہیں۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں نے اسے کیا جواب دیا کہ پادری میرے پاس نہیں آیا۔ دُنیا میں تم جیسا شکی کوئی دُوسرا نہ ہو گا۔ تمہیں شک نے اندھا کر دیا ہے۔ تم نے باہر کے آخری کمرے میں راتیں گزار کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ تم کسی اہم کام سے کہیں دُور گئے ہوئے ہو، حالانکہ تم میری نگرانی کرتے رہے ہو، میں تم سے درخواست کروں گی کہ ذرا عقل کے ناخن لو اور جس قید و بند میں مجھے محصُور کر رکھا ہے اُس سے مجھے آزاد کر دو۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اگر میں چاہتی تو تمہاری غیر موجودگی میں کسی کے ساتھ بھی آلُودہ ہو سکتی تھی اور تم سو آنکھیں بھی رکھتے تب بھی مجھے نہ پکڑ سکتے۔"

شوہر دم بخود بیوی کی باتیں سُنتا رہا اور دل ہی دل میں اُس کی حاضر دماغی کی داد دیتا رہا۔ وہ دیر تک اُس کی تعریفیں کرتا رہا اور آخر اُس نے بیوی سے یہ وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کبھی اُس پر کوئی پابندی عائد نہ کرے گا۔

عورت نے پہلی بار سکُون کا سانس لیا اور اس نے پہلی فرصت میں وہ سُوراخ بند کرا دیا جو اپنے محبوب فلیو سے راز و نیاز کی گفتگو کرنے کے لیے اُس نے بنایا تھا۔ کیونکہ اب اُس کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ اب وہ چاہتی تو گھر کے عام دروازوں سے اُسے بُلا سکتی تھی۔ اسے صرف ایک نظام الاوقات ترتیب دینا پڑتا تھا۔ ہے ایسی عورت، شک نے جس کی زندگی تلخ کر دی ہو، اس آزادی کے بعد کیا قدم اُٹھائے گی۔ یہ بات سمجھنے والے بخُوبی سمجھ سکتے ہیں۔ ❀

اِس تحریر میں بہت سے لوگوں کیلیے عِبرت کا سامان موجود ہے

نیلے موتی سُرخ بال

شاہدہ پروین



کے مغربی علاقے میں مُردے کو دفنانے کے بعد اُس کی قبر پر اتنی مٹی ڈالی جاتی ہے کہ ایک چھوٹا سا ٹیلا بن جاتا ہے۔ چنانچہ ہر قبرستان میں ٹیلے ہی ٹیلے نظر آتے ہیں۔

ایسا ہی ایک قبرستان ہنگ پنگ نامی قصبے میں بھی ہے جہاں میں گزشتہ ستمبر کی ایک بارانی دوپہر میں پہنچا تھا۔ میں نے یہ سفر ایک کشتی کے ذریعے کیا تھا۔ قبرستان دریا کے کنارے ہی واقع ہے۔ اس لیے ساحل پر پہنچ کر میری نظر سب سے پہلے ٹیلوں اور گھنے درختوں پر پڑی۔

میں نے شنگھائی سے ہنگ پنگ کا یہ طویل سفر علم طبقات الارض کے ایک ماہر مسٹر ٹائیلر کی دعوت پر کیا تھا لیکن چونکہ میں اُنہیں اپنے پہنچنے کی تاریخ سے مطلع نہیں کر سکا تھا اس لیے مجھے کشتی سے اُترتے ہی ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑانی پڑیں۔ شدید بارش کی وجہ سے پورے قصبے پر سناٹا طاری تھا۔ ایک کھٹارا سی ٹیکسی دُور کھڑی ہُوئی تھی۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ ٹیکسی ناکارہ ہے اور اس کا مالک اسے اینٹوں پر کھڑی کر گیا ہے لیکن غور سے دیکھنے پر معلوم ہُوا کہ ابھی ٹیکسی میں جان باقی ہے۔

ٹیکسی شاید بہت دیر سے وہیں کھڑی تھی اسی لیے اُس کا انجن سرد ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے کئی بار اُسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی اور پھر جھنجھلا کر انجن کا جائزہ لینے میں مصرُوف ہو گیا۔ مجھے اپنے بارش میں بھیگے ہوئے کپڑوں کی وجہ سے پہلے ہی سخت کوفت ہو رہی تھی اور اس پر یہ مریض ٹیکسی۔ عجب کشمکش میں مبتلا تھا لیکن اس کے سوا

بچا چارہ تھا۔ پشت گاہ سے سر ٹکا کر میں نے اپنی نظریں قبرستان پر جما دیں۔

قبرستان میں مجھ سے چند گز کی دُوری پر ایک شخص کسی قبر کے نزدیک بیٹھا ہُوا تھا۔ قبر پر ایک سفید صلیب نصب تھی۔ بارش کی وجہ سے اس شخص کا ہیولا دھندلا نظر آرہا تھا لیکن یہ بات واضح تھی کہ وہ یورپی طرز کا سیاہ سُوٹ پہنے ہوئے ہے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ یقیناً کوئی مسیحی پادری ہے اور کسی مسیحی کی قبر پر دُعائے مغفرت کے لیے آیا ہے۔

شنگھائی میں ایک بُوڑھی امریکن عورت نے بتایا تھا کہ سنگ پنگ میں دو مسیحی پادری رہتے ہیں۔ ایک کا نام سپراگ اور دُوسرے کا نام گبنز ہے۔ اُن میں سے ایک انگریز تھا اور دُوسرا امریکی۔ بُوڑھی عورت نے چلتے وقت مجھے ایک بنڈل بطور امانت دیا تھا جس میں خُوبصورت کڑھے ہوئے میز پوش تھے اور کچھ چادریں تھیں۔ اُس نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں یہ تحفے ان دونوں حضرات کی بیویوں کو پہنچا دُوں۔

ڈرائیور ابھی تک بونٹ پر جُھکا ہوا تھا۔ میں نے کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا: "وہ صاحب کون ہیں؟" میرا اشارہ قبرستان میں بیٹھے ہوئے شخص کی طرف تھا۔ "پادری سپراگ تو نہیں ہیں؟"

ڈرائیور نے مسکرا کر سر ہلایا اور چینی زبان میں کچھ کہا جس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ میں نے پھر پوچھا: "کہیں وہ شخص پادری گبنز تو نہیں ہے؟"

وہ پھر سر ہلا کر رہ گیا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

میں نے اپنا بیگ کھول کر بُوڑھی عورت کا دیا ہُوا بنڈل نکالا اور قبرستان میں داخل ہو گیا۔ میرے پاس نہ برساتی تھی اور نہ چھتری لیکن ظاہر ہے کہ اب میں اس سے زیادہ نہیں بھیگ سکتا تھا۔

قریب پہنچنے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ شخص بُری طرح بھیگا ہُوا ہے۔ میں حیران تھا کہ کوئی پادری آخر اتنا فرض شناس کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ مجھے آتا دیکھ کر اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں، نہ ہی اس کے چہرے کی سنجیدگی میں کوئی فرق آیا۔ اُس کی عُمر بھی کوئی تیس برس ہوگی۔ سُنہرے فریم کا چشمہ اور میلی سی قمیص۔ شیو بھی بڑھا ہوا تھا۔

"محترم سپراگ؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں!" چہرے کی طرح اس کا لہجہ بھی بے حد سنجیدہ تھا۔

"شام بخیر مسٹر سپراگ! میں یہاں مسٹر ٹائیلر کا مہمان ہوں۔ شنگھائی کی مسز کریب نے آپ کی بیوی کے لیے یہ بنڈل بھجوایا ہے۔"

"مسز کریب۔ خدا اُن پر رحمتوں کا سایہ قائم رکھے۔ وہ بڑی مہربان خاتون ہیں۔" وہ بدستور سنجیدہ تھا، "مگر انہیں شاید یہ علم نہیں ہے کہ میری بیوی گزشتہ سال ہیضے کا شکار ہو کر فوت ہو چکی ہے۔" اُس نے قبر کی طرف اشارہ کیا۔ ماحول پر ایک ناخوشگوار سکوت چھا گیا

میں نے کہا۔ "مجھے آپ سے بے حد ہمدردی ہے۔ بہرکیف! آپ یہ تحفہ تو رکھ ہی لیجیے۔ اس میں کچھ میز پوش اور چادریں ہیں۔ آدھی چیزیں آپ کے لیے ہیں اور آدھی مسز گبنز کے لیے۔ از راہِ عنایت آپ اُن تک پہنچا دیجیے گا اور بتا دیجیے گا کہ یہ تحفہ مسز کریب نے بڑے اشتیاق سے بھیجا ہے۔"

پادری کے چہرے پر دُکھ کی ایک شدید لہر آئی اور گزر گئی۔ وہ خاموش رہا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن نہ کہہ سکا۔

"مسز کریب نے بتایا تھا کہ قصبے میں سبھی لوگ مسز گبنز کو جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہی سُرخ بالوں والی خاتون۔" سپراگ نے سر جُھکا لیا۔

"خدا مجھے معاف کرے۔" وہ کوسنے دینے کے انداز میں بولا: "لیکن میرے دل سے یہ بددُعا نکلتی ہے کہ مسز گبنز مر جائے۔ خدا کرے کہ اُس کے سُرخ بال اور اُس کا نیلے موتیوں کا ہار اور اُس کا شوہر سب جہنم کی آگ میں جلائے جائیں۔"



رات کو جب میں اور ٹائیلر کھانے کے بعد برآمدے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو سپراگ کا ذکر چھڑ گیا۔ ٹائیلر نے بتایا، "سپراگ اور اس کی بیوی جنگ کے فوراً بعد اس قصبے میں آئے تھے۔ سپراگ کو پہلی مرتبہ تبلیغ و ہدایت کے کام پر باہر بھیجا گیا تھا اس لیے وہ بے حد خوش تھا۔ اُس کی بیوی بہت کم عمر اور حسین تھی۔ سیاہ لمبے بال، بڑی بڑی بادامی آنکھیں اور سُنہری رنگت۔ اُن کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اس لیے سپراگ اُسے اپنی محبت بھری نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔

ہیضے کی وبا پھیلی تو وہ بھی لپیٹ میں آ گئی۔ اسی وقت سے سپراگ خبط الحواس سا ہو گیا ہے۔ روزانہ گھنٹوں بیوی کی قبر کے پاس بیٹھا رہتا ہے۔"

میں نے ٹائیلر سے پوچھا کہ "مسز سپراگ کی موت سے پادری گبنز اور اُس کی بیوی کا کیا تعلق ہے؟"

ٹائیلر نے بتایا۔ "سپراگ کا کہنا ہے کہ اُسے ان دونوں میاں

بیوی نے قتل کیا ہے۔"

"مسٹر اور مسز گبنز یہاں پہلے سے رہتے تھے۔" ٹائیلر نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "ان کا گھر بہت کشادہ اور آرام دہ تھا۔ کئی نوکر تھے۔ پادری سپراگ قصبے میں آیا تو اس کے پاس قیام کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ گبنز نے از راہِ ہمدردی اُسے اپنے پاس ٹھیرا لیا۔

چھ ماہ بعد ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی۔ سپراگ اُن دنوں مذہبی فرائض کے سلسلے میں قصبے سے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ بیوی کی موت کے تین چار روز بعد واپس آیا تو اُسے اس سانحے کا علم ہوا۔ گھر خالی پڑا تھا۔ گبنز اور اُس کی بیوی بھی یہ قصبہ چھوڑ کر کہیں جا چکے تھے۔ وہ دونوں جاتے وقت یہ تحریر چھوڑ گئے تھے کہ اُنھوں نے مسز سپراگ کا ہر ممکن علاج کروایا لیکن افسوس وہ جانبر نہ ہو سکی۔ پھر اُنھوں نے اُسے دفنا دیا اور خود قصبے سے دُور چلے گئے۔ اُنھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ وبائی اثرات ختم ہونے کے بعد ہم واپس آ جائیں گے۔

اس صدمے سے سپراگ کی حالت اتنی بُری ہوگئی کہ وہ بستر سے لگ گیا۔ نوکروں نے اُس کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دیے۔ تقریباً دو ہفتے بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو سکا۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ گبنز اور اس کی بیوی کا جانی دشمن بن چکا ہے۔"

"لیکن ظاہر ہے کہ مسز سپراگ کو گبنز اور اُس کی بیوی نے تو ہیضے میں مبتلا نہیں کیا۔" میں نے بحث کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو صحیح ہے لیکن سپراگ کوئی دلیل ماننے کے لیے تیار نہیں ہے اور کسی حد تک میں سمجھتا ہوں اُس کا شُبہ صحیح ہے۔"

"کیوں؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"میرے دوست! قصبے والوں کا خیال ہے کہ سپراگ کی خوبصورت اور نوجوان بیوی کو کلہاڑی سے ہلاک کیا گیا ہے۔"

"اس کا ثبوت؟"

"کئی ہیں۔ پہلا تو یہ کہ پادری گبنز اور اُس کی بیوی واپس نہیں آئے اور کسی کو اُن کا نام و نشان تک نہیں معلوم اور اس کے علاوہ یہ کہ....." ٹائیلر نے پس منظر کی تشریح کی۔ "گبنز پچاس سال کا ایک زندہ دل آدمی تھا۔ بسیار خوری اور آرام دہ زندگی نے اُسے فربہ کر دیا تھا۔ باغبانی سے اُسے بہت لگاؤ تھا۔ اُس کی عادت تھی کہ خوب کھُل کر قہقہے لگاتا۔ سبھی لوگ اُس سے خوش تھے، لیکن اُس کی بیوی اس کے بالکل برعکس تھی۔ اتنی دُبلی پتلی کہ تنکے کا شُبہ ہو۔ تیکھے پتلے نقوش، ہونٹوں کی جگہ ایک لائن سی۔ آواز باریک اور چیختی ہوئی۔ اس کا مزاج بھی حاکمانہ تھا۔ وہ اپنے شوہر، نوکروں اور قصبے والوں پر بڑے دبدبے سے حکم چلاتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اُسے سال بھر میں ایک آدھ بار ہی ہنسی آتی ہوگی۔" ٹائیلر نے کہا۔

"بہرحال وہ ایک اچھی عورت تھی۔ ہر وقت سادہ لباس پہنتی۔ سیاہ یا سرمئی سادہ لبادے، سیاہ موٹے سادہ جوتے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اُس کے بال گہرے سُرخ تھے اور اُس کے گلے میں نیلے موتیوں کا ایک ہار پڑا رہتا تھا جو اُس کی ماں کی نشانی تھا۔ اسے گرد و غبار سے جنُون کی حد تک نفرت تھی۔ سپراگ اور اس کی بیوی اُن کے ہاں رہنے آئے تو چند روز بہت اچھی طرح گزرے لیکن دو تین ماہ بعد دونوں عورتوں میں جھگڑا ہونے لگا۔ سپراگ کی بیوی جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، بہت دلکش اور کمسن تھی۔ گبنز کی بیوی کو اُس سے حسد ہو گیا اور اُس نے اس بے چاری پر یہ الزام لگایا کہ وہ اُس کے شوہر پر ڈورے ڈال رہی ہے۔

"نوبت یہاں تک پہنچی کہ گبنز کی بیوی نے اُس سے گفتگو کرنا ترک کر دی۔ نوکروں کا بیان ہے کہ گبنز کی بیوی نے کئی بار سپراگ سے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو لے کر کہیں اور چلا جائے۔ سپراگ بے چارہ ابھی کسی دُوسرے گھر کی تلاش ہی میں تھا کہ اُسے قصبے سے باہر بھیج دیا گیا۔

"نوکروں کا بیان ہے کہ ایک صبح پادری گبنز باورچی خانے میں آیا اور اُس نے ایک نوکر سے ناشتہ اور ایک پتیلی میں کھولتا ہُوا پانی لانے کے لیے کہا۔ پانی سپراگ کی بیوی کے لیے درکار تھا کیونکہ اُس پر گزشتہ رات ہیضے کا حملہ ہُوا تھا۔ گبنز کے قول کے مطابق دونوں میاں بیوی نے رات بھر جاگ کر مسز سپراگ کی تیمارداری کی تھی۔ پادری نے نوکروں کو اُوپر آنے کی ممانعت کر دی تھی تاکہ وہ وبا سے بچے رہیں۔

"دوپہر کو پادری کھانا لینے کے لیے آیا۔ اُس نے بتایا کہ مسز سپراگ کی حالت نازک ہوگئی ہے۔ ایک نوکر کو اُس نے بیس میل دُور ایک دُوسرے گاؤں بھجوایا تاکہ وہ ڈاکٹر کو لے کر آئے۔ بعد میں ہم نے سوچا کہ یہ تو صریحاً فریب تھا کیونکہ گبنز کو معلوم تھا

کہ ڈاکٹر چوبیس گھنٹے سے پہلے نہیں آسکے گا۔"

میں نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا "لیکن تم تو کہہ رہے تھے کہ گبنز بہت اچھا آدمی ہے۔ پھر اُس نے قتل جیسے جُرم کا ارتکاب کیونکر کیا ہوگا؟"

"قتل اُس نے نہیں کیا۔" ٹائیلر سر ہلاتا ہوا بولا۔ "یہ اُس کی بیوی کی جادُوگری کا کمال تھا جو اُسے کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتی تھی۔ اُس نے شوہر کو قتل پر کیونکر آمادہ کیا۔ یہ تو کوئی ماہرِ نفسیات ہی بتا سکتا ہے۔ بہرحال جُرم کے بعد پردہ پوشی کے خیال سے تو شوہر کے لیے اُس کا ساتھ دینا ناگزیر تھا؟ ہم لوگوں نے طویل بحث کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اُس بدنصیب عورت کو رات کی تاریکی میں قتل کیا گیا ہوگا اور پھر دن بھر دونوں میاں بیوی اُس کی لاش پر پہرا دیتے رہے۔"

"رات کو گیارہ بجے کے قریب پادری نیچے آیا اور اُس نے نوکروں کو جگا کر یہ خبر سُنائی کہ سپراگ کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ایک نوکر کو خاصی رقم دے کر کفن والے کے پاس بھیجا گیا کہ تابوت لے کر آئے۔ جلدی جلدی قبر کھُدوائی گئی تاکہ اُسے فوراً دفن کیا جا سکے اور قصبے کے لوگ جراثیم سے محفوظ رہیں۔ تابوت آیا تو پادری خود اُسے اُٹھا کر اُوپر لے گیا اور تھوڑی دیر بعد اُس نے چار نوکروں کو بلوایا۔ تابوت کا ڈھکنا بند کر دیا گیا تھا ـــــ تابوت بیل گاڑی پر قبرستان لے جایا گیا اور فوراً ہی اسے قبر میں رکھ دیا گیا۔

"صبح ہونے سے دو گھنٹے پیشتر پادری نے دو رکشے منگوائے۔ ایک رکشا میں سامان لاد دیا گیا اور دُوسرے میں دونوں میاں بیوی بیٹھ گئے اور پھر انہیں کسی نے نہیں دیکھا۔

"کچھ عرصے بعد سپراگ کو ایک خط موصُول ہُوا جس میں پادری گبنز نے لکھا تھا کہ اب ہم دونوں میاں بیوی سنگ پنگ واپس نہیں آئیں گے کیونکہ تمہاری بیوی کی وبائی موت کی یاد ہی ہمارے لیے تکلیف دِہ ہے۔ اب ہم نے نئے سِرے سے زندگی کا آغاز کر دیا ہے۔ تم اگر چاہو تو ہمارا مکان اپنی تحویل میں لے سکتے ہو۔ خط پر کوئی پتہ درج نہیں تھا، البتہ مہر ہانگ کانگ کی تھی۔

"یہاں تک تو سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ افواہوں کا آغاز اُس وقت سے ہُوا جب ایک نوکر اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ لالٹین کی روشنی میں دیکھا گیا تو دیوار میں شگاف کے اندر سے خُون آلُود کلہاڑی باہر نکلی ہوئی نظر آئی۔ اسی شگاف سے ایک خون آلُود چادر بھی برآمد ہوئی۔"

"سپراگ کو بھی یہ بات معلوم ہے؟"

"نہیں!" ٹائیلر بولا۔ "قصبے میں سبھی کو اُس پر رحم آتا ہے ـــ یہ اندوہناک حقیقت بتانا اُسے موت کے منہ میں دھکیلنے کے مترادف ہے۔"

میں نے یہ تمام تفصیل اپنی ڈائری میں نوٹ کر لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس پر ایک بڑی خوبصورت کہانی لکھی جا سکتی ہے۔ حسد، نفرت، سُرخ بالوں اور نیلے نیکلس والی ایک قاتلہ، کلہاڑی اور جلد بازی میں کی گئی تدفین۔ غم زدہ پادری، جو ہر روز اپنی بیوی کی قبر پر بیٹھا دکھائی دیتا ہے لیکن اسے اپنی بیوی کی موت کے بارے میں چند تلخ حقائق کا علم نہیں ہے۔

سال بھر گزر گیا۔ کہانی کا انجام نہیں لکھا جا سکا۔

کل دوپہر مجھے اچانک ٹائیلر کا خط موصول ہُوا۔ خط بہت طویل تھا۔ آخری چند سطور کچھ اس طرح تھیں۔

"تم نے اخباروں میں سیلاب کی تباہ کاریوں کا حال تو پڑھا ہی ہو گا۔ ہمارے قصبے میں بھی پانچ افراد ہلاک ہو گئے۔ ان میں سے ایک غمزدہ سپراگ تھا۔ یقیناً تم اسے بھُولے نہیں ہو گے۔ وہ حسبِ معمُول قبرستان جانے کے لیے گھر سے نکلا اور بُری طرح بھیگ گیا۔ پھر نمونیا کا شکار ہو کر چل بسا۔

"اس کی موت اُس کے حق میں بڑی مفید ثابت ہوئی کیُونکہ سیلاب کی وجہ سے اُس کی کہانی میں ایک دردناک باب کا اضافہ ہو گیا ہے۔

"تمہیں یاد ہو گا کہ قبرستان دریا کے کنارے واقع ہے۔ دریائی پانی کے ریلے دو روز تک قبرستان میں بہتے رہے۔ جب پانی کا زور کم ہوا تو قبرستان کی شکل ہی بدل چکی تھی۔ بے شمار قبریں بہہ گئی تھیں۔"

انہی قبروں میں سپراگ کی بیوی کی قبر بھی تھی۔ تابوت باہر نکل آیا تھا اور پانی کے زور سے اُس کا ڈھکنا بھی کھُل گیا تھا۔"

"معلوم ہے اس تابوت میں کیا تھا ـــــــ سُرخ بال اور نیلے موتیوں کا ہار اور ...."

٭٭٭

مزدوروں اور انتظامیہ کے مسائل پر ایک دلچسپ تاثر :



سام فرالی

ترجمہ شہلا فرزانہ



اور میں گیس کے کارخانے میں جونیئر انجینئر تھے اس لیے ہمیں کلرکوں کا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ صدر دفتر سے تمام احکام لاکر ہماری وسیع د عریض میز پر ڈھیر کر دیئے جاتے تھے۔ اُس میز پر میں اور لیری آمنے سامنے بیٹھا کرتے تھے۔

ہمارا واسطہ براہِ راست میکسیکی مزدوروں سے پڑتا تھا، چونکہ ان کی تنخواہیں ہم ادا کرتے تھے اس لیے ہمارا نام خزانچی صاحب پڑ گیا تھا۔

کوئی شبہ نہیں کہ یہ میکسیکی مزدور بہت محنتی تھے۔ اُن میں بھٹّی جھونکنے والے مزدوروں کا تو جواب ہی نہیں تھا۔ یہ لوگ بھٹّی کی دوزخ جیسی گرمی میں ہرکولیس کی طرح مسلسل آٹھ گھنٹے کام کرتے۔ پھاوڑوں میں کوئلہ بھر کر دیکھے بغیر اچھالتے اور وہ سیدھا بھٹّی میں گرتا۔ ان باکمال مزدوروں کی تعداد بہت کم تھی۔

کمپنی کی طرف سے ملازمین کو مہینے میں دو بار تنخواہ دی جاتی تھی۔ ۵ تاریخ کو اور پھر ۲۰ تاریخ کو، لیکن مزدوروں کے لیے یہ بات ناقابلِ قبول تھی، کیونکہ وہاں یہ رواج تھا کہ جو شخص اپنے پیسے تین چار دن سے زیادہ رکھ لے گویا وہ کنجوس ترین شخص تھا۔ اور یہ بہت ذلّت کی بات تھی۔ چنانچہ مزدور ہر تیسرے چوتھے دن آتے اور جتنی مزدوری بنتی وہ لے جاتے۔

کمپنی کے قوانین سخت نہیں تھے، اس لیے مزدوروں کو آسانی سے پیشگی رقم دے دی جاتی تھی۔ یہ صورت حال دیکھ کر ایک روز صدر دفتر سے ایک یادداشت آئی "تنخواہوں کی پیشگی وصولیابی کا سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے، آیندہ سے ملازموں کو صرف ہنگامی ضروریات کے تحت پیشگی رقم دی جائے۔"

ظاہر ہے ہم کیا کرتے۔ ہم نے حکم کے مطابق یہ نوٹس چسپاں کروا دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد گارسیا نامی ایک مزدور پیشگی رقم مانگنے آیا۔ میں نے اُسے نوٹس پڑھنے کا اشارہ کیا۔ اُس نے اٹک اٹک کر نوٹس پڑھا اور پوچھنے لگا۔ "ہنگامی ضروریات کا کیا مطلب ہے جناب؟"

میں نے بڑی نرمی سے اُسے سمجھایا کہ "کمپنی اپنے ملازمین کی خیر خواہ ہے لیکن ہر دوسرے تیسرے دن تنخواہ لینا ایک بے قاعدگی ہے۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ آیندہ پیشگی تنخواہ صرف اُسی

صورت میں دی جائے گی جب کوئی ملازم یا اُس کے متعلقین میں
سے کوئی فرد بیمار ہو یا اُسے ایسی ہی کوئی دوسری شدید ضرورت
آپڑے۔"

گارسیا نے اپنا بڑا سا ہیٹ کئی بار اپنے ہاتھوں میں
گھمایا اور پوچھا" تو آج مجھے پیسے نہیں ملیں گے؟"

" نہیں۔ تھوڑا انتظار کرلو۔ پانچ تاریخ کو لے لینا۔"

وہ گردن جھکائے چلا گیا۔ مجھے دل ہی دل میں شرمندگی
سی ہونے لگی۔ میں نے لیری کی طرف دیکھا، وہ بھی نظر بچا گیا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر دو اور مزدور مینڈوزا اور
فرانسسکو آئے۔ انھیں بھی صورتِ حال سمجھا دی گئی اور وہ
بھی سر جھکائے چلے گئے پھر سناٹا چھا گیا۔ ہم اس بات سے
بے خبر تھے کہ باہر گارسیا، مینڈوزا اور فرانسسکو نے تمام
مزدوروں کو نوٹس کا مطلب سمجھا دیا ہے کہ "اب پیسے لینے کے
لیے بیوی وغیرہ کا بیمار ہونا ضروری ہے یا۔۔۔۔"

اگلے روز ہی ہمیں یہ اطلاع ملی کہ گارسیا کی بیوی بسترِ مرگ
پر ہے اور مینڈوزا کی ماں کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔ ایک
مزدور کے بچوں میں کوئی مُہلک وبائی مرض اچانک پھیل گیا ہے۔
پیشگی مانگنے کے جواز میں انفرادیت پیدا کرنے کے لیے ایک
مزدور کا بوڑھا باپ علیل کر دیا گیا۔ بوڑھے کی علالت کا واقعی ہمیں
یقین آگیا کیونکہ مزدوروں کی ذہانت سے اس انفرادیت کی اُمید
نہیں تھی۔ کچھ بھی ہو۔ بہر حال مجھے اور لیری کو یہ اختیار نہیں تھا
کہ ہم دوسروں کے ذاتی معاملات میں مداخلت کریں۔ ہم نے
تنخواہ کے کاغذات میں "ہنگامی ضرورت" کا اندراج کیا اور
مزدوروں کو تنخواہیں دے دیں۔

یہ سلسلہ کوئی ایک ہفتے تک چلتا رہا۔ پھر صدر دفتر
سے دوبارہ ایک سخت حکم آیا" ملازموں کو تنخواہ صرف ۵ اور
۲۰ تاریخ کو دی جائے البتہ اگر کوئی ملازم کمپنی سے استعفا دینا
چاہے تو اُس کا حساب اُسی وقت بیباق کیا جا سکتا ہے۔"

نوٹس چسپاں کر دیا گیا اور ہم نے بڑی سنجیدگی سے اُس کی
تشریح کی" ہمیں افسوس ہے گارسیا! تمھاری بیوی، تمھارے
بھائی بہن اور تمھارا پورا خاندان علیل ہے، یہ واقعی بہت پریشانی
اور تشویش کی بات ہے لیکن اب نیا حکم آگیا ہے۔ بتاؤ ہم
کیا کریں۔ اوپر سے حکم آیا ہے۔"

گارسیا باہر چلا گیا۔ پھر وہ، مینڈوزا، فرانسسکو اور آئیلا
کافی دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ دوسرے روز
گارسیا صبح صبح دفتر آیا" میں نوکری چھوڑ رہا ہوں جناب، میرا
حساب صاف کر دیجیے۔"

ہم نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ "یہ کمپنی بہت اچھی
ہے۔ اپنے ملازمین کا بہت خیال رکھتی ہے۔ تم کیوں ملازمت
چھوڑ رہے ہو؟" لیکن وہ نہ مانا۔ آخر ہمیں گارسیا کو پیسے دینے
پڑے۔ اُس نے نوکری چھوڑ دی تھی۔ اُس کے ساتھ ساتھ فرانسسکو،
مینڈوزا، آیریگون، آئیلا اور آرتز بھی کمپنی چھوڑ کر جا چکے تھے یہ
سب بہترین مزدور تھے اور ان کا متبادل کوئی نہیں تھا۔

میں نے لیری کی طرف دیکھا۔ وہ بھی سخت پریشان تھا۔
آنے والے تین دن ہمارے لیے بہت تکلیف دہ تھے کیونکہ ہمیں
نئے مزدور بھرتی کرنے تھے۔ بھرتی شروع ہوگئی۔ جو شخص بھی سامنے
آیا ہم نے اُسے رکھ لیا۔ لیکن نتیجہ ظاہر تھا۔ نئے لوگ دو چار
پھاوڑے چلانے کے بعد آدھے آدھے گھنٹے آرام کرنے لگتے
تھے۔ فورمین بھی پریشان تھا۔ آخر جب پانچویں دن گارسیا،
فرانسسکو، مینڈوزا اور ان کے تمام ساتھی دوبارہ بھرتی کے
لیے آئے تو ہم نے اُنھیں فوراً رکھ لیا۔

اب ہر روز ہمارے سامنے دو قطاریں آتیں، ایک استعفے
دینے والوں کی اور دوسری بھرتی ہونے والوں کی۔ کاغذی کارروائی
بہت پیچیدہ ہوتی جا رہی تھی۔ صدر دفتر میں صورتِ حال اور
بھی خراب تھی۔ بھرتی اور استعفے کی درخواستوں کا ایک تانتا
بندھا ہوا تھا۔ جس میں گارسیا کے استعفا دینے اور دوبارہ بھرتی
ہونے اور پھر استعفا دینے اور پھر بھرتی ہونے کا ایک طولانی قصّہ
درج تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ رجسٹر پر اندراج کرنے والا کلرک ذرا
سستی کر جاتا تو اُس کی میز پر گارسیا کے دو دو استعفے بیک وقت جمع
ہو جاتے۔ ہمارے فون کی گھنٹی بار بار بجتی اور ہمیں ہر بار خندہ پیشانی
سے وضاحت کرنی پڑتی کہ "جناب والا! اگر کوئی شخص نوکری چھوڑنی
چاہتا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اور کارخانے میں مزدوروں کی سخت
ضرورت ہے اس لیے ہم اُنھیں بھرتی کرنے کے لیے بھی مجبور
ہیں۔"

حکامِ بالا نے تنگ آ کر ایک اور حکم بھیج دیا۔ میں نے اُسے پڑھا اور بے اختیار سیٹی بجائی۔ لیری نے اُسے پڑھتے ہی کہا ”اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

نوٹس میں لکھا تھا ”آج کے بعد جو مزدور استعفا دے گا، اُسے تیس دن سے پہلے ملازم نہیں رکھا جائے گا۔“

گارسیا اپنا استعفا دینے کے لیے آیا تو ہم نے نوٹس بورڈ کی طرف اشارہ کر کے کہا ”تیس دن بہت ہوتے ہیں گارسیا۔“

یہ مسئلہ خاصا گمبھیر تھا۔ گارسیا نے اس پر غور کرنے کے لیے خاصا وقت لیا، اور میکسیکو، مینڈورا، آئیلا اور آرٹر نے بھی خوب سوچ بچار کیا۔ لیکن پھر نہ معلوم انھوں نے کیا ٹھان لی تھی کہ سب کے سب نوکری چھوڑ کر چل دیے۔ اس مرتبہ وہ ہم سے ہاتھ ملا کر گئے تھے۔ ظاہر ہے ہم نے بھی ان سے بچھڑنے پر بے حد افسوس کا اظہار کیا تھا۔ آخر صدر دفتر کو فتح ہو چکی تھی۔

دوسرے روز ابھی ہم نے آ کر میز سنبھالی ہی تھی کہ باہر ایک لمبی قطار نظر آئی۔ گارسیا اندر داخل ہوا اور بڑی سنجیدگی سے بولا ”میں ایک مزدور ہوں، مجھے ملازمت چاہیے۔“

”افسوس گارسیا! میں نے تمھیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ جاؤ اب ایک مہینے بعد آنا۔“

اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ ”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے جناب! میرا نام گارسیا نہیں ہے بلکہ مینول ہے اور اس سے پہلے میں پیوبلو اور سانتافی میں کام کرتا تھا۔“

میں اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ بیمار بیوی، وبا کے شکار بچے، اسپتال میں داخل بوڑھی ساس، استعفے، بھرتیاں اور اب نیا بہانا یعنی نام کی تبدیلی۔ مجھے معلوم تھا کہ پیوبلو میں بھی گیس کا ایک کارخانہ ہے مگر سانتافی میں اس قسم کا کوئی کارخانہ نہیں تھا لیکن مجھے کسی آدمی کے نام کے جھوٹے یا سچے ہونے سے کیا غرض۔ مزدور بہرحال مزدور ہوتا ہے۔

ہم نے اسے رکھ لیا۔ اُس کے ساتھ ہی ہم نے فرانسسکو کو بھی بھرتی کر لیا۔ اُس نے قسم کھا کر کہا تھا کہ اُس کا نام کیریرا ہے، اور آئیلا بڑی خوبصورتی سے اسمتھ بن گیا تھا۔

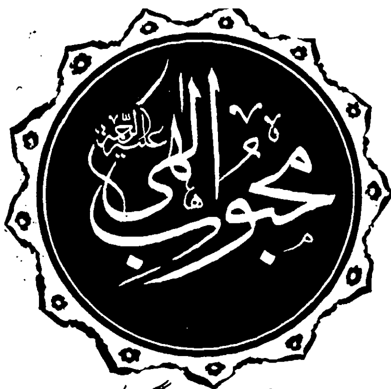
تین دن بعد پھر اُن کے مستعفی ہونے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر تنخواہ کے رجسٹر پر لاطینی امریکہ کی پوری تاریخ درج تھی یعنی آج تک لاطینی امریکہ میں آدمیوں کے جتنے بھی نام رکھے گئے تھے، وہ سب تنخواہ کے رجسٹر میں موجود تھے۔

جب میں اور لیری، جانے پہچانے چہرے دیکھتے دیکھتے اور اجنبی ناموں کا اندراج کرتے کرتے تھک گئے تو ہم نے صدر دفتر جا کر سارا مسئلہ سپرنٹنڈنٹ کے سامنے رکھ دیا۔ اُس نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا ”عجیب و غریب۔ یہ ڈراما تو بہت دلچسپ ہے۔“

دوسرے دن لیری، تمام مزدوروں کو خالی نوٹس بورڈ دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا ”دوستو، اس بار جب تم بھرتی ہونے آؤ تو اُن ناموں کے ساتھ آنا جو تمھیں سب سے زیادہ پسند ہیں۔ کیونکہ پھر وہی نام مستقل ہوں گے۔“

انھوں نے ہماری طرف دیکھا اور پھر نوٹس بورڈ کی طرف دیکھا اور اس تمام عرصے میں اُن کے چہرے پر پہلی مرتبہ مسکراہٹ نظر آئی۔

✱



محبوب الٰہی علیہ الرحمۃ

ضیا تسنیم بلگرامی



جمادی الاوّل کا آخری دن تھا، شام کو جمادی الآخر کا چاند تراشے ہوئے ناخن کی طرح مغرب میں نمودار ہُوا تو ایک ننھے مُنّے بچّے نے حسبِ دستور اُسے دیکھا اور سلام کرنے کے لیے دوڑا ہُوا اپنی بیمار ماں کے پاس پہنچا۔ ماں نے سلام کا جواب دیا اور پیار سے پاس بٹھا کر سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور حسرت سے پوچھا۔

"بیٹے اگلے مہینے کسے سلام کرو گے اور کس کی دُعائیں حاصل کرو گے؟"

سعادت مند بیٹا ماں کے سوال پر چونک پڑا اور سمجھ گیا کہ ماں نے یہ سوال کر کے بیٹے کو اپنی موت سے مطلع کر دیا ہے۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا "اماں جان! آپ ہمیں کس پر چھوڑ جائیں گی؟"

بیمار ماں نے قدرے تامل اختیار کیا، پھر جواب دیا "اس کا جواب صبح دُوں گی!"

صبح سویرے خادمہ نے لڑکے کو بیدار کر دیا اور اُسے بتایا کہ "فوراً چلو، ماں نے تمھیں یاد کیا ہے۔"

لڑکا دھڑکتے ہوئے دل سے ماں کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ ماں نے اُسے اپنے پاس بٹھا لیا اور محبّت سے پوچھا۔ "کہو رات کیسی گزری؟ خوش تو رہے" لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، پائنتی کھسک کر ماں کے قدموں میں سر رکھ دیا اور رقّت سے عرض کیا۔ "امّاں میری خوشی تو آپ کی سلامتی میں ہے"

ماں نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ "بیٹے رات تم نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا، میں نے کہا تھا کہ اس کا جواب صبح دُوں گی۔ اب صبح ہو چکی ہے، اپنے سوال کا جواب لے سکتے ہو۔" یہ کہہ کر اپنا ہاتھ، بیٹے کے ہاتھ میں دے دیا اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "خداوندا! میں اس دُکھیارے بیکس کو تیرے سپُرد کرتی ہوں۔" پھر آنکھیں بند ہو گئیں اور ماں کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

جس لڑکے کو ماں نے خدا کے سپرد کیا تھا۔ خدا نے اُسے واقعی اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ وہ لڑکا پڑھتا پڑھتا رہا اور یہاں تک پڑھ لکھ گیا کہ اپنے علوم کے عوض دربارِ سلطانی سے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا عہدہ حاصل کرنا چاہا۔ مختلف محفلوں میں جاتا اور علمائے عصر اور فضلائے دہر سے ایسی مدلل اور مسکت بحثیں کرتا کہ لوگ اس کے علم، حافظے اور طریقۂ استدلال کا لوہا مان لیتے اور آخر کار انہوں نے اس نوجوان کا نام رکھ دیا۔ "نظام الدین بحّاث۔"

یہ اس دور کی بات ہے جب ایک طرف ملتان میں شیخ بہاءالدین زکریا اور اجودھن میں بابا فرید گنج شکرؒ اپنے علوم رُوحانی اور کمالاتِ باطنی سے تبلیغ و تلقین کے فرائض اور خدمات انجام دے رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ پاک باطن حضرات کے خواب رویائے صادقہ ہوتے ہیں۔ ابھی خواجہ نظام الدین نے بابا فرید سے ملنے اور بیعت ہو جانے کا خیال تک نہ کیا تھا کہ بابا فریدؒ نے خواب میں دیکھا "انہوں نے چڑیوں کے شکار کے لیے ایک بہت بڑا جال لگا رکھا ہے، چڑیاں آتی ہیں اور اس میں پھنس جاتی ہیں۔ اس دوران ایک شاہباز نمودار ہوا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے جال میں پھنس گیا۔"

بابا فریدؒ کی آنکھ کھل گئی اور وہ سوتے جاگتے اس شاہباز کا انتظار کرنے لگے۔

ابو بکر نامی ——— ایک قوال ملتان اور اجودھن کے رُوحانی درباروں میں حاضری دے کر دہلی پہنچا، کسی سلسلے میں اسے خواجہ نظام الدّین کا قرب بھی حاصل ہُوا اور اس نے شیخ بہاءالدین زکریاؒ اور بابا فرید گنج شکرؒ کی بے انتہا تعریفیں کیں۔ یہ ذکر دل میں آتشِ اشتیاق لگا گیا اور یہ شاہباز اجودھن پہنچ کر بابا فریدؒ کے حلقۂ ارادت کا اسیر ہو گیا۔ اس وقت خواجہ نظام الدین کی عمر بیس سال کی تھی۔ کہتے ہیں کہ بابا فرید ہندوستان کی ولایت کسی اور کو دینا چاہتے تھے لیکن انھیں کسی طرح غیب سے یہ صریح ہدایت موصول ہو چکی تھی کہ "فرید! انتظار کرو، نظام بدایونی آ رہا ہے اور وہی اس ولایت کے لائق ہے۔" شیخ محی الدین ابن عربی کا خیال تھا کہ دُنیا کے ظاہری نظام کے ساتھ ساتھ ایک باطنی نظام بھی ہے اور یہ نظام قطبوں اور ابدالوں وغیرہ پر قائم ہے۔ دنیا کے سارے فیصلے پہلے انہی کے ہاں طے پاتے ہیں اس کے بعد ظاہری دُنیا غیر محسوس طور پر ان فیصلوں کی توثیق کر دیتی ہے۔ نظام الدّین نے ابن عربی کی کتابوں کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور وہ اس کے قائل تھے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی تارک الدنیا درویش کی طرح نہیں گزاری بلکہ شاہانِ عصر کے

مدِ مقابل بن کر رہے ، بابا فرید نے انھیں خلعتِ فاخرہ سے سرفراز فرمایا تو انھیں نظام الدین والدنیا، کہہ کر خطاب کیا تھا۔

جس زمانے میں حضرت نظام الدین، بابا فرید کی خدمت میں حاضر رہتے تھے تو ان کے ذمے کھانا پکانے کا کام کیا گیا۔ ایک دن نمک نہ ہونے کی وجہ سے حضرت نظام الدینؒ نے کسی سے نمک قرض لے کر کھانے میں شامل کر دیا۔ بابا فریدؒ نے کھانے کو دیکھتے ہی کہا "مجھے اس میں شبہ محسوس ہوتا ہے۔"

حضرت نظام الدین نے عرض کیا۔ "دیانت اور پاکی کا پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے پھر آپ اس میں کس قسم کا شبہ محسوس کرتے ہیں؟"

بابا فریدؒ نے فرمایا۔ "نظام! درویشوں کو چاہیے کہ وہ مر جائیں لیکن لذّتِ نفس کے لیے کسی سے قرض لے کر زیر بارِ احسان نہ ہوں کیونکہ توکل اور قرض میں بُعد المشرقین ہے!"

نظام الدین شرم و ندامت سے گڑ گئے اور پوری زندگی اس پر عمل پیرا رہے۔

بابا فرید کے بعد کسی اشارہ غیبی پر دہلی شہر سے دُور غیاث پور میں سکونت اختیار کرلی۔ یہی بستی بعد میں بستی نظام الدین اولیا کے نام سے مشہور ہوئی۔ شروع شروع میں غیاث پور میں بڑی پریشانی اٹھانی پڑی کئی کئی وقت فاقے میں گزر جاتے۔ ان کے پڑوس میں ایک بڑھیا رہتی تھی۔ یہ بڑھیا سارا دن بھر چرخا کاتتی رہتی تھی اسی پر اس کی روزی کا گزران تھا۔ حضرت نظام الدین کئی دن کے فاقوں سے تھے کہ یہ بڑھیا ڈیڑھ سیر جَو کا آٹا، ان کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئی اور کہا کہ اس حقیر کا یہ ہدیہ قبول فرمائیں۔ حضرت نظام الدینؒ نے اسے قبول کرلیا اور ہانڈی میں پانی ڈال کر اُسے جوش دینا شروع کر دیا۔ ابھی اس میں جوش بھی نہ آیا تھا کہ ایک فقیر آیا اور آتے ہی کرخت لہجے میں بولا "نظام الدین کچھ فقیروں کو کھلا!"

آپ نے فرمایا "ذرا صبر سے کام لو۔ ہانڈی میں جوش آلینے دو۔"

ضدی فقیر صبر پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے نظام الدین کو حکم دیا "نہیں جوش کی کوئی ضرورت نہیں، تو خود کھڑا ہو جا اور جیسا کچھ ہے میرے سامنے رکھ۔"

نظام الدین کھڑے ہو گئے اور اپنی ڈھیلی ڈھالی آستینوں کی مدد سے ہانڈی اُتار کر فقیر کے سامنے رکھ دی۔ اُس نے جلتی ہوئی ہانڈی میں ہاتھ ڈال دیا اور مزے لے لے کر کھانا شروع کر دیا۔ ہانڈی کی حدّت اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ کھا چکنے کے بعد اس نے ہانڈی کو اُٹھا کر زمین پر دے مارا، ہانڈی پھوٹ گئی فقیر نے اسی کرخت آواز میں کہا "نظام! تو نے باطنی نعمت تو فرید سے پائی ہے لیکن ہم نے تیرے فاقہ و افلاس کی ظاہری دیگ توڑ دی۔ اب تو دین وُ دنیا کی نعمتوں سے بہرہ یاب اور سلطان ہو چکا ہے۔"

فقیر تو یہ کہہ کر غائب ہو گیا لیکن اس کے بعد نظام الدین کی معاشی حالت میں ایک انقلاب آگیا۔ ہر روز ہزاروں خرچ ہوتے اور کمی نہ ہوتی۔ غربا کے لیے آپ کا در ہمیشہ کھلا رہتا تھا لیکن شاہانِ وقت حاضر نہ ہو سکتے تھے۔ آپ نے کئی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ علاؤالدین خلجی نے کئی بار باریابی کی اجازت طلب کی جو نہیں ملی۔ علاؤالدین خلجی نے ایک بار اپنے بڑے بیٹے خضر خان کو ایک خط دیا۔ یہ خط حضرت نظام الدینؒ کے نام تھا اور اس میں حاضری کی اجازت مانگی گئی تھی۔ خضر خان یہ خط لے کر جب آپ کے رو برو پہنچا تو انہوں نے کھولے اور پڑھے بغیر ہی حاضرین کو مخاطب کر کے کہا۔

"درویشوں کو بادشاہوں سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ میں درویش ہوں اور شہر کے باہر ایک گوشے میں دُنیا سے الگ تھلگ بادشاہ اور مسلمانوں کے لیے دُعا کرتا رہتا ہوں۔ اگر بادشاہ مجھے مجبور کرے گا تو میں یہ شہر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

علاءالدین خلجی نے اس جواب پر کہلایا۔ "ہم شیخ کی خدمت میں صرف حاضری کے خواستگار ہیں۔"

آپ نے جواب میں کہلا دیا "میں تیرے لیے غائبانہ دُعا کرتا رہتا ہوں اور غائبانہ دُعا میں بڑا اثر ہے۔"

لیکن بادشاہ حاضری پر مُصر رہا۔ آپ نے چڑ کر فرمایا "خلجی سے کہہ دو کہ فقیر کے مکان کے دو دروازے ہیں۔ وہ ایک دروازے سے داخل ہو گا فقیر دوسرے دروازے سے نکل جائے گا۔"

اسی طرح جب خلجی خاندان کو زوال آیا اور اس کی جگہ قطب الدین نے اقتدار سنبھالا تو اسے حضرت نظام الدین سے کد ہو گئی۔ وہ ایک دوسرے بزرگ شیخ زادہ جام کا مرید تھا اور حضرت نظام الدین اور شیخ زادہ جام میں ذرا اختلاف پایا جاتا تھا۔ قطب الدین نے اپنے پیر شیخ زادہ جام کی حمایت میں نظام الدین کو رُسوا کرنا چاہا۔ قطبُ الدین نے آپ کو حکم دیا کہ "چاند رات کو جملہ مشائخ ہمیں سلام کرنے حاضر ہوتے ہیں لیکن آپ نہیں آتے ---- اب آپ کی حاضری بھی لازمی قرار دی جا رہی ہے۔"

آپ نے اس سخت حکم کی بھی کوئی پروا نہ کی اور حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ قطب الدین نے غضب ناک ہو کر حکم دیا کہ "اگر شیخ نظام الدین آئندہ چاندرات کو حاضر نہ ہوں تو انھیں جبراً حاضر کیا جائے۔"

اس حکم نے نظام الدین کے مریدوں اور مخلصوں میں کھلبلی مچادی لیکن آپ کی زبان سے بس یہی ادا ہوتا رہا "وہ کچھ بھی ہو میں نہیں جاؤں گا۔"

چاندرات آئی اور شاہی ہرکارے حضرت نظام الدین کو لینے پہنچ گئے۔ آپ خانقاہ کی چھت پر چڑھ گئے اور بے چینی سے ٹہلنے لگے۔ زبان پر بار بار ایک شعر چڑھا ہوا تھا۔

اے روبہک چرا نہ نشستی بجائے خویش
با شیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

پھر لوگوں کو خبر ملی کہ قطب الدین اپنے چہیتے غلام خسرو خاں کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا۔

آپ کو ذخیرہ اندوزی سے نفرت تھی۔ ہزاروں روپے کا خرچ کہاں سے چلتا تھا کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ آخری وقت آپ نے اپنے خادم خاص اقبال سے دریافت کیا "گھر میں کچھ باقی تو نہیں ہے؟"

اس نے جواب دیا "نہیں اب کچھ بھی باقی نہیں رہا۔"

آپ نے مزید فرمایا "لیکن یہ سمجھ لے کہ اگر گھر میں کچھ موجود رہا تو قیامت کے دن اس کی ذمہ داری تیرے سر ہوگی۔"

خادم نے شرمندگی سے عرض کیا "وہ کچھ غلّہ درویشوں کی خوراک کے لیے محفوظ رکھا تھا اگر حکم ہو تو اسے بھی مستحقین میں تقسیم کر دیا جائے!"

آپ نے ناخوشی سے فرمایا "جو کچھ بھی موجود ہے اسے اسی وقت لٹا دو اور توشے خانے میں جھاڑو پھیر دو۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو شرمسار نہیں جانا چاہتا۔"

حکم کی پوری پوری تعمیل کر دی گئی۔

۲۷ صفر ۶۲۶ھ میں آپ پیدا ہوئے تھے اور ۱۸؍ ربیع الثانی ۷۲۵ھ میں بعمر ۸۹ سال رحلت فرمائی۔ تیمور جب ہندوستان آیا تو آپ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے گیا قبر کچّی تھی مشکلوں سے ملی۔ اس نے حکم دیا کہ قبر پختہ بنائی جائے چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی اور آج بھی جو پختہ مزار نظر آتا ہے یہ تیمور کے حکم پر پختہ بنا تھا۔

آپ کے مریدوں میں امیر خسرو، مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی اور

حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت بلالؓ میں کسی بات پر تلخ کلامی ہو گئی۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے بلالؓ سے فرطِ جوش میں کہا۔

"ابن السودا! کالی چمڑی والی حبش کے بیٹے تم مجھ سے الجھتے ہو؟"

حضرت بلالؓ وہاں تو کچھ نہ بولے، رسول اللہؐ سے شکایت کر دی۔

آنحضرتؐ نے غصّے میں ابوذرؓ سے کہا: "کیا تم نے بلالؓ کو اس کی ماں کا طعنہ دیا ہے گویا تم میں اب بھی کسی قدر جاہلیت باقی ہے۔"

ابوذرؓ جاہلیت سے مبنی بداخلاقی سمجھ بیٹھے چونکہ اس وقت وہ پیرانہ سالی میں تھے اس لیے جواب دیا: "کیا حضورؐ اس پیرانہ سالی میں؟"

رسول اللہؐ نے کہا "تمہیں معافی مانگنی چاہیے۔ بلالؓ تمہارے بھائی ہیں۔"

ابوذرؓ بہت پشیمان ہوئے۔ اظہار ندامت اور معافی طلبی میں بلالؓ کے سامنے دراز ہو گئے اور ان سے التجا کی "بلالؓ تمہیں حق پہنچتا ہے کہ تم میرے منہ کو اپنے پیروں تلے روند ڈالو۔"

میر حسن سنجری نے بڑی شہرت حاصل کی۔

آپ مسلمان ہونے کو ایک دشوار ترین کام سمجھتے تھے انھوں نے ایک موقع پر فرمایا۔

"لوگو! اسلام کا نام لے لینا تو بہت آسان ہے لیکن اس کے فرائض انجام دینا بہت مشکل ہے۔" پھر فرمایا "خواجہ بایزید بسطامیؒ ستر سال تک نفس کو مجاہدے سے مارتے رہے لوگوں نے اس شدید محنت کی وجہ دریافت کی تو آپ نے جواب دیا "چونکہ میں مسلمان ہوں اس لیے ضروری ہے کہ اپنے مسلمان ہونے کا حق بھی ادا کروں۔" اس کے بعد حضرت نظام الدین نے فرمایا کہ —

"ایک یہودی حضرت بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں بہت زیادہ حاضر رہتا تھا اور اسے ان سے بڑی محبت تھی۔ کسی نے یہودی سے دریافت کیا کہ اگر تجھے بایزید سے اتنی ہی محبت ہے تو مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا؟"

یہودی نے عام مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "اگر اسی کا نام اسلام ہے تو مجھے مسلمان ہوتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے اور اگر اسلام وہ ہے جو مجھے بایزید بسطامی میں نظر آتا ہے تو وہ اتنا دشوار ترین کام ہے کہ میری ہمت اور استطاعت کے باہر ہے۔"

کسی مجلس میں حضرت خواجہ جنید بغدادی کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"کسی نے حضرت جنید کو خواب میں دیکھا اور دریافت کیا "حضرت! منکیر اور نکیر سے کس طرح نجات ملی؟"

حضرت جنید نے فرمایا "جب میرے پاس یہ دونوں تشریف لائے اور انھوں نے مجھ سے سوال کیا کہ مَنْ رَبُّكَ (تمہارا رب کون ہے؟) تو میں ہنسا اور جواب میں کہا کہ جس دن خدا نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ تو میں نے اسی دن جواب میں بَلٰی کہہ دیا تھا۔ اب تم دونوں مجھ سے یہ سوال کر رہے ہو کہ تمہارا ربّ کون ہے؟ اب تم خود ہی سوچو کہ جس نے بادشاہ کو جواب دے دیا ہو، اس کو غلام کے سوال و جواب سے کیا اندیشہ ہو سکتا ہے۔"

ایک مجلس میں آپ نے آثارِ قیامت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"لوگو! رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ آخری زمانے میں عالم تو بہت ہوں گے لیکن بے عمل۔ برکت تھوڑی ہو گی۔ حاجتمندوں کو بیت المال سے کچھ بھی نہ ملے گا۔ گانے والے مطرب اور مسخرے اور اہلِ فساد دنیا والوں کی نظروں میں زیادہ عزیز ہوں گے اور قرآن خوانوں اور عالموں کی قدر نہ ہو گی۔ مرد رنگین کپڑے پہنیں گے اور لڑکے عورتوں کی طرح بناؤ سنگھار کریں گے۔ حاکم حکم بیچیں گے، عدل و انصاف اُٹھ جائے گا۔ سوداگر خرید فروخت میں جھوٹ بولیں گے، بے گناہ مسلمان قتل کیے جائیں گے اور دنیا کے مال کے لیے مسلمان مسلمانوں پر تلواریں کھینچیں گے، اسلام خوار ہو گا۔ اس زمانے میں جو فتنہ بھی پیدا ہو گا۔ علما اور بے عمل ریاکار مشائخ سے پیدا ہو گا۔ ہر ولایت اور شہر میں بادشاہ اُٹھیں گے اور ان کی وجہ سے اسلام مسلمان اور ان کے شہر ویران ہو جائیں گے، دوست دشمنی اختیار کریں گے، مسلمان مفلس ہو جائیں گے اور کمینوں کے سوا کوئی مالدار نہ ہو گا۔ عورتیں ایک خاوند پر قناعت نہ کریں گی۔"

کسی نے حضرت نظام الدینؒ سے دریافت کیا "عاقل کون ہے؟"

جواب دیا "جو شر اور خیر میں تمیز کرے۔"

ایک مجلس میں کسی نے دریافت کیا "کوئی شریف پارسائی اختیار کرے تو اس میں کیا کیفیت پیدا ہو جاتی ہے؟"

آپ نے ارشاد فرمایا "جب شریف پارسائی اختیار کرتا ہے تو اس سے انکسار اور تواضع ظاہر ہو جاتا ہے۔"

پوچھنے والے نے مزید پوچھا "اور اگر کوئی سفیہہ و کمین پارسائی اختیار کرے تو؟"

آپ نے جواب دیا "تو اس میں تکبر پیدا ہو جائے گا۔" پھر قدرے تامل کے بعد فرمایا "وہ آخر زمانے میں قوم کے سردار ایسے لوگ ہوں گے، جنھیں نہ خدا کا ڈر ہو گا نہ رسول کا پاس۔ ہمیشہ مسلمانوں کو ہاتھ اور زبان سے آزار پہنچائیں گے اور ہر وقت ان کی ایذا کے درپے رہیں گے۔"

جو لوگ کسی شخص کی دولت اور سرمائے کی وجہ سے عزّت اور تعظیم کرتے ہیں۔ آپ ان سے نفرت کی تلقین کرتے ہیں۔ ایک موقع پر فرمایا کہ "جو شخص کسی دُنیادار کی تعظیم اس کی دولت اور سرمائے کی وجہ سے کرتا ہے اس کا تہائی ایمان اس فعل سے جاتا رہتا ہے۔"

ایک مجلس میں منصور حلاج کا ذکر ہو رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ "منصور کو خدا نے اپنے ایک راز سے آگاہ کر دیا تھا وہ اسے چھپا نہیں سکا۔ لوگوں پر ظاہر کر دیا۔ اس کی اسے سزا ملی۔ بادشاہ کے کسی راز کو فاش کرنے کی یہی سزا ہوتی ہے کہ اسے ہلاک کر دیا جائے۔ منصور تو ایسا دیوانہ تھا جو ایک ہی گھونٹ میں مست اور بے خود ہو گیا اور بالآخر مارا گیا۔"

آپ نے شادی نہیں کی۔ زندگی بھر مجرد رہے۔ اس سلسلے میں ایک عجیب واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ اجودھن میں بابا فرید کی خدمت میں حاضری کے دوران ایک دن حضرت نظام الدینؒ دست بستہ کھڑے ہو کر انھیں کھانا کھلا رہے تھے۔ آپ کا پائجامہ پھٹا ہوا تھا۔ بابا فریدؒ کی اس پر جو نظر پڑی تو کھانے کے بعد اپنا پائجامہ انھیں عنایت فرما دیا۔ آپ نے اسے اسی وقت پہن لیا۔ بابا فریدؒ کے رُعبِ احترام میں ازار بند پر توجہ نہ دے سکے، وہ لٹکتا رہ گیا۔ بابا فریدؒ نے اسے دیکھ کر فرمایا "ازار بند پر نگاہ رکھ اور اسے مضبوط باندھ۔"

آپ نے فرمایا "ان شاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔"

اور زندگی بھر شادی نہیں کی۔

شیخ محمد اکرم صاحب نے حضرت نظام الدین کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ۔

"کہ وہ اپنی علمی قابلیت، خداداد سمجھ، وجیہہ شخصیت اور مذاقِ سلیم کی بنا پر اگر سلطان المشائخ (حضرت نظام الدینؒ) روحانی اثر سے نکل کر کسی اور سمت قدم بڑھاتے، تب بھی وہ میرِ کارواں ہی ہوتے۔"




ایک ہی نشست میں
پڑھی جانے والی تاثرخیز اور دردانگیز کہانی
مطربہ
کی آزمائش
اطہر ندیم



دِلکش نوجوان فلیٹ ۱/۲ کے سامنے پہنچ کر رُک گیا۔ سامنے اطلاعی گھنٹی کا بٹن لگا ہوا تھا۔ اس نے بٹن دبایا اور کان لگا کر سننے لگا۔ اندر سے پیانو کی آواز آ رہی تھی۔ لِزٹ کی مشہور دُھن اسٹڈی اِن ڈی فلیٹ پیانو پر بجائی جا رہی تھی۔ نوجوان نے چند لمحے انتظار کیا جب کوئی جواب نہیں ملا تو اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہوئیں۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بٹن دبایا اور کچھ دیر تک دبائے رہا۔ گھنٹی کی تیز آواز اندر گونجتی ہوئی سُنائی دے رہی تھی۔ اچانک پیانو کی موسیقی بند ہو گئی۔ نوجوان نے ایک عورت کو کچھ پکارتے سُنا۔ چند لمحے اور گزر گئے۔ اس نے تیسری بار گھنٹی بجائی۔ وہ دروازوں کے باہر اس طرح انتظار کرنے کا عادی نہیں تھا۔ اور آخر جب ملازمہ نے دروازہ کھولا تو وہ کچھ کہے بغیر غصّے میں اسے ہاتھ سے ایک طرف ہٹاتا ہوا اندر ہال میں داخل ہو گیا۔

"وہ کس کمرے میں ہے؟" اس نے ملازمہ کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"دائیں ہاتھ کے پہلے کمرے میں۔"

نوجوان نے اپنا ہیٹ اور دستانے اُتار کر ملازمہ کی طرف اُچھال دیے اور کمرے کی طرف چلا ہی تھا کہ دروازہ کھُلا اور ایک عورت باہر نکلی۔ اس کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو رہا تھا۔

"میں نے گریٹل سے کہہ دیا تھا کہ مجھے پریشان نہ کیا جائے" وہ تیزی سے بولی "پھر بھی تم ——"

"میں اس مداخلت کے لیے معذرت خواہ ہوں مادام فریا لیکن ——"

"میں کسی سے نہیں مل سکتی" مادام فریا نے بات کاٹتے ہوئے کہا "اگر تم کوئی رپورٹر ہو تو آج شام محفلِ موسیقی کے بعد آنا۔ میں اس وقت مشق کر رہی ہوں۔"

"میں پہلے ہی معذرت کر چکا ہوں مادام" نوجوان نے مضبوط لہجے میں جواب دیا "لیکن میرا آنا ضروری تھا۔"

"ضروری تھا؟" مادام فریا نے تلخ لہجے میں دُہرایا "میں پوچھتی ہوں تم ہو کون؟"

"میرا نام اسٹرینک ہے اور مَیں خفیہ پولیس سے تعلق رکھتا ہوں۔"

مادام فریا کا غصّہ اچانک غائب ہو گیا۔ اس نے کچھ حیرت سے اسٹرینک کی طرف دیکھا۔

"خفیہ پولیس" وہ آہستہ سے بولی "مگر آپ مجھ سے کیوں مِلنا چاہتے تھے؟"

اسٹرینک نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ مادام فریا گھُوم کر اپنے کمرے کی طرف چلی۔ اسٹرینک اس کے پیچھے تھا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہیں مادام فریا پیانو پر مشق کر رہی تھی۔ اسٹرینک نے دروازہ بند کر دیا۔

مادام فریا اب بھی اسے تعجب سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ پیانو نواز تھی۔ حسن و شہرت نے اسے کافی مغرور بنا دیا تھا۔ وہ اب تک مَردوں کی صرف ناز بَرداری کی عادی رہی تھی۔ اس لیے اسٹرینک کا تحکمانہ انداز اسے پسند نہیں آیا تھا۔

اسٹرینک نے بڑے غیر جذباتی انداز میں اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ بے شک وہ حسین تھی، جوان تھی، دِل کش بدن کی مالک تھی۔ مگر اسٹرینک ان میں سے کسی چیز سے متاثر نہیں ہوا تھا۔ اسٹرینک نے دیکھا کہ وہ کسی قدر غصّے میں بھی ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ مزید کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے مادام کے پُرسکون ہونے کا انتظار کرے یا فوراً کام کی بات شروع کر دے۔ آخر اس نے وقت ضائع نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

"مادام — اپنا پاسپورٹ دکھائیے۔" اس نے کہا۔

مادام فریا کی پیشانی ایک بار پھر شکن آلُود ہو گئی۔

"یہ بہت ناقابلِ برداشت ہے" وہ پیر پٹخ کر بولی "مجھے تمھارے دارالحکومت شہر میں آئے ہوئے ابھی صرف تین دن گزرے ہیں مگر کم سے کم ایک درجن مرتبہ میرا پاسپورٹ دیکھا جا چکا ہے۔"

"آپ بھُول رہی ہیں کہ ہم اس وقت جنگ کی حالت میں ہیں۔"

"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مجھے بار بار پریشان کیا جائے۔" مادام فریا نے غصّے سے کہا "میں یہاں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے آئی ہوں اور آپ لوگ اس طرح پیش آ رہے ہیں جیسے میں کوئی عادی مجرم ہوں جس سے بار بار نیک چلنی کی ضمانت طلب کی جاتی ہے۔"

"آپ کچھ بھی کہیں، مگر ہمارے نقطۂ نظر سے یہ ضروری ہے کہ تمام غیر ملکیوں......"

"اچھی بات ہے" مادام فریا نے ایک بار پھر اسٹرینک کی بات پُوری نہ ہونے دی "یہ لیجیے، دیکھ لیجیے۔ یہ رہا میرا خصوصی پرمٹ اور یہ ہے

میرا پاسپورٹ"۔

"آپ کا پاسپورٹ انجمنِ اقوام کی طرف سے جاری ہوا ہے" اسٹرینک نے پاسپورٹ دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مجھے دوبارہ اس کی وجہ بتانی پڑے گی؟"

"جی نہیں۔ جہاں تک آپ کے دوسرے کاغذات کا تعلق ہے وہ درست ہیں لیکن یہ پاسپورٹ ہمارے پاس رہے گا۔"

"کیوں؟" مادام فریا نے تقریباً چیخ کر پوچھا۔

"تاکہ سینٹرل بیورو میں اس کی جانچ پڑتال کی جا سکے۔"

"آپ کو میرا پاسپورٹ لے جانے کا کوئی حق نہیں ہے" مادام فریا نے جھنجلا کر کہا "اگر یہ کہیں گم ہو گیا یا غلط ہاتھوں میں پڑ گیا تو......"

"ایسا تو مشکل ہی سے کبھی ہوتا ہے مادام۔"

"لیکن ہوتا ضرور ہے، پھر بتایئے کہ میں اپنے پاسپورٹ کے بغیر....."

"آپ کو خواہ مخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"واہ پریشان ہونے کی ضرورت کیسے نہیں ہے" مادام فریا اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی "گزشتہ سال روم میں بھی یہی ہوا تھا۔ میرا پاسپورٹ دفتر میں کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا تھا، پھر مجھے اس وقت تک روم سے جانے کی اجازت نہیں ملی جب تک پاسپورٹ مل نہیں گیا۔ اس گڑبڑ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اپنے تین پروگرام ملتوی کرنے پڑے۔"

"یہاں ایسا نہیں ہوگا۔" اسٹرینک نے یقین دلایا۔

"اچھا۔ آپ پاسپورٹ واپس کب کریں گے؟" مادام فریا نے پوچھا۔ "میں کل دوپہر کی ٹرین سے جا رہی ہوں۔"

"کہاں؟"

"اسٹاک ہام۔"

"آپ کے اتنے جلدی جانے کا ہمیں افسوس رہے گا مادام۔ اب ایسی بھی جلدی کیا۔"

"مگر مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔"

"معلوم ہوتا ہے ہمارا شہر مادام کو پسند نہیں آیا" اسٹرینک مسکرایا "شاید جنگ کی وجہ سے۔"

"جنگ ہو یا امن۔ مجھے یہ شہر ایک قید خانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں تو سانس لینے کے لیے بھی اجازت درکار ہوتی ہے۔"

"ظاہر ہے کہ جنگ کی حالت میں بہت سی پابندیاں مجبوراً عائد کرنا پڑتی ہیں۔"

"مجھے آپ کی لڑائی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں ایک فن کار ہوں بس۔"

"آپ کا اپنا کوئی وطن نہیں ہے اسی لیے آپ وطن کی محبت کے جذبے سے ناآشنا ہیں۔"

"آپ میری توہین کر رہے ہیں جناب!" مادام نے متنبہ کیا۔

"نہیں مادام میں حقیقت بیان کر رہا ہوں" اسٹرینک نے جواب دیا "آپ کے والد اسپین کے رہنے والے تھے۔ ماں روسی تھیں اور خود آپ کی پیدائش برلن میں ہوئی۔ آپ کا پاسپورٹ بھی کسی ایک ملک کا نہیں ہے بلکہ انجمنِ اقوام کا جاری کیا ہوا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔"

"بلاشبہ۔ یہ سب تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"میں آپ کی سیکرٹ سروس کو مبارک باد دیتی ہوں۔" مادام فریا کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"یہ کوئی مذاق کی بات نہیں ہے مادام۔"

مادام فریا نے زور سے قہقہہ لگایا "اس شہر میں تھوڑا سا ہنسی مذاق زندگی کو آسان بنا سکتا ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ پھر بھول رہی ہیں کہ یہ جنگ کا زمانہ ہے" اسٹرینک نے اس طرح جواب دیا جیسے وہ کوئی رٹا ہوا سبق دہرا رہا ہو "اور یہ جنگ ہم نے خود نہیں چاہی تھی، ہم پر مسلط کی گئی ہے۔ ہمارے لیڈر نے امن قائم رکھنے کی بھرپور......"

"میں جناب سے جنگ اور امن کے موضوع پر کوئی تقریر سننا نہیں چاہتی" مادام فریا نے بات کاٹی "آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے آج شام آٹھ بجے اسٹیج پر جانا ہے اور ابھی......"

"ایک مرتبہ مجھے بھی آپ کے فن سے لطف اندوز ہونے کی سعادت حاصل ہو چکی ہے۔"

"اچھا ــ کہاں؟"

"ایمسٹرڈم میں۔ یہ گزشتہ اکتوبر کی بات ہے۔ واقعی خوب پیانو بجاتی ہیں آپ۔ کمال کرتی ہیں آپ تو۔"

مادام فریا کو ایک مرتبہ پھر ہنسی آگئی۔ وہ اپنی خفگی بھول کر آپ سے تم پر اُتر آئی ـــــ "تم بھی عجیب لوگ ہو" اس نے شوخ لہجے میں کہا "ایک طرف تو تم وقت بے وقت پاسپورٹ چیک کرنے کے بہانے مجھے پریشان کرنے سے باز نہیں آتے اور دُوسری طرف مجھے داد دیتے ہو کہ میں پیانو بہت اچھا بجاتی ہوں۔"

"انسان کے ذاتی جذبات و احساسات اور اس کے قومی یا منصبی فرائض دو مختلف چیزیں ہوتی ہیں۔"

"بہرحال تم کم سے کم اتنا خیال تو رکھو گے تاکہ میرا پاسپورٹ غیر ضروری تاخیر کے بغیر مل جائے۔"

"امید تو یہی ہے۔" اسٹرینک نے جواب دیا۔

مادام فریا کی مُسکراہٹ غائب ہوگئی۔ "امید سے تمھارا کیا مطلب ہے؟" وہ تیزی سے بولی "میرا خیال تھا کہ تم لوگ کچھ زیادہ فرض شناس ثابت ہوگے۔"

"ہم اپنا فرض پہچانتے ہیں۔ مگر جیسا کہ خود آپ نے کہا ہے پاسپورٹ اِدھر اُدھر بھی ہوسکتے ہیں۔"

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

اسٹرینک کے چہرے پر اُکتاہٹ ظاہر ہوئی۔ اب وہ بھی مادام کو آپ کہنے کے بجائے تم کہنے لگا۔ "باتیں بہت ہوچکیں" اس نے کچھ درشت لہجے میں کہا "یہ بتاؤ کہ میجر برسکا تم سے ملنے کب آئے گا؟"

مادام بھونچکی رہ گئی۔ یہ سوال اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا "تم ..... میجر برسکا کے متعلق کیا جانتے ہو؟"

"کیا وہ آج تمھارے پروگرام کے بعد تم سے ملنے کے لیے آنے والا ہے؟" اسٹرینک نے مادام کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔"

"کس وقت؟"

مادام فریا کی آنکھوں میں غصے کی چمک دوبارہ عود کر آئی۔ "تمھیں میری ذاتی زندگی کے بارے میں اس طرح کے سوالات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"میرے سوال کا جواب دو۔" اسٹرینک مرعوب ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔

"تمھیں سمجھنا چاہیے مسٹر اسٹرینک کہ میجر برسکا میرا بہت پرانا دوست ہے مجھے اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ اُس سے میرے مراسم خصوصی ہیں۔"

"اور وہ جنرل ملہٹین کے اسٹاف کے ایک ممبر بھی ہیں۔" اسٹرینک جھکتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اچھا؟" مادام فریا نے بڑی حیرت سے کہا "مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔"

"پھر بھی تم کہتی ہو کہ وہ تمھارے پرانے دوست ہیں۔"

"بے شک مجھے معلوم تھا کہ وہ اسٹاف ممبر ہے لیکن اس کے علاوہ اور کچھ جاننے کی میں نے کبھی ضرورت محسوس نہیں کی مزید یہ کہ اگر میں جاننا چاہتی بھی تو نہیں جان سکتی تھی۔ یہاں اس سے میری مُلاقات ......"

"۳ اگست کے بعد ہوئی ہے" اسٹرینک فقرہ مکمل کرتا ہوا بولا "اور اُس وقت تم دونوں کا پیرس کے کریلان ہوٹل میں قیام تھا۔"

مادام فریا بہت غصے میں نظر آرہی تھی۔ اسٹرینک نے دل چسپی سے دیکھا کہ اس کی مٹھیاں بھینچ گئی ہیں اور وہ بڑی جوشیلی اور کینہ پرور عورت معلوم ہو رہی ہے۔ اس نے سوچا کہ ضرورت پڑی تو اسے دو تین تھپڑ مار کر لطف ہی آئے گا۔

"تمھیں ہماری جاسوسی کرنے کی ہمت کیسے ہوئی؟"

"خفیہ پولیس اسٹاف میجروں کے دوستوں کے بارے میں جاننا اپنا فرض سمجھتی ہے۔"

"تم بڑی گستاخی سے پیش آرہے ہو میں اس قسم کی باتوں کی عادی نہیں ـــــ"

"میں نے صرف تمھارے سوال کا جواب دیا ہے" اسٹرینک نے کہا۔ "اب تم میرے سوال کا جواب دو۔ میجر برسکا یہاں کس وقت آئے گا؟"

"ساڑھے گیارہ بجے" مادام فریا نے شانے اُچکا کر مجبوراً بتایا۔

"اسی فلیٹ میں؟"

"ہاں۔ کیا میں پوچھ سکتی ......"

"نہیں" اسٹرینک نے سخت لہجے میں کہا "اب تم کوئی سوال نہیں کروگی۔ بہتر یہ ہے کہ میں تمھیں کچھ باتیں بتا دوں تاکہ تم میری ہدایات اچھی طرح سمجھ کر ان پر عمل کرسکو۔"

"تمھاری ہدایات؟" مادام فریا چونکی۔

"ہاں۔ جن پر تمھیں بہرحال عمل کرنا ہے" اسٹرینک نے کہا "کیوں کہ غالباً تم یہ بات پسند نہیں کروگی کہ اس شہر سے تمھاری روانگی میں غیر معمولی تاخیر ہوجائے۔"

مادام فریا نے ایک کھوکھلا قہقہہ لگایا جو اسٹرینک کے نزدیک اُس

بات کی علامت تھی کہ اب وہ کچھ خوفزدہ ہوتی جارہی ہے۔
"تم وعدہ کرتے ہو کہ پھر کوئی تاخیر نہیں ہوگی؟" اس نے پوچھا۔
"اُمید تو یہی ہے" اسٹرینک نے سرسری لہجے میں جواب دیا "اگر تم نے تعاون کیا تو ہم بھی کوشش کریں گے کہ تمھارے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو اور تم اپنے پروگرام کے مطابق کل اسٹاک ہام روانہ ہو سکو۔"
"آخر تم چاہتے کیا ہو؟" مادام اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔
اسٹرینک نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ توقع کے خلاف مادام سے نبٹنا کچھ زیادہ مشکل ثابت نہیں ہو رہا تھا۔
"اس سے قبل کہ کچھ بتاؤں، میں چند سوالات اور کرنا چاہتا ہوں" وہ بولا "یہ گراؤنڈ فلور کا ایک آراستہ فلیٹ ہے — یہ تم نے کرائے پر لیا ہے؟"
"ہاں۔ میں نے کرائے پر لیا ہے یا یوں سمجھو کہ میرے ایجنٹ نے لیا ہے"
مادام فریا نے جواب دیا "زیادہ سے زیادہ دو ہفتوں کے لیے۔"
"اس کے دروازے پر حرف 'اے' ڈالا گیا ہے؟"
"ہاں۔"
"گراؤنڈ فلور پر اس کے علاوہ تین فلیٹ اور بھی ہیں۔ بی، سی اور ڈی۔"
"ہاں۔"
"تمھیں معلوم ہے کہ ان تین فلیٹوں میں کون کون مقیم ہے؟"
"نہیں۔"
"میری بات پوری توجہ سے سنو" اسٹرینک قریب آیا اور سیدھے ہاتھ کی انگلی مادام کی طرف اُٹھا کر بولا "فلیٹ بی میں قدیم شرفا سے تعلق رکھنے والا ایک شخص ٹھیرا ہوا ہے۔ اسے ہمارے لیڈر کی خوشنودی حاصل ہے۔ میں لیڈر کا نام بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔ فلیٹ سی ایک خاتون کے پاس ہے جو فرالین ریناٹے کے نام سے مشہور ہے۔ اور فلیٹ ڈی میں ہماری پارٹی کی ایک اہم سیاسی شخصیت مقیم ہے۔"
"یہ سب باتیں مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"
"خاموشی سے سنو" اسٹرینک نے مادام کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا "ہمیں یقین ہے کہ آج رات میجر برسکا تمھارے پاس آنے سے پہلے فلیٹ بی یا ڈی میں سے کسی ایک میں ضرور جائے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر وہ فلیٹ ڈی میں گیا تو اس سے اس کی غدّاری ثابت ہو جائے گی۔



"اوہ، جارج! کتنی مرتبہ کہا ہے کہ ہاتھ ہلا ہلا کے باتیں نہ کیا کرو۔"

یہ باتیں تمھیں اس لیے بتائی جارہی ہیں کہ ان سے خود تمھاری سلامتی وابستہ ہے۔ ہمیں شبہ ہے کہ میجر برسکا فوجی نوعیت کی اہم معلومات فروخت کر رہا ہے، اور وہ غدّار فلیٹ ڈی میں ٹھیرا ہوا ہے جو یہ معلومات دشمن تک پہنچانے کے لیے خرید رہا ہے۔"
"ناممکن" مادام فریا نے تیزی سے کہا "میں نہیں مانتی کہ میجر برسکا جیسا شخص فوجی راز فروخت کر رہا ہے۔ آخر تمھارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے؟"
"اس بات کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے مادام۔"
"تعلق کیسے نہیں ہے؟" مادام فریا نے زور دے کر کہا "تم کہتے ہو کہ تمھیں میرے تعاون کی ضرورت ہے۔ میجر برسکا ایک شریف اور باعزت آدمی ہے۔ وہ اپنے ملک سے غدّاری نہیں کر سکتا۔ آخر اسے ایسا کرنے کی ضرورت کیا ہے؟"
"بڑے سے بڑے شریف آدمی کی وفاداری دولت سے خریدی جا سکتی ہے۔"
"واہیات۔ میجر برسکا خود ایک دولت مند شخص ہے۔ اسے لالچ نہیں دیا جا سکتا۔"
"تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ دولت مند ہے؟"
"اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ فیاضی سے روپیہ خرچ نہیں کر سکتا تھا۔"
"اس کی شاہ خرچی ہی نے تو اسے غدّاری پر آمادہ کیا ہے" اسٹرینک نے خشک لہجے میں کہا "تم نے جو یہ نیکلس اور آویزے پہن رکھے ہیں یہ اسی نے تمھیں دیے ہیں۔ اور ایک اسٹاف افسر کی تنخواہ بہر حال محدود ہوتی ہے۔ وہ جب اتنے قیمتی تحائف دینے لگتا ہے تو......"

"محدود تنخواہ؟" مادام فریا نے ایک طنزیہ مسکراہٹ سے بات کاٹ دی "یہ کیا مذاق ہے، میجر نے خود مجھے بتایا ہے کہ اس کے پاس بہت دولت ہے اور تم کیوں نہیں سمجھتے کہ میں اسے قریب سے جانتی ہوں۔"

"اس نے جھوٹ بتایا ہے" اسٹرینک نے کہا "ہم اس کی مالی حیثیت سے واقف ہیں ہمیں اس کی آمدنی بھی معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ جُوا بھی کھیلتا ہے — اور ایک بڑی فن کارہ کو قیمتی تحفے بھی پیش کرتا ہے۔"

"اس کے باوجود میں یقین نہیں کر سکتی کہ میجر غدار ہے۔"

"یقین کرو یا نہ کرو۔ ہمارے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے مادام۔ مکمل ثبوت ہمیں آج رات مل جائے گا۔ میجر برسکا ہیڈ کوارٹر سے خصوصی رخصت لے کر تم سے ملنے یہاں آیا ہے۔ اس کے پاس بعض خاص فوجی احکام کی نقلیں ہیں۔ اس کا مسلسل تعاقب ہو رہا ہے اور نگرانی کی جا رہی ہے۔ اُمید نہیں ہے کہ یہاں پہنچنے سے پہلے وہ کاغذات کسی کو دینے کی کوشش کرے گا۔ ہمارا خیال ہے اسے فلیٹ ڈی میں ٹھہرے ہوئے شخص سے رابطہ قائم کرنا ہے۔"

"مسٹر تمھارا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

"یہ تمھارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔" اسٹرینک نے کہا "ہم جانتے ہیں کہ فلیٹ بی میں جو شخص مقیم ہے اس سے میجر کے دوستانہ تعلقات ہیں اگر میجر ان کے پاس جاتا ہے تو ہم کوئی قدم نہیں اُٹھائیں گے۔ لیکن اگر وہ فلیٹ ڈی میں جاتا ہے تو....." اسٹرینک کہتے کہتے رُک گیا۔

"تو کیا کرو گے؟" مادام فریا نے سوال کیا۔

"تو ہم فلیٹ ڈی پر چھاپا مار کر مُجرم کو گرفتار کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"صرف کوشش؟" مادام نے سوالی انداز میں بھویں چڑھائیں۔

"ہاں صرف کوشش — کیونکہ ہم کوئی اسکینڈل کھڑا کرنا نہیں چاہتے۔" اسٹرینک نے جواب دیا "مجھے افسوس کے ساتھ یہ بتانا پڑ رہا ہے کہ اس کوشش کے درمیان ایک حادثہ بھی متوقع ہے۔"

"غالباً تمھارا مطلب ہے کہ....." مادام نے جیسے سرگوشی کی "کہ میجر برسکا کو........"

"گولی ماردی جائے گی" اسٹرینک نے بلا تامل کہا "اگر اس نے گرفتاری میں مزاحمت کی تو اسے گولی ہی مارنی پڑے گی کیوں کہ ہم اس کا کورٹ مارشل کر کے کوئی ہنگامہ برپا کرنا پسند نہیں کریں گے۔"

مادام فریا کی آنکھوں میں خوف و دہشت کے تاثرات نمایاں تھے اس نے کہا "میں اس سلسلے میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتی، مجھ سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔"

اسٹرینک نے اطمینان سے اس کی طرف دیکھ کر درشت لہجے میں کہا "تمھیں ہمارے احکام پر عمل کرنا پڑے گا۔ اس کے بغیر تم کل اسٹاک ہام روانہ نہیں ہو سکو گی۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں ہے" مادام نے تیزی سے کہا "میں یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ ...."

"بہت خوب" وہ گھورتا ہوا بولا "غور سے سُنو۔ تم عالمی شہرت کی مالک ایک فن کارہ ہو، دولت مند ہو، خوب صورت بھی ہو اور نوجوان بھی۔ یہ سب کچھ درست ہے، لیکن تمھارا کوئی وطن نہیں ہے۔ کوئی سفارتی نمایندہ یا منسٹر ایسا نہیں جس کے پاس تم شکایت لے کر جا سکو — میرا مطلب ہے، اگر بدقسمتی سے تمھارا پاسپورٹ گُم ہو جائے تو۔"

"تم ..... تم بلیک میلر ......" غصے نے مادام کو فقرہ مکمل نہیں کرنے دیا۔

پہلی مرتبہ اسٹرینک بڑی خوش دلی سے مسکرایا۔ "ہاں۔ اب تم کچھ کچھ سمجھنے لگی ہو" اس نے کہا "اگر پاسپورٹ گم ہو جائے اور وہ بھی جنگ کے زمانے میں تو یہ ایک خاصی پریشان کُن بات ہو سکتی ہے، بلکہ خطرناک کہنا چاہیے۔ تمھیں کسی کیمپ میں بھی بھیجا جا سکتا ہے، اور کیمپ کی زندگی۔ کوئی خوش گوار زندگی تو نہیں ہوتی مادام — خاص طور سے تم جیسی ایک خوب صورت خاتون کے لیے کم از کم میں بھی یہ گوارا نہیں کروں گا۔"

اسٹرینک نے دیکھا کہ مادام حقیقت میں خوف زدہ نظر آ رہی ہے۔ سارا غرور یکلخت غائب ہو چکا تھا۔ وہ سہمی ہوئی تھی، اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ "خاموش ہو جاؤ۔ خُدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔" وہ چیخی "میں تیار ہوں، جو کچھ تم کہو گے وہ کرونگی۔ بتاؤ مجھ سے کیا چاہتے ہو—؟"

"غور سے سُنو" اسٹرینک نے جواب دیا "ہماری اطلاعات کے مطابق میجر برسکا ٹھیک نو بجے جنگی دفتر سے روانہ ہو گا اور سیدھا

یہیں آئے گا۔"

"لیکن مجھے میجر نے بتایا تھا کہ اسے گیارہ بجے سے پہلے چھٹی نہیں مل سکتی" مادام زیلا نے جلدی سے کہا "یہی وجہ ہے کہ وہ میرا پروگرام نہیں سُن سکے گا۔"

"ہوسکتا ہے کہ اس نے تم سے یہی کہا ہو۔ لیکن ہمارے پاس واضح اور یقینی اطلاعات ہیں کہ وہ نو بجے دفتر سے رُخصت ہو کر یہاں آئے گا ــــ تمھیں اس نے کیا وقت دیا تھا؟"

"ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے کا۔"

"گویا وہ پہلے فلیٹ ڈی میں رُکنا چاہتا ہے ــــ جیسا کہ ہمارا خیال بھی ہے ــــ تاکہ اپنی غدّاری کی قیمت وصول کر سکے" اسٹرینگ نے کہا "غالباً اس کے بعد وہ رات یہیں گزارنے کا ارادہ رکھتا ہوگا؟"

"نہیں۔"

"تو پھر وہ کتنی دیر ٹھیرے گا؟"

"اس نے کہا تھا کہ اس کی چھٹیاں ختم ہو چکی ہیں۔ اسے فوراً واپس جانا ہے۔ اس لیے صرف چند منٹ یہاں ٹھیر سکے گا۔"

"درست ہے۔ میں بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہوں" اسٹرینگ نے جواب دیا "میجر کو اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہونے کے لیے آج رات بارہ بجے ایک اسٹاف کار سے روانہ ہونا ہے۔"

"میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی کہ مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا ہوگا؟"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ تم ہر صورت میں سوا گیارہ بجے تک اپنے فلیٹ میں واپس آجاؤ۔"

"آجاؤں گی۔"

"تمھارے فلیٹ کا بیرونی دروازہ کچھ ترچھا بنا ہوا ہے" اسٹرینگ نے کہا "اگر یہ پورا کھول دیا جائے تو فلیٹ بی، فلیٹ سی اور فلیٹ ڈی کے دروازے آسانی سے دیکھ سکتی ہو۔" اسٹرینگ نے رُک کر ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا۔ پھر مادام کی طرف دیکھا "میں نہیں چاہتا کہ میجر کو کسی قسم کا شبہ ہو لیکن یہ معلوم ہونا بھی ضروری ہے کہ تمھارے پاس آنے سے پہلے وہ کس فلیٹ میں جاتا ہے۔ چنانچہ تمھیں صرف اتنا کرنا ہے کہ اپنے فلیٹ کا دروازہ کھلا چھوڑ دینا اور جیسے ہی میجر فلیٹ ڈی سے باہر نکلے مجھے اشارہ کر دینا۔"

"میں تمھیں اشارہ کیسے کروں گی؟"

"میں باہر باغ میں موجود رہوں گا" اسٹرینگ نے ایک ایک لفظ واضح طور پر ادا کیا "میرے آدمیوں نے اس عمارت کا محاصرہ کر رکھا ہوگا۔ جیسے ہی مجھے یقینی طور پر یہ معلوم ہوگا کہ میجر برسکا فلیٹ ڈی میں گیا ہے ..... میں اپنے منصوبے پر عمل شروع کردوں گا۔ میں اس بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ اسے اس وقت تک گرفتار کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی جب تک وہ تم سے ملاقات کرکے رُخصت نہیں ہوجائے گا۔ میں اس بات کا بھی خیال رکھوں گا کہ میجر کو اس عمارت کے اندر گولی نہ ماری جائے۔ جس وقت میرے آدمی میجر سے نبٹ رہے ہوں گے اسی وقت فلیٹ ڈی پر چھاپا مار کر وہ شخص بھی گرفتار کرلیا جائے گا جس نے ہمارے لیڈر کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔"

"لیکن میں تمھیں اشارہ کس طرح کروں گی؟"

اسٹرینگ کے باریک ہونٹوں پر ایک پُراسرار ہنسی نمودار ہوئی۔ اس نے تعریفی نظروں سے بہترین طریقے پر آراستہ کمرہ دیکھا۔ پھر اُٹھ کر پیانو کے پاس جا کھڑا ہوا۔ پیانو ایک کھڑکی کے قریب رکھا تھا۔ اُس نے پیانو کے سُروں پر ہاتھ رکھا اور مادام سے مخاطب ہوا "تم اس پیانو کے ذریعے سگنل دو گی۔"

"پیانو کے ذریعے؟" مادام فریا کی نظروں میں اُلجھن نظر آئی۔

"ہاں۔ بڑی آسان بات ہے" اسٹرینگ نے سمجھایا "یہاں آؤ ــــ ہم ابھی اشارہ مقرر کیے لیتے ہیں" اس نے اپنی پھُولی ہوئی انگلی پیانو کے سُر 'بی' پر کئی مرتبہ ماری "کچھ سمجھیں' اگر اتفاق سے میجر برسکا فلیٹ ڈی کے بجائے 'بی' میں جائے تو تم سُر بی میں کچھ بجاؤ گی۔"

"سمجھ گئی" مادام نے بے چارگی سے سر ہلا کر جواب دیا۔

"ٹھیک" اسٹرینگ نے اطمینان کا اظہار کیا "اب یہاں آکر بیٹھو اور مجھے بی کے سُروں میں کچھ بجا کر سُناؤ۔"

مادام بہت آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی پیانو کے سامنے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے ہاتھ کانپے۔ پھر فوراً ہی اس نے چاپن کی مشہور بی فلیٹ مائنر سوناٹا کی دُھن چھیڑ دی۔ اس نے ابھی چند ہی سُر نکالے تھے کہ اسٹرینگ نے روک دیا "بہت خوب" وہ بولا "چاپن بی فلیٹ سوناٹا۔ ٹھیک ہے۔ اس سے کام چل جائے گا۔ اب ذرا ڈی کے لیے بھی کوئی دُھن سوچو۔"

اس مرتبہ مادام فریا نے کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا اور فوراً وہی دُھن بجانے لگی جس کی مشق وہ اسٹرینک کے آنے سے پہلے کر رہی تھی۔

"کافی ذہین ہو" اسٹرینک نے مسکرا کر داد دی "دی ڈی فلیٹ اسٹڈی۔ لزٹ کی مقبول دُھن۔ بہت خوب۔ اب تو بات واضح ہوگئی ہوگی مادام — ہم نے بی اور ڈی دونوں کے لیے دُھنوں کا تعین کر لیا ہے۔ رہ گیا فلیٹ سی، تو اس کے بارے میں تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ وہاں فرالین ریناٹے نامی ایک خاتون مقیم ہے جسے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"میں سمجھ گئی۔" مادام فریا نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

اسٹرینک اپنی کارکردگی پر بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مسرت کے عالم میں ہاتھ ملے اور بولا "میجر برسکا تمھارے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھیرے گا۔ آج اس کے پاس بہت کم وقت ہے۔ مگر یہ بڑی فطری بات ہوگی کہ تم اسے الوداع کہنے سے پہلے پیانو پر کوئی دُھن سناؤ۔ ایک سُریلی یاد کے طور پر تاکہ وہ کبھی تمھیں نہ بھول سکے۔ ٹھیک ہے نا؟"

مادام فریا کانپ کر رہ گئی۔ اس نے نظریں اٹھا کر اسٹرینک کی طرف دیکھا اور پھر خود بھی اسٹول سے اُٹھ کھڑی ہوئی "یہ سنگدلی کی انتہا ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"یہ بڑی عجیب بات ہے کہ تمھیں اس شخص کا اتنا خیال ہے۔ شاید تم اس سے کچھ شدید قسم کی محبت بھی کرتی ہو۔" اسٹرینک نے کہا "مگر وہ ایک غدّار ہے۔"

"یہ صرف تمھارا شبہ ہے کہ وہ غدّاری کر رہا ہے" مادام فریا نے جواب دیا "اس امر کا کوئی حتمی ثبوت نہیں ہے۔"

"درست ہے" اسٹرینک نے تسلیم کیا "ثبوت ہمیں آج رات مل جائے گا۔ لیکن مادام!" اسٹرینک نے متنبہ کرتے ہوئے مزید کہا "میجر تمھارا محبوب ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اسے بچانے کے لیے ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کرو۔ خبردار۔"

"یقیناً میں اسے بہت چاہتی ہوں، وہ میرا محبوب ہے" مادام نے اعتراف کیا "اور یہ میرے لیے اذیت ناک اور مشکل ترین کام ہوگا کہ میں اپنے ہاتھوں سے اسے موت کے حوالے کر دوں۔ پھر بھی....."

"پھر بھی تمھیں یہ کام کرنا پڑے گا" اسٹرینک نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا "ورنہ یاد رکھو تم خود پھنس جاؤ گی اور قانون کے شکنجے سے تمھیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔"

کارنس پر رکھی ہوئی ایک چھوٹی گھڑی نے میٹھے سُروں میں وقت کا اعلان کیا۔ مادام نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

"مجھے اب چلنے کی تیاری کرنا چاہیے۔" اس نے کہا "میرا پروگرام ٹھیک آٹھ بجے شروع ہونا ہے۔"

"میں امید کرتا ہوں کہ تم اپنے فن کے مظاہرے میں بے حد کامیاب رہو گی۔" اسٹرینک نے جھکتے ہوئے کہا۔

مادام نے آتش دان کے قریب پہنچ کر ملازمہ کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔ دروازہ کُھلا اور ملازمہ گریٹل ایک بے حد خوب صورت اور قیمتی لبادہ ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوئی۔ جب وہ اسٹرینک کے قریب سے گزری تو اس نے گریٹل کو روک کر لبادے پر ہاتھ پھیرا اور پھر یہ دیکھ کر مادام کی پیشانی پر ناگواری کی سلوٹیں اُبھر آئیں کہ اسٹرینک نے لبادہ چھُونے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ جھک کر اسے چُوم بھی لیا۔

"بہت خوب صورت ہے۔" اسٹرینک نے تعریف کی۔

گریٹل نے آگے بڑھ کر لبادہ اپنی مالکہ کے کندھوں پر ڈال دیا۔

"کار باہر کھڑی ہے مادام۔" اس نے بتایا۔

"شکریہ گریٹل" مادام نے جواب دیا "رات کو میرا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے"۔ وہ اسٹرینک کی طرف گھومی "شب بخیر مسٹر اسٹرینک۔"

"شب بخیر مادام" اسٹرینک نے سر جُھکا کر کہا "امید ہے تمھارا پاسپورٹ صبح واپس کر دیا جائے گا۔"

مادام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے لبادہ سنبھالتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اسٹرینک کان لگائے کھڑا رہا۔ جب اس نے کار کا دروازہ بند ہونے کی آواز سُن لی تو اطمینان کی سانس لی اور جیب سے ایک سگار نکال کر جلایا۔ اس نے ایک گہرا کش لیا اور دھواں نکالنے لگا۔ پھر اس نے گریٹل کی طرف دیکھا "اپنی رپورٹ سناؤ۔"

"کوئی تازہ اطلاع نہیں ہے ایکسی لینسی۔" گریٹل نے آہستہ سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ اگر کوئی خاص بات ہو تو مجھے فون کر دینا۔" اسٹرینک نے کہا "اسپیشل لائن۔ ایکسٹنشن ۷۔"

"بہت اچھا، ایکسی لینسی۔"

"اگر سارے کام اطمینان بخش طریقے پر انجام پا گئے تو اطلاع کر دی جائے گی کہ تمہیں کس وقت بیوریو جاکر اس عورت کا پاسپورٹ لانا ہے۔"

"اور اگر......" گرٹیل کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

اسٹرنیک کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ ابھری، "دوسری صورت میں تمہیں بیوریو جانے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔"

تماشائیوں سے فن کی بھرپور داد وصول کرنے کے بعد مادام فریا فلیٹ واپس آئی تو اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس کے اعصاب کتنے کھنچے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود وہ خود پر قابو پائے ہوئے تھی کیونکہ وہ ابھی تک اس داد و تحسین سے سرشار تھی جو آج رات اسے ملی تھی۔ جیسے ہی اس نے پیانو سے اپنی انگلیاں اٹھائی تھیں، پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔ آج ملک کے ایک بڑے لیڈر بھی اسے سننے آئے تھے۔ پردہ گرنے کے بعد ہی مادام کو ان کے سامنے لے جایا گیا تھا۔ لیڈر نے اس کی تعریف کی تھی اور اسے تحفے کے طور پر ہیروں سے بنا ہوا اپنی پارٹی کا نشان دیا تھا۔ اس وقت ایک لمحے کے لیے مادام نے لیڈر کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کی تھی اور اسے وہاں ذرا اضافے کے ساتھ وہی سرد مہری اور بے زاری نظر آ رہی تھی جو اس نے اسٹرنیک کی آنکھوں میں محسوس کی تھی۔

کسی نہ کسی طرح اس نے لیڈر کا تحفہ اور تعریف کا شکریہ ادا کیا اور بڑے محتاط الفاظ میں اس دعوت میں شریک ہونے سے معذرت چاہی جو لیڈر نے اسے اپنی چانسلری میں دینا چاہی تھی۔ اور پھر وہ دوبارہ سامعین سے خراجِ تحسین وصول کرتی ہوئی اسٹیج کے عقبی دروازے سے کار میں جا بیٹھی تھی۔

فلیٹ واپس پہنچنے پر اس نے ایک غیر معمولی حرکت کی۔ اس وقت ٹھیک گیارہ بج کر اٹھارہ منٹ ہوئے تھے۔ اس نے ایک گلاس میں برانڈی بھری اور ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔ اسے شراب پینے کی عادت نہیں تھی، اس لیے برانڈی نے گلے سے اترتے ہی اپنا اثر دکھایا، اب وہ اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ پُرسکون اور خود اعتماد محسوس کر رہی تھی۔ گیارہ بج کر پچیس منٹ پر فون کی گھنٹی بجی۔ یہ اسٹرنیک کا فون تھا۔ وہ بڑی نرم مگر مستحکم آواز میں کہہ رہا تھا۔

"تمہارا پاسپورٹ بڑی احتیاط سے ایک لفافے میں بند کر دیا گیا ہے مادام۔ جو ہدایات دی گئی ہیں اگر تم نے ان پر پوری طرح عمل کیا تو کل صبح اپنی ملازمہ گرٹیل کو بھیج کر پاسپورٹ واپس منگوا سکتی ہو۔"

اور پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی اسٹرنیک نے ریسیور رکھ دیا۔ مادام ریسیور کریڈل پر ڈال کر گھومی ہی تھی کہ گھڑی نے ساڑھے گیارہ کا گھنٹہ بجا دیا وہ تیزی سے فلیٹ کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھی اور اسے اس طرح کھول دیا کہ راہداری کے علاوہ فلیٹ بی، فلیٹ سی اور فلیٹ ڈی کے دروازے واضح طور پر نظر آنے لگے۔ وہ پانچ منٹ تک بالکل خاموش کھڑی رہی۔ اچانک راہداری میں ایک دروازہ کھلا اور پھر بند ہو گیا۔ مادام نے جلدی سے اپنے فلیٹ کا دروازہ بند کیا اور بیٹھک میں واپس آ گئی۔

اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے ایک سگریٹ سلگانے کی کوشش کی مگر ماچس کا شعلہ سگریٹ تک لانے میں ناکام رہی۔ اس نے اس کمزوری پر جھنجلا کر تیلی ایش ٹرے میں پھینک دی۔ اسی لمحے اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ مادام نے خود کو سنبھالنے کی ایک بھرپور کوشش کی اور سنگھار کی ڈبیا کھول کر آہستہ آہستہ ہونٹوں کی سرخی درست کرنے لگی۔ گھنٹی ایک بار پھر بجی۔ مادام بڑی حد تک خود پر قابو پا چکی تھی۔ کسی خاص عجلت کے بغیر وہ اٹھی اور اس نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ اپنے محبوب کی آغوش میں تھی۔ میجر اسے پیار کر رہا تھا اور سرگوشیوں میں اس کے بے پناہ حسن کی تعریف کرتا جا رہا تھا۔ مادام نے تڑپ کر میجر کی آغوش سے نکلنے کی کوشش کی لیکن بازوؤں کا حلقہ اور تنگ ہو گیا۔ پھر چند لمحوں بعد میجر نے مسکراتے ہوئے خود ہی اسے چھوڑ دیا۔ میجر مادام کو کمر سے تھام کر بیٹھک کی طرف چلا اور اس بات پر افسوس ظاہر کرنے لگا کہ وہ اس کی روح پرور موسیقی سننے کے لیے نہیں آ سکا۔ میجر نے کہا۔ "لعنت ہو اس جنگ پر، یہ نہ ہوتی تو میں تمہارے ساتھ زیادہ وقت گزار سکتا۔"

وہ بڑی سنجیدگی سے گفتگو کر رہا تھا۔ اتنی سنجیدگی سے کہ مادام فریا کو اپنے ذہن میں وہ منظر پھر سے تازہ کرنا پڑا جو اس نے ابھی ابھی کھلے ہوئے دروازے سے راہداری میں دیکھا تھا۔

"کیا لیڈر بھی آیا تھا۔ کیا اس نے اپنے پاس بلا کر داد بھی دی تھی؟"

میجر کہہ رہا تھا "اوہ فریا پیاری میں آج کی غیر حاضری کے لیے اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔ تم جس وقت پیانو پر اپنے جوہر دکھا

رہی تھیں اس وقت میں جنگی دفتر میں سر کھپا رہا تھا۔ اور اب بھی ڈیوٹی پر واپس پہنچنے کی فکر سر پر سوار ہے۔"

"اتنا شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" مادام نے جواب دیا۔ "میں جانتی ہوں کہ تم مجبور تھے۔"

میجر نے ایک قہقہہ لگایا۔ پھر جلد ہی سنجیدہ ہوگیا۔ "ہاں خوب یاد آیا۔ تمھیں میرے پھول مل گئے تھے؟"

"ہاں۔ بہت خوب صورت تھے۔ شکریہ۔"

"قسمت نے ساتھ دیا تو چند ہفتے بعد لمبی چھٹی لینے کی کوشش کروں گا۔" میجر نے کہا۔ "پھر ہم کئی دن تک ساتھ رہ سکیں گے، کیا تم ویڈلک آسکتی ہو؟ وہ اسٹاک ہام سے بہت قریب ہے۔"

"کوشش کروں گی" مادام نے جواب دیا۔ "وعدہ نہیں کر سکتی تمھیں معلوم ہے کہ وہاں میری مصروفیت......"

"جب مجھے چھٹی ملنے کا یقین ہو جائے گا تو تمھیں تار دے دوں گا" میجر نے بات کاٹ کر کہا۔

"کیا تم اتنی دور صرف مجھ سے ملنے کے لیے آؤ گے؟" مادام نے پوچھا۔

میجر، مادام کے لہجے کا طنز محسوس نہیں کر سکا۔ اس نے قہقہہ لگایا۔

"تمھیں دیکھنے کے لیے تو بڑے سے بڑا فاصلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، فراجان۔"

وہ کچھ اس انداز میں بولا کہ مادام کو اس کے لہجے سے خلوص کا شبہ ہونے لگا۔ وہ مسکرانے لگی "یہ بات تم اب تک نہ جانے کتنی عورتوں سے کہہ چکے ہو گے۔"

میجر نے اس طرح مادام کی طرف دیکھا جیسے اسے اس بات سے تکلیف پہنچی ہو۔

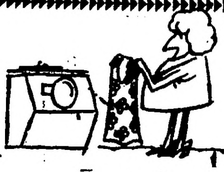
"تم اچھی طرح جانتی ہو فریا کہ میری زندگی میں تمھارے سوا کوئی عورت کبھی نہیں آئی۔ میں تم سے صرف محبت ہی نہیں کرتا، تمھاری پرستش بھی کرتا ہوں۔"

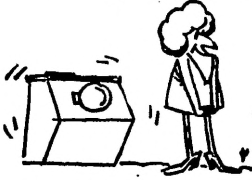
مادام نے کہا "جب سے تم ملے ہو، میری زندگی میں بھی تمھارے سوا کوئی نہیں آیا——"

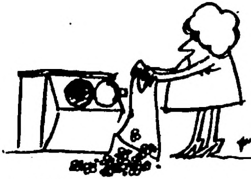
"مجھے یقین ہے۔ بہرحال وعدہ کرو کہ جب مجھے چھٹی مل جائے گی تو تم مجھ سے ملنے ویڈلک ضرور آؤ گی۔"

"میں نے بتایا نا کہ ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

میجر برسکلنے دستی گھڑی دیکھی۔ "تمھیں کوئی واضح جواب دینا پڑے گا۔ تم سے جدا ہونے کو دل نہیں چاہتا مگر مجھے ہر صورت میں صبح سے







پہلے ہیڈ کوارٹر پہنچنا ہے۔ جلدی بتاؤ میری خوب صورت گڑیا۔ آؤ گی نا ——کہو نا۔ ہلاؤ ذرا سر۔"

مادام اثبات میں جواب دینا چاہتی تھی، مگر اس کی زبان سے کچھ نہیں نکل سکا۔ میجر نے اس کی خاموشی کو اپنے سوال کا جواب سمجھا۔ اس نے مادام کو آغوش میں لے کر پیار کیا۔ "میری محبت صرف تمھارے لیے ہے" وہ بولا "ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔"

"ہمیشہ کے لیے؟" مادام نے طنزاً پوچھا۔

"ہاں مائی ڈیر ہمیشہ کے لیے" میجر نے اسے دوبارہ پیار کرتے ہوئے جواب دیا پھر الگ ہو کر بڑی حسرت سے بولا "اب مجھے رخصت کی اجازت دو۔"

دونوں نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو الوداع کہا اور میجر چلا گیا۔

مادام نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ غیر ارادی طور پر اسکے قدم پیانو کی طرف بڑھ گئے۔ اسٹول پر بیٹھتے ہوئے اس نے ڈھکنا اٹھایا۔ دونوں ہاتھ سُروں پر رکھنے کے لیے بلند کیے۔ ایک ثانیے کے لیے ہچکچائی، چہرے پر سختی نمایاں ہوئی، ہونٹ بھنچ گئے۔ اور پھر اس نے پیانو بجانا شروع کر دیا۔ وہ لزٹ کی دُھن اسٹڈی ان ڈی فلیٹ بجا رہی تھی۔

ابھی وہ آدھی دُھن تک ہی پہنچی تھی کہ باہر باغ میں ریوالور چلنے کی آواز سُنائی دی۔ اس کے ہاتھ ایک دم رُک گئے اور وہ اسٹول سے کھڑی ہوگئی۔ تیز سیٹیاں سُنائی دے رہی تھیں۔ ساتھ ہی سخت لہجے میں احکام کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ پھر فوراً ایک کے بعد دیگرے دو فائروں کی آواز گونجی۔

مادام فریا دوبارہ اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اس نے سگرٹ جلانے کی کوشش کی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ ماچس کی تیلی سگرٹ تک لاتی فلیٹ کی گھنٹی بجنے لگی۔ ساتھ ہی کسی نے زور زور سے دروازے پر دستک دی۔ مادام آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر پہنچی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔

باہر اسٹرینک کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو رہا تھا وہ مادام فریا کو زور سے دھکا دیتا ہوا کمرے میں آگیا۔ "کیا تم پاگل ہوگئی ہو۔" وہ چیخا۔

مادام نے اس طرح اس کی طرف دیکھا جیسے کسی نے اس پر تنویم کا عمل کر رکھا ہو۔ اس نے بولنے کی کوشش کی مگر ہونٹ اتنے خشک ہو رہے تھے کہ آواز نہ نکلی۔ اسٹرینک نے ہاتھ اٹھایا مادام یہ سمجھی کہ وہ اسے مارنا چاہتا ہے اس لیے جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ "احمق عورت۔" اسٹرینک دانت پیسنے لگا۔ "تم نے ڈی فلیٹ اسٹڈی کی دُھن بجائی تھی؟"

"ہاں۔" اس نے سرگوشی کی۔

"تم نے بڑی فاش غلطی کی ہے" اسٹرینک نے جھلّا کر کہا "بے وقوف عورت، فلیٹ ڈی میں ٹھیرا ہوا شخص تو بے خبر سو رہا تھا اس نے کسی سے ملاقات نہیں کی تھی۔ مگر اب اسے پتہ چل گیا ہے کہ خفیہ پولیس اس پر شبہ کر رہی ہے۔ تم نے سب کچھ چوپٹ کرا دیا۔ ہم نے اس کے فلیٹ پر چھاپا مارا۔ مگر کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا کیوں کہ میجر برسکا آج رات اس سے ملا ہی نہیں۔"

"اور..... میجر..... اس کا کیا ہوا؟" مادام نے اس طرح کہا جیسے بہت فاصلے سے بول رہی ہو۔

"تمھیں کس بات کی توقع تھی؟ اگر تم نے یہ احمقانہ غلطی نہ کی ہوتی تو......."

مادام نے اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری۔ اور پھر خود ہی اپنی واضح آواز سُن کر چونک پڑی "ہوا کیا تھا؟"۔

"اس نے گرفتاری میں مزاحمت کی تھی۔" اسٹرینک گھور کر بولا۔

"تو کیا تم نے اسے شوٹ کر دیا؟"۔

ایسا محسوس ہوا جیسے اسٹرینک اپنا ضبط کھو چکا ہو۔ "میجر نے ایک کار میں بھاگنے کی کوشش کی تھی" اس نے زور زور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "پاگل عورت۔ تو اپنے اعصاب پر قابو نہیں رکھ سکی اور ایک بے گناہ آدمی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تو نے یہ حماقت کیوں کی؟"۔

"میں نے کوئی غلطی نہیں کی مسٹر اسٹرینک۔" مادام فریا نے جواب دیا۔

اسٹرینک نے جھنجلاہٹ میں اس کے منہ پر ایک تھپّڑ رسید کر دیا۔ "جھوٹ مت بولو" وہ دہاڑا "برسکا فلیٹ ڈی میں نہیں گیا تھا۔"

"میں جانتی ہوں" مادام نے اس طرح کہا جیسے اسے تھپّڑ کی چوٹ کا احساس تک نہ ہو" وہ اپنے ملک سے بے وفائی نہیں کر رہا تھا۔"

اسٹرینک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا "پھر...... پھر تم نے وہ دُھن کیوں بجائی؟"۔

مادام فریا کی بے خودی یکلخت ٹوٹ گئی۔ اس کے انداز میں ایک بار پھر وہی تمکنت پیدا ہوگئی جو اسٹرینک پہلے دیکھ چکا تھا۔ اس کی آنکھیں غصّے سے چمکنے لگیں۔ "بے شک وہ اپنے وطن کا غدّار نہیں تھا" وہ تیزی سے بولی" مگر وہ مجھ سے بے وفائی کر رہا تھا میجر برسکا اس چڑیل کے فلیٹ سے برآمد ہوا تھا جو فلیٹ سی میں رہتی ہے۔"

"اوہ۔ فرالین رینالٹے۔" حیرت سے اسٹرینک کے منہ سے نکلا "تو برسکا فلیٹ سی سے نکلا تھا؟"۔

مادام نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسٹرینک غصّے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر مادام پر ہاتھ اٹھا دیا۔ اس مرتبہ پڑنے والا تھپّڑ اتنا شدید تھا کہ مادام لڑکھڑا کر زمین پر گرنے لگی مگر اسٹرینک نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"خبیث عورت یہ تو نے کیا کیا؟" اس نے مادام کو جھنجوڑ ڈالا۔ خون کی ایک باریک لکیر مادام فریا کے ہونٹوں سے بہہ نکلی۔

"اس نے مجھ سے جھوٹ کہا تھا۔" وہ بولی "کہتا تھا کہ وہ صرف مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میرے سوا کوئی عورت اس کی زندگی میں داخل نہیں ہے۔ حالانکہ وہ اپنا تمام وقت اُس حرّافہ کے پہلو میں گزارنے کے بعد میرے پاس آیا تھا۔ ہاں وہ غدّار تھا۔ اس نے مجھ سے غدّاری کی تھی۔"

فارابی

چند سطروں میں ایک شخصیت کا تعارف

ارسطو معلم اوّل تھا اور ابونصر فارابی معلم ثانی۔ مسلمانوں میں یہ پہلا شخص تھا جس نے ارسطو کی تصانیف کی شرحیں لکھیں۔ بعد میں بوعلی سینا جیسے حکیم اور فلسفی نے ارسطو کے فلسفے کو فارابی کی تشریحات ہی کے ذریعے سمجھا۔

اس کا نام محمد بن محمد بن ترخان تھا اور کنیت ابونصر۔ ۸۷۰ء میں ترکستان کے دریائے جیحون کے کنارے فاراب نامی مقام پر پیدا ہوا۔ اپنے عیسائی استادوں سے منطق اور فلسفہ پڑھا۔ شروع میں وہ بغداد میں رہتا تھا لیکن بعد میں وہ حلب چلا گیا اور وہاں کے امیر سیف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔

فارابی نے مختلف علوم پر کتابیں لکھیں۔ فلسفہ، سائنس، نفسیات، مابعدالطبیعات اور سیاسیات۔ سازوں میں عود اور رباب کا موجد تھا۔ سیاسیات میں اس نے افلاطون کی "ری پبلک" کا اثر قبول کیا لیکن اس پر سخت تنقید اور اختلاف بھی کیا۔ سیاسیات پر اس کی پانچ کتابیں ہیں۔ افلاطون کی کتاب کا خلاصہ، سیاست المدنیہ، آرا اہل المدینہ الفاضلہ، جوامع السیاسا اور اجتماع المدینہ۔

فارابی انسانی اجتماع اور یک جہتی کو فطری نہیں قرار دیتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ انسان کی اغراض اور حاجتیں اسے دوسروں کا تعاون حاصل کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ فارابی کے خیال میں بین الاقوامی اتحاد ناممکن ہے اور اس اتحاد کی راہ میں جغرافیائی اختلافات رسوم و رواج اور زبان کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔

فارابی مملکت کو معاہدہ عمرانی SOCIAL CONTRACT کا نتیجہ قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ انسان چونکہ فطری طور پر جنگجو ہے اس لیے اس نے اپنے جھگڑوں اور خلفشار سے تنگ آ کر اپنی مرضی سے اپنے حقوق کا ایک حصہ مملکت نام کی مرکزی قوت کے سپرد کر دیا ہے۔ فارابی کی نظر میں مملکت کے سربراہ میں مندرجہ ذیل خوبیاں ہونی چاہئیں۔

"جسمانی لحاظ سے بے عیب اور صحتمند ہو، ذکی اور عاقل ہو، قوتِ تقریر اتنی تیز ہو کہ جو کچھ کہے سننے والے پر اس کا نقشہ کھینچ جائے۔ معاملے کی تہہ تک فوراً پہنچ جاتا ہو، حافظہ تیز ہو، لہو و لعب سے پرہیز کرتا ہو، خواہشاتِ نفسانی پر قابو رکھتا ہو، سچ سے محبت اور جھوٹ سے نفرت رکھتا ہو، وسیع القلب اور عادل ہو، جس چیز کو بہتر سمجھے، اسے بلا خوف نافذ کر دے۔" اس کا خزانہ معمور ہو۔ افلاطون کا خیال تھا کہ اگر حکمرانوں کے پاس ذاتی مکانات، زمین یا مال و دولت ہو تو اس طرح وہ اچھے تاجر اور کسان تو ضرور بن جائیں گے، لیکن مملکت کے محافظ نہیں رہیں گے۔

فارابی کہتا ہے کہ "یہ ذاتی املاک کے تحفظ کی ضرورت ہی تو تھی جس نے انسان کو مملکت اور حکومت کی ضرورت محسوس کرائی ورنہ حقیقتاً یہ اپنے ہم جنس کا شدید دشمن ہے۔ اس کا باہمی اتحاد جبری اور مصلحتی ہے۔" اپنے اس قول سے فارابی یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ املاک کو مشترک تو ضرور قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اسے بالکل ختم نہیں کیا جا سکتا۔

فارابی کو حلب کے حکمران سیف الدولہ کی طرف سے یومیہ چار درہم ملتے تھے جنہیں وہ اپنے لیے بہت زیادہ سمجھتا تھا۔ اس کا رہن سہن صوفیانہ تھا۔ اس نے ۹۵۰ء میں وفات پائی اور دمشق میں دفن ہوا۔

اَنکا



جمیل احمد خاں

یہ ایک عجیب و غریب سرگزشت ہے۔ جب میں اپنا آبائی وطن چھوڑ کر ایک دوسرے شہر میں ملازمت کے لیے آیا تو یہاں ایک شخص رام دیال سے میری دوستی ہوگئی اور میرا اُس کے گھر آنا جانا ہوگیا۔ اُس کی ماں مجھ پر بڑی مہربان تھی۔ وہ آئے دن پنڈتوں پجاریوں کو اپنے ہاں بُلاتی رہتی تھی۔ ایک دن اچانک اُس نے مجھ سے یہ عجیب بات کہی کہ اگر میں ایک جاپ کروں تو اِنکا کی پُراسرار قوّت اپنے قبضے میں کرسکتا ہوں۔ مجھے اِن توہمات سے قطعاً دلچسپی نہیں تھی، بات آئی گئی ہوگئی۔ رام دیال کی ماں کا انتقال ہوگیا اور میں رات بھر اُس کے کریاکرم میں مصروف رہا۔ دُوسری صبح جب میں دفتر جارہا تھا تو اچانک محسوس ہوا کہ کوئی ہلکی پھلکی چیز میرے سر پر آگری ہے۔ میں نے بار بار سر جھٹکا، بالوں میں اُنگلیاں پھیریں مگر کسی پُراسرار شے کے بار یک پنجوں کی چبھن کم نہ ہوئی اور ایسا لگا جیسے کوئی خوب صورت اور نازک اندام دوشیزہ میرے سر پر بیٹھی ہے۔ جیسے ہی اُس کا ہوش رُبا وجود میرے تصور میں آیا، میرے کانوں میں اُس کی سریلی آواز نے کچھ سرگوشی کی، میں دنگ رہ گیا۔ واقعی وہ مجھ سے بات کررہی تھی۔ اُس نے اپنا نام اِنکا بتایا اور کہا کہ وہ حیرت انگیز اور غیر معمولی قوّتوں کی مالک ہے۔ اُسے میں پسند آگیا ہوں اسی لیے وہ میرے سر پر چلی آئی ہے۔ یہ بات میری عقل میں نہیں آئی مگر میں نے اُسے قبول کرلیا کیوں کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور جب میں نے اُس کی ہدایتوں پر عمل کرنا شروع کردیا تو میری زندگی میں انقلاب آگیا۔ سب کچھ بدل گیا۔ زندگی میں کسی چیز کی کمی نہ رہی۔ اِنکا نے اپنی اِن نوازشوں کے عوض مجھے مجبور کیا کہ میں ہر مہینے اُس کے لیے کسی آدمی کا خون فراہم کیا کروں۔ اِنکا اپنی پُراسرار قوّتوں کے باوجود اپنے ہاتھوں سے کسی کو قتل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی اور میں اس امر پر آمادہ نہیں ہوا لیکن جب میں نے اپنی محبوبہ نرگس کو اُس کے منگیتر جمشید سے گفتگو کرتے دیکھا تو میرا خون کھول اُٹھا۔ اِدھر اِنکا کا اصرار بڑھا کہ میں جمشید کو قتل کردوں تو راستے کی رُکاوٹ بھی دور ہوجائے گی اور اِنکا کو اُس کی غذا بھی فراہم ہوجائے گی۔ پتہ نہیں کس طرح جمشید میرے ہاتھوں مارا گیا۔ پولیس کے ڈر سے میں بمبئی بھاگ آیا۔ مگر نرگس میرے دل و دماغ پر چھائی رہی۔ میں بمبئی میں اِنکا کے طفیل بے شمار دولت، کار، کوٹھی اور کئی نوکروں کا مالک بن گیا۔ اِنکا نے اِن احسانات کے بدلے ہر مہینے مجھے کسی نہ کسی شخص کو قتل کرنے پر اُکسایا۔ مجھے مجبوراً اِس شرم ناک کام پر آمادہ ہونا پڑا کیوں کہ اگر میں منع کردیتا تو وہ ایسے حالات پیدا کرسکتی تھی جو میری تباہی کا باعث بن جاتے۔ میں اُلجھتا گیا۔ اِنکا نے میری خوشنودی کے لیے حیرت انگیز طور پر نرگس کو بمبئی بلوالیا اور وہ اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر میرے ساتھ بیوی بن کر رہنے کے لیے تیار ہوگئی۔ ابھی تک نرگس کو اِنکا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا لیکن جب پے درپے قتل، مقدمے، عدالتوں کے چکر، گھر میں پولیس کی آمدورفت، گرفتاریاں اور جیل سے میری پُراسرار طور پر رہائی کے واقعات آئے دن ہونے لگے تو نرگس کو سب کچھ پتہ چل گیا۔ میں اِس زندگی سے تنگ آگیا تھا ——— یہ خوں ریزیاں، گرفتاریاں، بے گناہوں کے قتل ——— آخر کوئی کب تک اِس سنگ دلی اور بربریت کا متحمل ہوتا۔ میں نے اِنکا سے پیچھا چھڑانا چاہا مگر یہ ممکن نہ ہوسکا۔ اِنکا نے مجھ پر ظلم توڑنے شروع کردیئے یہاں تک کہ اِس کش مکش میں مجھے اپنا ایک ہاتھ بھی کھونا پڑا۔ میں جب بھی تنگ آکر اُس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا، وہ مجھے کسی نہ کسی مصیبت میں مُبتلا کردیتی۔ کبھی ہم دونوں میں پُرلطف گفتگو ہوتی اور کبھی سخت کلامی تک نوبت جاپہنچتی۔ وہ میرے سر پر اپنے پنجے چبھو کر جو کام چاہتی مجھ سے کروالیتی اور جب میں اُس کے عذاب سہہ سہہ کر تھک جاتا تھا تو ناطوعاً کرہاً پھر اُس کے حکم کی تعمیل کا عہد کرلیتا۔ ایک مقدمے کے موقع پر میں نے عدالت میں اِس حقیقت کا انکشاف کردیا کہ مبیّنہ قتل یقیناً میرے ہی ہاتھوں ہوا ہے لیکن درحقیقت میرے سر پر ایک خوب صورت اور پُراسرار لڑکی قابض ہے، جس نے مجھ سے یہ جُرم کروایا ہے۔ عدالت میں کھلبلی مچ گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ ناممکن بات کون تسلیم کرتا۔ میرے لیے موت کی سزا تجویز کردی گئی۔ نرگس نے مجھے بچانے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن میں موت کے قریب پہنچ گیا تھا۔ پھر اِس سنگین صورتِ حال سے اِنکا ہی تھی جس نے مجھے بچایا۔ میری زندگی تلخ ہوچکی تھی۔ نرگس نے اِس سلسلے میں متعدد بار بعض روحانی بزرگوں سے مدد لینی چاہی لیکن ہر بار اِنکا کو پتہ چل گیا اور اُس نے میرے ساتھ ساتھ نرگس کو بھی اپنے عتاب کی لپیٹ میں لے لیا۔ آخر مجھے پھر مفاہمت کرنی پڑی۔ اِنکا نے

اتنی رعایت ضرور کردی کہ میں ہر مہینے کے بجائے چار مہینے میں اُس کے لیے ایک آدمی کا خون فراہم کردیا کروں۔ نرگس کے والد اصفہانی صاحب نرگس کی سرکشی پر ہم سے سخت ناراض تھے۔ اِنکا نے ایسے حالات پیدا کردیئے کہ وہ ہم سے راضی ہوگئے اور اُنھوں نے ہمیں اپنے ہاں بُلالیا۔ میں نے اِنکا کے تعاون سے تجارتی معاملوں میں اصفہانی صاحب کی درپردہ مدد بھی کی۔ پھر ایک دن ایسا محسوس ہوا جیسے اِنکا کچھ اُداس ہے۔ اتنے دنوں ساتھ رہنے کی وجہ سے اب مجھے اُس سے ایک گونہ محبت ہوگئی تھی۔ اُس نے جب اپنی اُداسی کا سبب بتایا تو میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور اُس کے سارے احسانات ذہن میں گھومنے لگے۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے اُس کی بدولت کیا کچھ پایا ہے۔ اِنکا کی اُداسی بجا تھی کیوں کہ اسی شہر کے ایک شخص تربینی داس نے اِنکا کے حصول کے لیے جاپ شروع کرلیا تھا۔ اِنکا نے کہا اگر وہ اپنے جاپ میں کامیاب ہوگیا تو مجھے مجبوراً اُس کے حکم کی تعمیل کرنی پڑے گی۔ ایک زمانہ تھا کہ میں خود اِنکا سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا مگر اب مجھے اُس کی جدائی گوارا نہ تھی کیونکہ اب وہ میری ذات میں شامل ہوچکی تھی۔ میں اُس مرگھٹ پر پہنچا جہاں تربینی داس جاپ کررہا تھا اور دو ایک پنڈتوں کی مدد سے تربینی کے جاپ میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ دن گزر رہے تھے اور میری بے چینیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ میں تصور کے عالم میں اِنکا کو دیکھتا تو وہ مجھے اُداس نظر آتی۔ کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ اِنکا چلی گئی تو کیا ہوگا، یہ سوچ سوچ کر میرا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ میں نے ایک بار پھر تربینی کو جاپ منڈل سے باہر لانے کی کوشش کی لیکن بے سود ——— اور آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ تربینی اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا اور دل گرفتہ اِنکا مجھ سے بچھڑ گئی۔ اِنکا کے جاتے ہی میری گردشوں کا زمانہ شروع ہوگیا۔ نرگس مجھ سے چھین لی گئی۔ اصفہانی صاحب نے مجھ سے زبردستی نرگس کو طلاق دلوائی اور مجھے زدوکوب کرکے گھر سے نکلوادیا۔ تربینی نے اِنکا کو پاکر اُسی کی مدد سے، جاپ میں خلل ڈالنے کے قصور میں مجھے دَر دَر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کردیا۔ سب کچھ چِھن گیا۔ میں تربینی کی تلاش میں جگہ جگہ گھومتا رہا۔ آخر وہ مجھے پونا میں ملا۔ جب وہ نظر آیا تو مجھے خود پر قابو نہ رہا۔ میں نے اسے قتل کرنا چاہا لیکن اِنکا کی موجودگی میں کون اُسے قتل کرسکتا تھا۔ یہ میری نادانی تھی اور اُس کی سزا مجھے جیل کی صورت میں بھگتنی پڑی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مجھے رہائی بھی تربینی ہی نے دلوائی۔ لیکن پھر اُس نے مجھے اپنا غلام بنالیا۔ میں نے یہ ذلت اس لیے قبول کرلی کہ اُس کے قریب رہ کر مجھے اُسے قتل کرنے کے مواقع زیادہ مل سکتے تھے۔ کئی بار میں نے اُسے قتل کرنے کا ارادہ کیا مگر ہر بار مُنہ کی کھانی پڑی اور بھیانک اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پونا میں تربینی نے مجھے سڑکوں پر بھیک مانگنے کے لیے مجبور کردیا۔ اُس نے اِنکا کی مدد سے میری ایک آنکھ کی بینائی چھین لی۔ میں نے اسپتال میں خودکشی کی کوشش کی۔ اِنکا نے یہ کوشش ناکام بنادی۔ میں پھر تربینی کا غلام ہوگیا۔ میں ہر مہینے اُس کے حکم پر ایک خوب صورت لڑکی کو قتل کرکے اُس کا خون اِنکا کی بھینٹ کردیتا۔ یہ سلسلہ کئی مہینوں تک چلتا رہا۔ تربینی ایک عیاش آدمی تھا۔ کسی زمانے میں مَیں بھی اُس کی طرح ایسے ہی ہنگاموں میں مست رہا کرتا تھا۔ بہرحال اب وہ زمانہ خواب ہوچکا تھا۔ کسی تبدیلی کی اُمید نہیں تھی لیکن تبدیلی آئی۔ ہوا یہ کہ شیوچرن نامی ایک پنڈت نے اِنکا کے حصول کے لیے جاپ شروع کردیا تھا۔ تربینی بے حد پریشان تھا۔ اُس نے



مجھے اعتماد میں لے کر یہ وعدہ کیا کہ اگر میں شیوچرن کو جاپ منڈل سے باہر نکالنے میں کامیاب ہوگیا تو وہ مجھے غلام کے بجائے دوست بنالے گا اور مجھے اُس کے نصف مال و دولت میں شرکت کا حق ہوگا۔ مجھے تریبنی پر اعتبار تو نہیں تھا لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ میں چل پڑا۔ ارادہ کچھ اور تھا لیکن پھر خیال آیا کہ اگر انکا شیوچرن کے پاس چلی گئی تو نہ معلوم کیا ہو۔ بہتر ہے کہ تریبنی ہی کو آزمایا جائے اور شیوچرن کو منڈل سے باہر لانے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام بہت مشکل تھا مجھے اس کا اندازہ تھا لیکن قسمت نے ایک مہربان پنڈت بدری نرائن کو میری مدد کے لیے بھیج دیا۔ بدری نرائن کوئی پہنچا ہوا پنڈت معلوم ہوتا تھا جب میں سخت کوشش کے باوجود شیوچرن پر فتح نہ پاسکا تو بدری نرائن نے ایک ایسا گر بتایا کہ میں شیوچرن کو مار دیا اور جب میں کامیاب و کامران واپس آیا تو تریبنی نے وعدے کے مطابق مجھے اپنا دوست تسلیم کرلیا اور اُس کی دولت کے دروازے میرے لیے بھی کھل گئے پھر وہی لیل و نہار ہوگئے۔ اس عیش و عشرت میں مجھے نرگس کا خیال آیا۔ میں نے تریبنی سے چند دنوں کے لیے انکا کو مانگنا چاہا لیکن تریبنی نے سختی سے انکار کردیا۔ میں نے جھنجھلا کر سامان باندھا اور کچھ عرصے کے لیے سیر کے بہانے نرگس کے شہر پہنچ گیا۔ نرگس تباہ حال نظر آئی۔ مجھے اُس سے ملنے میں بڑی دشواری پیش آئی۔ جب اصفہانی صاحب کو پتہ چلا کہ میں نرگس سے دوبارہ ربط ضبط قائم کرنا چاہتا ہوں تو انھوں نے کرائے کے غنڈوں سے مجھے بُری طرح پٹوایا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ نرگس کی دوسری شادی ہوچکی تھی لیکن اُس نے پہلے ہی دن طلاق لے لی تھی۔ اُس کے بعد اُس کی صحت گرتی گئی۔ اس شہر میں میرا ایک ہی دوست تھا، رام دیال۔ میں کسی طرح اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے رام دیال کے گھر پہنچا تو اُس نے میری بڑی پزیرائی کی۔ جب میرے اوسان کچھ بحال ہوئے تو میں نے وہاں کے پنڈتوں سے انکا کے حصول کا جاپ پوچھنا چاہا۔ خوش قسمتی سے مجھے بدری نرائن پھر مل گیا اور اُس نے رام پور میں رہنے والے ایک مجذوب برکاتی شاہ کا پتہ بتایا۔ میں نے رام پور پہنچ کر بڑی مشکل سے برکاتی شاہ کو تلاش کیا۔ وہ قلندر شخص میری بات ہی نہیں سنتا تھا لیکن میں بھی دھن کا پکا تھا۔ ننگ پاؤں اور گلیوں کی گندگی میں، تعفن میں، ننگا بھوکا جس طرح ہوسکا اُس کے ساتھ رہا اور اُس کی خدمت کرتا رہا۔ آخر میری خدمت رنگ لائی۔ اُس نے مجھے ایک وظیفہ بتایا اور فوراً میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں نے دریائے کوسی کے قریب ایک ویران قبرستان میں بیٹھ کر چالیس روز تک وہ وظیفہ پڑھا لیکن جب وظیفے کی تکمیل کے بعد بھی انکا میرے سر پر نہیں آئی تو میں جھنجھلا گیا۔ مجھ پر وحشت طاری ہوگئی۔ میں نے بھیک مانگ مانگ کر روپے جمع کیے اور بدری نرائن کے پاس پہنچا۔ بدری نرائن نے میری مشکل پر بہت غور کیا اور مجھے تریبنی کے پاس پہنچنے کا مشورہ دیا۔ اُس نے کہا "وہیں کوئی صورت نکل سکتی ہے۔" چلتے چلتے اُس نے مجھ سے یہ وعدہ بھی لے لیا کہ اگر انکا میرے پاس آگئی تو میں کا ہے گاہے اُسے بدری نرائن کے پاس بھیج دیا کروں گا۔ میں تریبنی داس کے پاس پہنچا۔ مجھے دیکھ کر اُس کے تیور بدل گئے۔ اُس نے پوچھا کہ میں اتنے دنوں کہاں غائب رہا؟ میں نے ٹال مٹول کی لیکن اُسے ایک ایک بات معلوم تھی۔ اُسے صرف میرے برکاتی شاہ سے ملنے اور وظیفہ پڑھنے کا علم نہیں تھا۔ وہ میرے غیر تشفی بخش جوابات سے مشتعل ہوکر تشدد پر اتر آیا۔ مجھے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اُس نے انکا کو حکم دیا کہ وہ مجھے کھینچ کر اُس کے سامنے حاضر کرے۔ اور یہیں سے تریبنی داس کی بدقسمتی کا آغاز ہوا۔ انکا میرے سر پر آئی تو تریبنی داس کے جاپ کا اثر زائل ہوگیا اور میں نے چونکہ برکاتی شاہ کے وظیفے کا ورد کیا تھا اس لیے انکا میری ہوگئی۔ دراصل دیر صرف اس بات کی تھی کہ کب تریبنی انکا کو اپنے سر سے جدا کرے اور کب وہ میرے سر پر آئے۔ انکا نے آنے کے بعد مجھ سے کہا کہ مجھے تریبنی کے پاس ضرور جانا چاہیئے تاکہ زد الطف رہے۔ میں وہاں گیا اور تریبنی یہ سمجھا کہ میں اُس کے حکم ہی پر یہاں آیا ہوں۔ جب میں وہاں پہنچا تو حسبِ دستور وہ ایک حسین لڑکی کوشلیا کے ساتھ داد و دہش میں مصروف تھا۔ میں نے تریبنی سے سخت لہجے میں بات کی۔ وہ میری اس بدلی ہوئی گرج دار آواز پر

حیرت زدہ تھا! اس نے انکا کو آواز دی اور اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، تریبنی نے مجھ پر گولیاں چلائیں اور میں نشانہ بچا بچا گیا۔ اب میری باری تھی، میں تریبنی کے جسم پر سوار ہوگیا۔ کوشلیا اس صورتحال سے سہم گئی تھی۔ اس نے بھاگنا چاہا تو میں نے اسے پکڑلیا۔ پھر انکا نے مجھ سے کہا کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔ اس نے کہا کہ وہ تریبنی کے ہاتھوں کوشلیا کو قتل کرائے گی اور رنگے ہاتھوں تریبنی کو گرفتار کرادے گی۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ جب میں ہوٹل پہنچا تو میں نے بے چینی سے انکا کا انتظار شروع کردیا جو کوشلیا کا خون پینے کے لیے مجھ سے جدا ہوگئی تھی۔ مجھے انکا کا انتظار تھا۔ آنے والا کل میرے لیے بہت اہم تھا وہ کل جو میری قسمت بدلنے والا تھا۔ میرے پاس میری انکا آنے والی تھی۔

اور وہ آگئی۔ میں جلد ہی اس کی پراسرار طاقتوں کے ذریعے پرانا جمیل احمد خاں ہوگیا۔ کوشلیا کے قتل کے الزام میں تریبنی گرفتار کرلیا گیا لیکن میں نے انکا سے یہ کہہ کر اُسے بری کرادیا کہ یہ تو کوئی خاص سزا نہیں ہوئی۔ تریبنی کو تو اس سے زیادہ سزا ملنی چاہئیں۔ تریبنی کی سزا کا فیصلہ میں خود کروں گا۔ پھر میں نے ایسا کیا کہ تریبنی کے ایک ملازم نے انکا کے اشارے پر اقبالِ جرم کرلیا۔ جب معاملے کی چھان بین ہوئی تو میرا نام بھی آیا۔ اس لیے کہ میں واردات سے تھوڑی دیر قبل وہاں موجود تھا۔ پولیس نے ضروری استفسار کے بعد مجھے آزادانہ گھومنے کا حکم دیا۔ اب رکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ دوسری طرف میں جلد از جلد اپنی نرگس سے ملنے اور اُسے انکا کی بازیابی کا مژدہ سنانے کے لیے بے چین تھا۔ میں نے اس تکلیف دہ عرصے میں دل بہلانے کے لیے ریس کورس اور کلب جانا شروع کردیا۔ وہیں مجھے ایک حسین اور مالدار لڑکی رتنا کلدیپ ملی۔ کلدیپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے میں نے انکا کے ذریعے کچھ ناقابلِ یقین قسم کے تماشے کیے۔ ریس میں بھی کلدیپ کے سامنے میرا منتخب گھوڑا بار بار جیت گیا۔ وہ کلب کی عام لڑکیوں سے مختلف تھی۔ عادات و اطوار میں شائستہ اور نرگس سے مشابہ تھی۔ چنانچہ اپنی کوشش اور انکا کی مسلسل ترغیب کے باوجود میں اسے آلودہ نہ کرسکا۔ ہم دونوں نے کئی شامیں ایک ساتھ گزاریں۔ ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔ میں نے اُس کیلیے دل میں کچھ اور ہی جذبے محسوس کیے۔ آخر ایک دن میں تریبنی کے پاس گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ گڑگڑانے لگا۔ میں نے خوب اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور انکا سے کہہ کر خود اسی کے ہاتھوں اس کے اپنے مکان میں آگ لگوادی۔ اس کا سارا اثاثہ اور جائداد جل گئی۔ وہ اپنی مسخ اور جلی ہوئی شکل کے ساتھ اسپتال میں داخل کردیا گیا۔ مزید سزا کے لیے میں نے کوئی اور موقع مناسب سمجھا۔ کوشلیا کے قتل کا معاملہ سنگین ہوگیا تھا۔ انکا نے مبینہ قاتل کو جیل سے فرار کرکے کیس کو اور مشتبہ کردیا تھا۔ حالات نے چودہ روز میں بہت سے رُخ بدلے اور آخر مجھے پولیس سے پیچھا چھوڑنے کی اجازت مل گئی۔ کلدیپ نے جلد آنے کا وعدہ لے کر مجھے رخصت کیا۔ پہلے میں بمبئی گیا اور وہاں ایک ہفتے قیام کے دوران بہت سارا روپیہ خرچ کرکے ایک کوٹھی خریدلی۔ پھر میں نرگس کے شہر پہنچا۔ وہاں تین چار روز کے اندر اندر انکا نے قیامتیں برپا کردیں۔ اصفہانی کی تمام تجارت اور ساکھ آناً فاناً تباہ ہوگئی۔ اُس سے رشوت لینے کے الزام میں کئی افسر معطل ہوگئے۔ اخبارات میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا اور میں اسی افراتفری کے وقت میں نرگس کو لینے اصفہانی کی کوٹھی پر پہنچا اور رکانی تم کلامی کے بعد اپنی نرگس کو لے آیا۔ وہ نحیف و نزار ہوگئی تھی۔ غموں نے اس کی شادابی چھین لی تھی۔ اب میں جلد از جلد یہاں سے روانہ ہوجانا چاہتا تھا اور رخصت ہونے سے پہلے میں رام دیال سے ضرور ملنا چاہتا تھا۔ جب میں اس کے گھر میں داخل ہوا تو اس کی خوبصورت بیوی شیاما کو شسندر لال نامی ایک شخص سے راز و نیاز کرنے میں مصروف پایا۔ شیاما نے یہ راز چھپانے کے لیے خود کو میرے سامنے پیش کرنے کی جسارت کی۔ اسے تنبیہ کرکے چلا آیا۔ اب میں روانگی کے لیے تیار تھا کہ بالکل غیر متوقع طور پر بدری نرائن آگیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کیوں آیا ہے۔ میں نے تشویش سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ معنی خیز مسکراہٹ لیے مجھے گھور رہا تھا۔

بدری نرائن نے حسبِ توقع اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد عارضی طور پر انکا کو مجھ سے طلب کیا۔ میں نے اسے ٹالنا چاہا تو وہ بھپر گیا اور دھمکیوں پر اُتر آیا۔ پھر یہ کہہ کر چلا گیا کہ تین دن بعد پورنماشی کی رات کو مرگھٹ پر وہ میرا اور انکا کا انتظار کرے گا۔ اگر میں نے اپنے وعدے سے پھرنے کی کوشش کی تو تباہی میرا مقدر ہوگی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے انکا سے مشورہ کیا۔ اس نے بتایا کہ "بدری نرائن بہت کینہ پرور پنڈت ہے، وہ کچھ طاقتیں حاصل کرنے کے لیے میری مدد کا طالب ہے۔" انکا بھی خاصی فکرمند نظر آتی تھی۔ وہ حالات کا جائزہ لینے کے لیے میرے سر سے اُتر گئی اور جب لوٹی تو اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں مرگھٹ ضرور جاؤں۔ چاروناچار مجھے مرگھٹ جانا پڑا، وہ ایک ہولناک منظر تھا۔ بدری نرائن میرے سامنے کھڑا تھا، وہ اس بات پر خوش تھا کہ میں وقت پر آگیا۔ لیکن جب میں نے اس سے بدکلامی کی تو وہ اُکھڑ گیا اور مجھ پر جادو منتر آزمانے لگا۔ انکا مجھے ہدایتیں دے رہی تھی جو میں بدری نرائن کو منتقل کررہا تھا۔ بدری نرائن کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے سامنے انکا کی شکل کی ایک بونی عورت سندری نمودار ہوئی ہے جو بڑھتے بڑھتے قدآور ہوگئی۔ اس نے مجھ پر وار کیا، اسی وقت انکا میرے سر سے رینگ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سندری جل کر راکھ ہوگئی اور بدری نرائن دہاڑنے لگا پھر وہاں سے بھاگ گیا۔ اس آفت سے نمٹنے کے بعد میں ہوٹل واپس آگیا اور رام دیال اور شیاما میں صلح کراکے کشمیر روانہ ہوگیا۔ وہاں ایک خوبصورت بنگلا کرائے پر لے کر نرگس کی تیمارداری میں مصروف ہوگیا۔ نرگس کی صحتیابی پر میں نے ایک جشن منعقد کیا جس میں علاقے کے سبھی لوگ شریک ہوئے۔ رقص و سرود کے اس ہنگامے میں انکا نے میری توجہ ایک نوجوان شخص راجکمار کی طرف مبذول کرائی اور بتایا کہ وہ کلدیپ کا ہونے والا منگیتر ہے۔ نرگس کی حصولیابی کے بعد سے کلدیپ مجھے یاد ہی نہیں آئی تھی۔ انکا نے اسکا ذکر چھیڑ کر یادیں تازہ کردیں، انکا نے مجھے یہ بھی بتایا کہ کلدیپ کی منگنی ہونے والی ہے مگر وہ ابھی تک میری محبت میں سرشار ہے اور اس شادی پر راضی نہیں۔ دو روز بعد کلدیپ اپنے خاندان کے ہمراہ کشمیر پہنچ گئی۔ میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ انکا کے ذہن میں ایک خطرناک منصوبہ تھا۔ وہ راجکمار کو راستے سے

ہٹا کر اسے اپنی غذا کے طور پر حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ایک دن دوپہر کو جب میں نرگس کے ساتھ زندگی کے حسین ترین لمحے گزار رہا تھا تو انکا نے مجھے چونکا دیا اور کہا کہ مجھے فوراً چلنا چاہیئے، راجکمار کلدیپ کو لے کر ترائی کی سمت گیا ہے۔ میں نے نرگس کو چھوڑا اور تیار ہو کر جلدی سے روانہ ہو گیا۔ انکا مجھے آندھی اور طوفان کی طرح وہاں لے گئی جہاں کلدیپ اور راجکمار موجود تھے۔ میں نے ایک درخت کی آڑ لے لی اور ان کی ڈرامائی گفتگو سننے لگا۔ راجکمار محبت کے بڑے بڑے دعوے کر رہا تھا، کلدیپ جھجک رہی تھی۔ ان کی گفتگو شائستگی سے بدکلامی میں تبدیل ہو گئی۔ جب بات زیادہ بڑھی تو مجھے انکا نے اشارہ کیا۔ میں فوراً منظر میں کود گیا، کلدیپ مجھے یہاں دیکھ کر بھونچکی رہ گئی اور میرے سینے سے لگ گئی۔ راج کمار یہ دیکھ کر سخت طیش میں آ گیا اور مجھے گالیاں دینے لگا۔ عین اسی وقت انکا میرے سر سے اُتر گئی اور میں نے راجکمار سے کہا کہ وہ اپنی جیب سے ریوالور نکال کر خودکشی کر لے۔ راجکمار نے ایسا ہی کیا، کیونکہ انکا اب اس کے سر پر چڑھ گئی تھی۔ میں وہاں سے کلدیپ کو لے کر چلا آیا۔ ہم دونوں جھیل کے قریب بیٹھ کر ایک دوسرے میں گم ہو گئے کلدیپ مجھ پر وارفتہ ہوئی جا رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا اس شدید محبت کا انجام کتنا ہولناک ہو گا۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ انکا نے اچانک آ کر مجھے بتایا کہ بدری نرائن اپنا وار کر گیا۔ کلدیپ کو وہیں چھوڑ کر میں بے تحاشا گھر کی طرف بھاگا۔ وہاں میں نے جو منظر دیکھا اسے لکھنے کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ نرگس مر چکی تھی خون بہہ رہا تھا اور اس کے بدن میں بے شمار زخم ہو رہے تھے انکا بدری نرائن کی تلاش میں میرے سر سے جا چکی تھی

میری محبوب بیوی نرگس ایک لاش کی صورت میں میرے سامنے پڑی تھی۔ مجھ پر دُکھوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میں دیوانگی میں اپنے منہ پر طمانچے مارنے لگا۔ میں نے نرگس کی لاش سے لپٹ کر عہد کیا کہ جب تک اس کے قاتل سے بھیانک انتقام نہیں لے لوں گا چین سے نہ بیٹھوں گا۔ انکا نے یقین دلایا تھا کہ مجھ پر راجکمار کے قتل کا الزام عائد نہیں ہو گا لیکن مجھے راجکمار اور نرگس کے دُہرے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس نے زبردستی کلدیپ سے میرا نام اگلوایا تھا۔ نرگس کی موت، انکا کی غیر موجودگی اور پولیس کی درندگی نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ مجھ میں پولیس کی سختیاں جھیلنے کی تاب نہ رہی اور میں نے راجکمار کے قتل کا اعتراف کر لیا لیکن پولیس اپنی تمام تر بے رحمی کے باوجود مجھ سے میری نرگس کے قتل کا جھوٹا اعتراف نہ کرا سکی۔ نرگس کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد یہیں ایک قبرستان میں دفن کر دی گئی تھی۔ میں اپنی نرگس کا آخری دیدار تک نہ کر سکا۔ حوالات میں مجھ سے پوچھ گچھ کے دوران انکا تھانے کے انچارج پرمود کے سر پر پہنچ گئی۔ پرمود نے ایس پی سے گستاخانہ بحث و تکرار کی اور مشتعل ہو کر اُسے گولی مار دی۔ ایک سپاہی ڈپٹی کمشنر کو فون کرنے دوڑا، تو دروازے پر کھڑے ہوئے سنتری نے اُسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام سپاہی ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ میں اس بھگدڑ میں انکا کا اشارہ پا کر تھانے سے فرار ہو گیا۔ عیّار بدری نرائن انکا کو جل دے کر بچ نکلا تھا اور کلکتے پہنچ کر کالی کے مندر میں جا چھپا تھا۔ انکا اپنی پُراسرار قوتوں کے باوجود کالی کی مہان شکتی کے آگے بے بس تھی مگر مجھ پر انتقام کا جنون سوار تھا۔ میں ایک آندھی اور طوفان کی طرح سفر کرتا ہوا کلکتے پہنچا اور شدید غیظ و غضب کے عالم میں کالی کے مندر کی طرف چل پڑا۔ میں انکا کے منع کرنے اور ڈرانے کے باوجود سخت ترین اشتعال کے عالم میں مندر کے چھوٹے پجاری بنسی لال کو قتل کر ڈالا لیکن میرا کلیجا ٹھنڈا نہ ہوا۔ انکا نے میری خطرناک حالت دیکھ کر اپنی پُراسرار قوت کے ذریعے میری دماغی صلاحیتیں اپنے قابو میں کر لیں۔ میں یادداشت کھو بیٹھا اور پورے ایک سال تک شہروں شہروں بھٹکتا پھرا۔ پھر جب مجھے ہوش آیا تو میں ترائی میں تھا اور کلدیپ اپنی تمام تر خوبصورتی اور محبتوں کے ساتھ میرے سامنے موجود تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح مجھے تلاش کرتی ہوئی یہاں پہنچی تھی۔ بدری نرائن ابھی تک کالی کے مندر میں تھا۔ ایک دن میں تربینی داس کو ٹھکانے لگانے کے لیے پہنچا۔ وہ ڈھیٹ دوبارہ ٹھاٹ کی زندگی بسر کرنے لگا تھا۔ میرا خون کھول اُٹھا۔ اُس نے جان بچانے کے لیے چاپلوسی سے میری منت سماجت کی اور مجھے بدری نرائن سے نمٹنے کے لیے پریتم لال سے مدد لینے کا مشورہ دیا۔ پریتم لال ایک زبردست شکتی والا مہان پنڈت تھا۔ میں کلدیپ اور انکا کے ساتھ پریتم لال سے ملنے کے لیے دربدر کی خاک چھانتا ہوا میسور کی پہاڑیوں میں پہنچا۔ یہ بڑی پُراسرار جگہ تھی۔ انکا پریتم لال کی مشغولیت کا کھوج لگانے کے لیے چلی گئی۔ میں تھکن سے چُور تھا کہ یکایک پانی کے جھرنے اور کسی لڑکی کے بھجن گانے کی آواز کانوں میں رس گھولنے لگی۔ میں کلدیپ کو چھوڑ کر آگے چلا۔ بڑا ہوشربا جلوہ تھا۔ پریتم لال کی حسین اور نوخیز پجارن مالا سراپا عریاں نہا رہی تھی۔ میں از خود رفتگی میں اُس کی طرف بڑھا۔ وہ خوفزدہ ہو کر چیخی اور رحم رحم پکارنے لگی۔ میں اور بے رحم ہو گیا میری دست درازی پر وہ دہشت سے رونے اور چلّانے لگی۔ اُسی وقت انکا عجیب دہشت زدہ انداز میں میرے سر پر آ گئی۔ اُس نے چھپاوے سے بتایا کہ پریتم لال اپنے جاپ منڈل سے باہر آ رہا ہے۔ پھر میں نے دیکھا، ہڈیوں کا ایک پنجر پہاڑی سے نشیب کی طرف آ رہا تھا۔ انکا نے کہا۔ تم نے پریتم لال کی داسی کو چھیڑ کر بہت بُرا کیا جمیل۔ وہ عظیم قوتوں کا مالک ہے۔ اُس کے سامنے مجھے بھی بے بس ہونا پڑے گا۔"

پریتم لال کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ جب وہ میرے سامنے آیا تو اُس کی آنکھیں شعلے اُگل رہی تھیں۔ اس کا منحنی لیکن پُرجلال ڈھانچا غصّے سے سراپا کانپ رہا تھا۔ اس کے لہجے کی گھن گرج سے میں دہشت زدہ ہو گیا۔ مالا نے اُس کے پہلو سے لپٹ کر میری دست درازیوں کے بارے میں رو رو کے بتایا۔ انکا مجھ سے کچھ زیادہ ہی خوفزدہ تھی۔ اتنی دیر میں کلدیپ بھی مجھے تلاش کرتے کرتے اِدھر آ گئی تھی۔ میں نے پریتم لال سے دست بستہ معافی مانگی اور اُس کے قدموں میں گر گیا۔ انکا نے مجھے اُسی وقت یہی ہدایت کی تھی لیکن پریتم لال نے مجھے معاف نہیں کیا۔ مالا کلکتے کے ایک بڑے تاجر کی لڑکی تھی جس کا باپ اُسے ساتھ لے کر پریتم لال کے پاس آیا تھا۔ مالا کو یہ جگہ بہت پسند آئی اور وہ یہیں رہ پڑی۔ پھر اُس نے تنہا پریتم لال کی ایک بیٹی کی طرح خدمت شروع کر دی۔ بوڑھا سادھو اُسے بہت چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مالا کے ساتھ میری زیادتی پر حد درجے برہم ہو گیا۔ اس علاقے میں دُور دُور تک آدمی کا نشان نہیں تھا۔ پریتم لال برسوں سے یہاں تنہا پوجا پاٹ کر رہا تھا۔ اس جگہ اُس کی غیر معمولی طاقت کی حکمرانی تھی اور انکا بھی یہاں آ کر بے بس ہو گئی تھی۔ غرضیکہ میری سزاؤں کا دور شروع ہُوا۔ پریتم لال نے مجھے ایسی سزائیں دیں کہ میں بالکل مجہول و معطل ہو کر رہ گیا۔ میں اُس کی کٹیا کے سامنے پڑا رہتا تھا اور کوئی میرا پُرسان حال نہ تھا۔ کلدیپ پریتم لال کی داسی بن چکی تھی اور مجھ سے بات نہیں کرتی تھی۔ پریتم لال نے انکا کو مجبور کیا کہ اس بار وہ اپنی غذا کے لیے میرا خون پیے۔ انکا کو چار و ناچار میرا خون پینا پڑا۔ یہ ایک دلخراش اور دل دہلا دینے والی کہانی ہے۔ بہرحال وہ دن گزر گئے۔ پریتم لال کو بھی ایک دن اس دُنیا سے جانا تھا۔ جب اُس کا وقتِ آخر آیا تو اُس نے مجھے طلب کیا اور حیرت انگیز طور پر مالا کو میرے سپرد کر دیا۔ اُس نے کنیا دان کے ساتھ مجھے کچھ شکتی بھی دان کی۔ مالا کو حاصل کرنے کا مطلب تھا کلدیپ سے دستبرداری لیکن کلدیپ نے مجھے خود اس بات پر مجبور کیا کہ میں پریتم لال کی بات مان لوں۔ کلدیپ ایک جوگن بن گئی تھی۔ پریتم لال مر گیا اور میں کلدیپ کو تنہا چھوڑ کر مالا کے ساتھ چلا آیا۔ پُونا آ کر میں نے سب سے پہلے تربینی کو سمجھا۔ میں نے اُنگلیاں گاڑ کر اُس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکال لیں اور خطرناک ضربات سے اُس کے گھٹنے چُور کر دیے۔ اُسے ختم کر کے میں نے پنڈت بدری نرائن سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ بدری نرائن، جو نرگس کو قتل کر کے انکا کے خوف سے کالی کے مندر میں روپوش ہو گیا تھا۔ میں مالا کے ساتھ بدری نرائن کو جہنم رسید کرنے اور اُس کے خون سے اپنی پیاس بجھانے کے لیے کلکتے روانہ ہوا۔ مالا نے مجھے منع کیا کہ میں کلکتے نہ جاؤں مگر بدری نرائن کے لیے میرا وہاں جانا ضروری تھا۔ مالا ایک حسین لڑکی تو تھی ہی وہ ایک اچھی بیوی بھی ثابت ہو رہی تھی۔ ٹرین میں کئی دلچسپ باتیں ظہور پذیر ہوئیں۔ تین بدمعاشوں نے مجھے گھیر لیا اور مالا کو اغوا کرنا چاہا۔ میں نے پہلی بار پریتم لال کی دان کی ہوئی شکتی آزمائی اور انکا کی مدد کے ساتھ بہت بھیانک انداز میں انہیں چلتی گاڑی سے چھلانگ لگانے پر مجبور کر دیا۔ کلکتے کے اس سفر میں عرصہ دراز کے بعد بالکل اچانک میری ملاقات اپنے سگے چچا خورشید احمد خاں سے ہو گئی۔ برسوں کے بچھڑے ہوئے چچا بھتیجے ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ چچا کی جسمانی اور مالی حالت خستہ تھی۔ وہ بھی اپنے آقا ایک ہندو بنیے کے کسی کام سے سفر کر رہے تھے۔ وہ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ باقی سفر انہوں نے میرے ساتھ گزارا۔ کلکتے کے ہوٹل میں بھی وہ میرے ساتھ ٹھیرے۔ دوسری صبح میں آندھی اور طوفان کی طرح اس کام کے لیے روانہ ہو گیا جو میری زندگی کا مقصد بن گیا تھا۔ یعنی کہ بدری نرائن کی موت ــــ میں کالی کے مندر کی طرف چل پڑا ـــــــــــــــــــــــ

اب آگے پڑھیے

مجھے یقین تھا اس بار بدری نرائن خود کو میرے عتاب سے نہیں بچا سکے گا۔ میرے پاس ایک طرف میری عزیزہ انکا تھی اور دوسری طرف پریتم لال کی دان کی ہوئی شکتی۔ کسی زمانے میں تربینی نے انکا کو مجھ سے چھین کر مجھے دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب بدری نرائن نے میری زندگی، نرگس کو چھین کر میرا قرار و سکون چھین لیا ہے۔ انکا مجھے واپس مل گئی۔ کھوئی ہوئی عزت و دولت بھی، لیکن نرگس کی واپسی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ وہ ایسی جگہ پہنچ گئی تھی جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ تربینی سے میں بخوبی نمٹ چکا تھا اب بدری نرائن کی باری تھی، جسے میں نے پہلے بھی ختم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام ہو گیا تھا۔ وہ بدمعاش کالی کے مندر میں چھپ کر بیٹھ گیا تھا اور میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد اسے وہاں سے نکالنا اور اپنی آتشِ انتقام سرد کرنا رہ گیا تھا۔ سامنے کالی کا مندر تھا جہاں میں پہلے بھی آ چکا تھا جیسے جیسے مندر کا فاصلہ گھٹ رہا تھا، میرے خون کی حدت تیز ہوتی جاتی تھی۔ انکا میرے سر پر بیٹھی کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ میں مندر کے قریب پہنچا تو انکا اپنے خیالات سے چونک کر بولی "جمیل میں کالی کے مندر میں نہیں جا سکتی۔ یہیں رک کر تمہارا انتظار کروں گی۔ تم ہر قدم محتاط ہو کر اٹھانا۔ بس کسی طرح اسے باہر لانے میں کامیاب ہو جاؤ۔ یاد رکھنا اندر داخل ہونے سے بہتر ہے کہ تم اسے باہر لے آؤ۔ کاش میں تمہارے ساتھ چل سکتی۔"

"تم مطمئن رہو انکا۔ اس بار پریتم لال کی آتما میرے ساتھ ہے۔ مجھے اس کا آشیرواد حاصل ہے۔ میرا خیال ہے میں مندر میں داخل ہو جاؤں گا۔" میں نے اعتماد سے کہا۔

"نہیں نہیں، تم مندر میں صرف مجبور ہو کر داخل ہو گے۔ یہ کالی کا مندر ہے اور بدری نرائن کالی کا سیوک ہے۔" انکا نے اضطراب سے کہا۔

جب میں مندر کی عمارت کے بالکل نزدیک پہنچ گیا تو انکا چپ چاپ میرے سر سے اتر گئی اور چلتے چلتے مجھے محتاط رہنے کی تلقین کرتی گئی۔ میں خود کو پوری طرح تیار کر کے آگے بڑھنے لگا۔ کچھ سینہ کشادہ کیے، کچھ نتھنے پھلاتے جیسے کوئی پہلوان اکھاڑے میں داخل ہو۔ اس وقت میرے بدن پر ایک دھوتی اور کرتا تھا۔ مندر میں آنے جانے والے پجاری اور پجارنیں میری جانب کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے، میں ان کے درمیان سے ہو کر آگے بڑھتا رہا۔ میں نے کسی کو کوئی اہمیت نہیں دی اور دیتا بھی کیسے جبکہ میرے ارادے کسی بگڑے ہوئے شیر کے سے تھے۔

سیڑھیاں عبور کر کے میں اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔ جہاں ایک کشادہ احاطہ تھا۔ احاطے کے درمیان سبزہ تھا جہاں پنڈت پجاری اور خوبصورت پجارنیں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سامنے ایک محرابی دروازے کے اندر سے گھنٹیوں اور بھجن گانے کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے احاطے کے چاروں طرف دیکھا لیکن بدری نرائن کہیں نظر نہیں آیا۔ میں اس جانب بڑھا جہاں سے بھجن کی آوازیں آ رہی تھیں۔ محرابی دروازے کے قریب ایک دلکش داسی نے ہاتھ باندھ کر مجھے پرنام کیا۔ وہ نظریں نیچی کیے کترا کر جانے لگی تو میں نے بلاتکلف ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی تھام لی۔ وہ سٹپٹائی لیکن میری آنکھوں میں سنجیدگی دیکھ کر سوالی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا "مندر کا بڑا پجاری اس سمے کہاں ملے گا؟"

"تلسی داس مہاراج اس سمے اپنی کٹیا میں ہوں گے۔" داسی نے ڈنڈوت کرتے ہوئے جواب دیا۔ پھر میرے اصرار پر بڑے پجاری کی کٹیا تک میری رہنمائی بھی کر دی۔ جو احاطے کے مغربی حصے میں واقع تھی۔ کٹیا کے اندر سے گیان دھیان کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تلسی داس اس وقت دوسرے پنڈتوں پجاریوں کو درس دے رہا تھا۔ میں نے فوری طور پر اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ داسی مجھے کٹیا کے قریب چھوڑ کر جانے لگی تو میں نے کچھ سوچ کر اسے دوبارہ اور لگاوٹ بھری نظروں سے اس کے حسین سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "سندری تم نے مجھے اپنا شبھ نام نہیں بتایا؟"

"میرا نام بسنتی ہے۔" داسی نے میری آنکھوں کی گرمی سے پگھلتے ہوئے شرما کر جواب دیا۔ میرا ذہن اس وقت صرف بدری نرائن میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے داسی کے شوخی اور شرم کے دلفریب انداز سے مصنوعی طور پر متاثر ہو کر کہا "تمہارا نام بھی تمہاری طرح سندر ہے۔"

"کیوں بناتے ہو مہاراج۔" داسی چھوئی موئی کی طرح اپنے وجود میں سمٹتے ہوئے بولی۔

"بسنتی، تم یہاں کب سے آئیں؟" میں نے سرگوشی کی۔

"مجھے چار سال ہو گئے۔" اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

"چار سال؟" میں نے متعجب ہو کر کہا۔ "اور تمہارا یہاں دل لگ گیا؟"

"ہاں" اس نے کسی قدر اُداسی سے کہا "یہاں نمش شانت رہتا ہے"
"خاک رہتا ہے۔ تمھاری جگہ یہ مندر نہیں۔ تمھیں تو کسی
محل میں ہونا چاہیے۔"
"میں یہاں بہت ٹھیک ہوں۔ سنسار بہت بُرا ہے مہاراج۔"
میں سمجھ گیا وہ دکھی ہے اور یہاں خوش نہیں ہے۔ میں نے اس
سے محبت بھری باتیں کیں تو وہ مجھ سے خاصی متاثر ہوگئی۔ اب موقع
تھا کہ میں اس سے اپنے مطلب کی بات کروں۔ میں نے رازداری سے کہا
"اے بسنتی سنو۔ کیا تم میرا ایک کام کرو گی؟"
"کہو مہاراج۔" بسنتی نے اپنی دراز پلکیں اُٹھا کر نگاہیں میرے
چہرے کی طرف جما دیں۔ بسنتی حقیقتاً توجہ کے لائق تھی مگر میں جذباتی طور
پر اس کی جانب مائل نہ ہوسکا۔ سنجیدگی سے بولا۔
"مجھے بدری نرائن مہاراج سے ملنا ہے، ایک پجاری نے مجھے بتایا
تھا کہ بدری نرائن مجھے کالی کے مندر میں مل سکتا ہے۔ کیا تم بدری نرائن کو
جانتی ہو؟ میں صرف اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"
جواب میں بسنتی نے مجھے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا میری باتیں
سُن کر اس کا چہرہ اچانک زرد ہوگیا۔ اس کی ساری شوخی ایک پل میں
غائب ہوگئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں اپنے دائیں بائیں دیکھا
پھر خوفزدہ لہجے میں بولی۔ "تمھارا نام جمیل احمد خاں تو نہیں؟"
میں جواب دیتے ہوئے جھجکا مگر میں نے ہمت سے جواب دیا "میرا نام
جمیل احمد خاں ہے۔ کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ مگر بسنتی پہلے سے
زیادہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی "ترنت بھاگ جاؤ یہاں سے کسی نے تمھیں
پہچان لیا تو تمھارے ساتھ ساتھ میری بھی شامت آجائے گی۔"
"تم کوئی چنتا نہ کرو بسنتی میرے ہوتے ہوئے کوئی تمھاری اور (سمت)
نظر نہیں اٹھا سکتا۔ یہ میرا وچن ہے۔" میں نے بسنتی کو دلاسا دیتے ہوئے
کہا مجھے یقین ہو چلا تھا کہ بسنتی بدری نرائن کے بارے میں بہت کچھ جانتی
ہے اور وہ اسے بہانے سے باہر لاسکتی ہے میں نے اُسے دوبارہ آمادہ کرنا چاہا
"بسنتی اگر تم کسی طرح بدری نرائن کو باہر لے آؤ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو مجھے
اس کے پاس پہنچا دو۔ پھر میں تمھاری ہر آشا پوری کروں گا۔ تم شاید نہیں
جانتیں کہ میں مہان شکتی کا مالک ہوں۔ انکا دیوی بھی میرے پاس ہے
میں تمھاری رکشا کروں گا۔"

بسنتی کسی سہمی ہوئی ہرنی کی طرح مجھے پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھ رہی
تھی۔ اُس نے کچھ کہنے کی خاطر اپنے ہونٹ کھولے پھر تیزی سے پلٹ کر بھاگی
اور میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اُس کا یوں اچانک بوکھلا کر بھاگ جانا
بلاوجہ نہیں ہوسکتا تھا۔ گویا مندر میں میرے نام کی خاصی دھوم تھی۔ سب کو
سارا قصہ معلوم تھا۔ اس سے پہلے میں ایک پجاری کو موت کے منہ میں دھکیل
چکا تھا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس سے رابطہ قائم کروں۔ میں نے
پلٹ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ تلسی داس کی کوٹھری کے باہر ایک دیو قامت پجاری
کھڑا مجھے کینہ توز انداز سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے انکا کی نصیحت یاد آئی۔ اس نے
مجھے محتاط رہنے کی تاکید کی تھی۔ بسنتی کا خوفزدہ ہو کر بھاگنا اور اس بھاری
تن و توش کے پجاری کا مجھے یوں نفرت انگیز نظروں سے گھورنا خالی از علت
نہیں ہوسکتا تھا۔ یقیناً میرے بارے میں کالی مندر کے پنڈتوں پجاریوں نے
اپنے چیلوں اور پجارنوں کو بہت کچھ بتا رکھا تھا۔ غالباً انھیں توقع تھی کہ
میں دوبارہ بھی ضرور آؤں گا۔ یہ باتیں سوچ کر میری آنکھوں میں خون اُتر
آیا۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ بدری نرائن نرگس کا کمینہ قاتل مندر میں کسی ایسی جگہ
روپوش ہے جہاں تک میری رسائی مشکل ہی سے ہوسکتی ہے اب اُسے میرے
عتاب سے بچانے کے لیے ہر شخص تیار تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میرا مقابلہ
صرف بدری نرائن سے نہیں پورے مندر سے ہے، ادھر میں اب باز آنے والا
نہیں تھا تو پھر جو کچھ ہونا ہے آج ہی ہو جائے میں یہ طے کر کے نکلا تھا۔
جمیل احمد خاں کی زندگی میں بہت انقلابات آئے۔ ایک معرکہ یہ بھی سہی مندر
کے پجاری شاید نہیں جانتے تھے کہ ان کے سامنے اب وہ پرانا جمیل احمد خاں نہیں،
میں چاہتا تھا کہ وہ سیدھی طرح بدری نرائن کو میرے حوالے کر دیں۔ میں نے خود
کو تیار کر کے گھورنے والے پنڈت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ وہ
میرے قریب آیا اور خشک آواز میں بولا "مہاشے تم کوئی نئے پجاری
دکھائی دیتے ہو۔ تمھارا شبھ نام؟"

"کیوں، کیا اس مندر میں کسی نئے پجاری کا آنا بند ہے؟" میں
نے خالص کسی بڑے پنڈت کے لہجے میں کہا "مجھے دکھائی دیتا ہے کہ اس سمے
تم کچھ بیاکل بھی ہو۔ کارن؟"
"زیادہ چتر بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں نے تمھارا نام پوچھا تھا" پجاری
کی کشادہ پیشانی پر بے شمار آڑی ترچھی سلوٹیں اُبھر آئیں۔

''جاؤ اپنا کام کرو۔ مجھے تم سے کوئی غرض نہیں۔ میں ہر پجاری کو نہیں چھیڑنا چاہتا۔'' میں نے اس بار بھی بگڑ کر کہا۔

''تم مجھے چال ڈھال سے کوئی پجاری نہیں دکھائی پڑتے۔'' پجاری نے مشتبہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔'' کالی کے چرنوں میں تمھیں آنے کی جُرأت کیسے ہوئی۔ یہاں کیول وہی منش آسکتا ہے جس کے من میں کوئی کھوٹ نہ ہو۔ تم شاید غلط راستے پر آ گئے ہو تمھیں اپنا نام بتانا ہی پڑے گا مہاشے تم تلسی داس کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے۔''

''اوہ۔ تو تم ہو تلسی داس۔ اس مندر کے سب سے بڑے پجاری'' میں نے سانس کھینچ کر بے نیازی سے کہا'' حیرت ہے اتنا بڑا پجاری میرا نام نہیں جان سکا۔ بہرحال تلسی داس سنو۔ میں یہاں جس مقصد سے آیا ہوں تم اس سے اچھی طرح واقف ہو۔ میں سمے برباد نہیں کروں گا۔ میری زبان سے میرا نام سننا چاہتے ہو تو سنو۔ میرا نام جمیل احمد خاں ہے۔ یہاں میں اس پاپی اور اپراڈھی بڑی نراٹن کی تلاش میں آیا ہوں جسے تم لوگوں نے چھپا رکھا ہے۔ بات بڑھانے سے کوئی لابھ نہیں ہوگا۔ اتنا دھیان میں رکھنا کہ اب کوئی شکتی اس کمینے بڑی نراٹن کو میرے ہاتھوں سے نہیں بچا سکتی۔ تم بھی نہیں۔ حالانکہ تم مجھے کچھ شکتی والے دکھائی دیتے ہو۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ تم سیدھی طرح اُسے میرے حوالے کردو۔''

''مورکھ'' تلسی داس کسی گرگٹ کی طرح رنگ بدل کر کرخت لہجے میں بولا۔'' یہ کالی کا مندر ہے۔ یہاں کیول (صرف) دیوی کی شکتی کا راج ہے۔ اس پوتر استھان پر آکر تو نے دیوی کا اپمان کیا ہے۔ کالی کے مندر میں آج تک کوئی مُسلا نہیں آسکا۔ تو نے گھور پاپ کیا ہے۔ چلا جا یہاں سے۔ چلا جا۔ اگر مندر کے دوسرے پنڈت پجاریوں کو تیری جات کا پتہ چل گیا تو وہ تجھے بھسم کر دیں گے۔ میں تجھے اوسر (موقع) دیتا ہوں، جا یہاں سے چلا جا۔''

''تلسی داس۔'' میں نے سرد آواز میں کہا'' مجھے تعجب ہے کہ تم اس بڑے مندر کے مہان پجاری کیسے ہو گئے۔ تمھیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ میں تنہا نہیں آیا۔ میرے ساتھ نہ جانے کتنے بیر ہیں اور کتنی شکتی ہے اگر تمھیں اپنا جیون پیارا ہے تو سیدھی طرح بتا دو کہ تم لوگوں نے بڑی نراٹن کو کہاں چھپایا ہے؟ انکار کیا تو تمھارا انجام بھی خراب ہوگا تم دیکھ چکے ہو کہ اس سے پہلے میں یہاں کے ایک پجاری کو موت کے گھاٹ اُتار چکا ہوں۔''

''تو... تو... کالی ماتی کے مندر کے مہان پجاری تلسی داس کو دھمکا رہا ہے پاپی ٹھہر جا۔ میں ابھی تجھے مزہ چکھاتا ہوں۔'' تلسی داس نے کانپتے ہوئے کہا۔

''میں بڑی نراٹن کو چاہتا ہوں اسے میرے حوالے کردو میں پھر تم سے کہتا ہوں۔ بات زیادہ نہ بڑھاؤ۔''

''میں اُسے تیرے حوالے نہیں کرسکتا۔ وہ کالی کی شرن (پناہ) میں ہے۔''

''پھر تم مجھے اس کا پتہ بتاؤ۔ میں خود اس سے مل لوں گا۔''

''میں تجھے نرکھ کا پتہ بتا سکتا ہوں پاپی'' پجاری نے کہا۔

تلسی داس کے تیور اچانک خراب ہوگئے۔ انکا مندر کے باہر تھی مجھے معلوم تھا کہ تلسی داس کی صرف ایک آواز مندر کے اندر موجود پنڈتوں پجاریوں سے میری ٹکا بوٹی کرا سکتی تھی۔ تلسی داس صرف ایک منتر سے مجھے بھسم کرسکتا تھا لیکن وہ کسی جاپ منتر یا عمل سے باز رہا۔ اب مجھے فوراً کوئی تدارک کرنا تھا تلسی داس کسی وقت بھی خطرہ بن سکتا تھا۔ مُعاً مجھے پرتیم لال کا خیال آیا میں نے دل ہی دل میں اس کا نام لے کر کہا'' مہاراج اس سمے مجھے تمھاری مہان شکتی کی سخت ضرورت ہے تلسی داس کو قابو میں کرو اس سے کہو کہ مجھے بڑی نراٹن کا پتہ بتا دے۔''

ادھر تلسی داس غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ اس کی لال انگارا آنکھوں میں میرے لیے شدید نفرت موجود تھی۔ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن نہ کرسکا اچانک اس کے تیور بدلنے لگے۔ چہرے پر اُلجھن کے تاثرات نمایاں ہوئے اس نے اس طرح بار بار سر جھٹکا جیسے کسی بات سے انکار کر رہا ہو۔ دیر تک اس کی یہی کیفیت رہی۔ پھر وہ بڑی مدھم آواز میں رازداری کے ساتھ بولا۔'' تم نے مجھے مجبور کردیا ہے۔ آؤ وہ نیچے ہے دیوی کے چرنوں کے نیچے تہہ خانے میں۔ میرے ساتھ آؤ۔''

یکایک اس کے اس طرح بدل جانے اور نرم لہجے میں بات کرنے پر مجھے تعجب ہوا۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ ہولیا۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جبراً و قہراً میرے ساتھ چل رہا ہے چلنے کا انداز بتا رہا تھا جیسے اس میں اس کی مرضی کو دخل نہ ہو۔ آنکھیں خوابیدہ خوابیدہ قدم آہستہ آہستہ۔ اس کے دل و دماغ پر کسی اور قوت کی حکومت تھی۔

یہ پُراسرار قوت یقیناً پرتیم لال کی تھی جو اُس نے مجھے مُلا کے ساتھ دان کی تھی۔ اب میں برسوں کی کوشش اور کشمکش کے بعد اپنی نرگس کے قاتل کے پاس جا رہا تھا۔ میرا کیا عالم ہوگا تصور کیجیے۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور طیش سے تمتما رہا تھا۔ خون تیزی سے گردش کر رہا تھا اور مٹھیاں

پہنچی جاتی تھیں۔ بدری نرائن کا ذلیل وجود ایک عرصے کی جستجو کے بعد اب
کسی لمحے بھی میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ سکتا تھا۔ راستے میں مجھے بسنتی
داسی ملی۔ اس نے تلسی داس کے ساتھ مجھے دیکھ کر دانتوں میں انگلی دبالی
میں مسکراتا ہوا فتح مندی کے احساس کے ساتھ اس کے قریب سے گزر گیا۔
تلسی داس مجھے محرابی دروازے کی دوسری سمت لے گیا۔ جہاں کالی کی قدِ آدم
مورتی کھڑی تھی۔ مورتی کی پشت پر ایک دروازہ تھا۔ ہم دونوں اس دروازے
سے اندر داخل ہوئے۔ یہاں کالی کے مختلف روپوں کی بے شمار چھوٹی موٹی
مورتیاں موجود تھیں جو شاید فروخت کی جاتی تھیں۔ تلسی داس مورتیوں
کے درمیان سے گزرتا ہوا ایک الماری کے قریب جا کر رُکا جو دیوار میں پیوست
تھی۔ ایک بار پھر تلسی داس نے اطراف کا جائزہ لیا اور دھوتی سے چابیوں
کا گچھا نکالا۔ پھر اس نے الماری کا قفل کھول کر ایک پٹ اندر دھکیلا تو میں
ششدر رہ گیا۔ بل کھاتی ہوئی سیڑھیاں نیچے کی سمت دور تک چلی گئی تھیں
وہ سیڑھیاں دیکھ کر اور اندر کا جائزہ لے کر مجھے یک بارگی یہ احساس ہوا کہ
اگر تلسی داس پیچھے سے دروازہ بند کر کے چلا جاتے تو میں گھٹ گھٹ کر مر
جاؤں گا۔ ہلکی روشنی کی شعاعیں نیچے سے سیڑھیوں پر پڑ رہی تھیں اور پانی
کی شر شر آواز آ رہی تھی۔ تلسی داس مجھے وہاں تک پہنچا کر الجھے ہوئے لہجے میں
بولا "بدری نرائن نیچے موجود ہے۔ پرنتو مہاشے اس پوتر استھان پر تم کوئی
دنگا فساد نہیں کرو گے سمجھے؟ دیوی کی شکتی مہان ہے وہ اپنے
پجاریوں کو کشٹ دینا برداشت نہیں کرے گی۔ جاؤ اُسے یہاں سے نکال
کر لے جاؤ۔"

میں نے تلسی داس کے کہے ہوئے جملے تولنے کے لیے ایک نظر اس
کے سُتے ہوئے چہرے پر ڈالی۔ مجھے اعتماد ہو گیا کہ تلسی داس کسی شرارت
کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ پھر میں زینے سے نیچے اترنے لگا۔ پشت سے
دروازہ بند ہونے کی آواز سُنائی دی تو میں چونکا لیکن کوئی دھیان دیئے بغیر
آگے بڑھ گیا۔ میں ایک جذباتی شخص۔ اپنی محبوب بیوی کے قاتل بدری نرائن
سے انتقام لینے کے شدید جذبے سے اتنا مغلوب ہوا کہ مجھ سے احتیاط کا
دامن چھوٹ گیا۔ سیڑھیاں عبور کر کے میں نیچے پہنچا تو وہاں بھی بے شمار
مورتیاں اور پوجا پاٹ کا بہت سا سامان جمع تھا۔ وہ سارا ماحول پُراسرار
تھا۔ لیکن جمیل احمد خاں نہ جانے کتنے مرحلوں سے گزر چکا تھا۔ کوئی نیا شخص
جاتا تو سیڑھیاں دیکھ کر ہی اس کے اوسان خطا ہو جاتے۔ یہاں دو بڑے
کمرے تھے۔ میں نے پہلا کمرہ دیکھا جو بالکل خالی تھا اور ویرانی کا منظر پیش کر
رہا تھا۔ میں دوسرے کمرے میں داخل ہوا تو آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہاں
بدری نرائن کسی نوجوان پجارن کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔ جی میں تو آیا کہ
اچانک اس کے سر پر چڑھ جاؤں اور نرخرا دبا دوں یا پیچھے سے چھرا گھونپ
دوں مگر مارنے سے پہلے میں اسے ذلیل و مطعون کر کے دل کا غبار ہلکا کرنا چاہتا
تھا۔ میں خاموشی سے کمرے کی ایک دیوار سے چپک گیا۔ میرے اطراف میں

ان گنت مورتیاں تھیں۔ میں نے بڑے تحمل سے کہا۔ ”آخر کار میں آگیا۔“

بدری نرائن یہ سن کر یوں اُچھلا جیسے کسی بچھو نے اسے اندھیرے میں ڈنک مار دیا ہو۔ ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی پھر وہ سنبھل کر بولا۔ ”جمیل احمد خان۔ تم۔ تم۔ یہاں؟“

”ہاں۔ میں۔ غور سے دیکھ لو۔ میرے ساتھ اَرکا بھی نہیں ہے۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“ اس نے گھبراہٹ میں یہ دلچسپ سوال کیا۔

”خوب۔ تم یہ بھی نہیں جانتے بھولے بادشاہ۔ سنو میں اپنی پیاری اَرکا کو تمھارا خون پلانا چاہتا ہوں۔ اسے تمھارا خون پینے کی بڑی آرزو ہے۔“ میں نے طنزیہ کہا۔

”تم نے وعدہ خلافی کی تھی۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔“

”میں تم سے وضاحت نہیں مانگ رہا ہوں۔ نرگس مر چکی ہے مگر اُس کی آتما بیاکل ہے۔ میں اُسے شانت کرنے کے لیے تمھارے پاس آیا ہوں۔“

”جمیل احمد خاں مجھ سے غلطی ہو گئی ہے کیا تم مجھے شما نہیں کر سکتے؟ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ میں تمھارے بہت کام آسکتا ہوں۔“

”کمینے۔ بس کر بس کر۔“ میں نے اچانک گرجتے ہوئے کہا۔ ”زیادہ باتیں نہ بنا۔ ہوشیار ہو جا۔ آج تیری موت تیرے سر پر منڈلا رہی ہے۔ آج میں تیرے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے آیا ہوں۔ خود کو میرے حوالے کر دے اور مندر سے باہر آجا۔“

بدری نرائن کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ اس پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ میں پہلے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا۔ میں نے منہ بنا کر کہا۔

”بزدل حرامزادے۔ تو نے بڑی کمینگی کا ثبوت دیا ہے۔ اب سیدھی طرح میرے ساتھ چل۔“

”میں تمھارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ میں دیوی کی شرن میں ہوں“ بدری نرائن نے جھجکتے جھجکتے کہا۔

”تو پھر مجھے یہیں تیرا کام تمام کرنا ہو گا۔“ میں خطرناک ارادے سے آگے بڑھنے لگا۔ بدری نرائن خوفزدہ انداز میں پُشت کی طرف کھسک رہا تھا۔ پجارن بھی لرز رہی تھی۔ وہ وہاں سے بھاگ گئی لیکن اس سے قبل کہ میں بدری نرائن کے قریب پہنچتا۔ تہہ خانے میں دیواروں کی طرف سے ایک بھرائی ہوئی نسوانی آواز گونجی۔ ”جمیل احمد خاں رُک جاؤ۔ یہ میرا پوتر استھان ہے۔ یہاں خون خرابہ نہیں ہوتا۔ میرے سیوک تلسی داس نے بھی تم سے یہی کہا تھا پرنتو شاید تم بھول گئے۔“

”دیوی۔ دیوی۔ اپنے سیوک کی رکشا کر۔“ بدری ایک بڑی مورتی کے چرن پکڑ کر گڑگڑایا۔ پھر ڈنڈوت کرنے لگا۔



میں نے مورتی کی جانب نظر اُٹھائی۔ پتھر کی اس مورتی کی آنکھیں مجھے خون آلود نظر آئیں۔ بالکل زندہ انسانوں کی طرح۔ اچانک گھنٹیاں بجنے لگیں اور ایسا شور ہوا کہ میرا سر چکرا گیا۔ میں ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گیا میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ساری مورتیاں حرکت میں آگئی ہوں، جیسے وہ سب ایک ساتھ بولنے لگی ہوں لیکن میں نے سر جھٹک کر یہ پراگندہ خیالات ذہن سے نکالنے چاہیے، میں پھر آگے بڑھا تو بدری نرائن پہلو بچا کر نکل گیا۔ اسی لمحے وہ آواز پھر گونجی۔ ”پریتم لال نے جو شکتی تمھیں دان کی ہے وہ اس نے میری سیوا کرنے کے بعد پراپت کی تھی۔ اسی کارن میں تمھیں شما کرتی ہوں۔ پرنتو اب تم ترنت اس استھان سے چلے جاؤ۔ اگر تم یہاں سے نہیں گئے تو تمھیں ایسا کشٹ دیا جائے گا کہ سارا جیون بیاکل رہو گے۔ جاؤ اس پوتر استھان سے نکل جاؤ۔“

اس پُراسرار آواز نے مجھے حواس باختہ کر دیا۔ میں حیرت زدہ ہو کر چاروں طرف ایستادہ مورتیاں دیکھ رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ ان میں سے ایک بڑی مورتی کی آنکھوں میں چمک نظر آرہی تھی۔ اس کی پتلیوں میں حرکت ہوئی اور اس کے ہونٹ ہلنے لگے، میں نے آنکھیں مل کر دوبارہ دیکھا تو وہ مجھے ساکت نظر آئی۔ پریتم لال کے حوالے پر بھی میں ششدر رہ گیا تھا۔ بدری نرائن اب مورتی کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹ تیزی سے ہل رہے تھے، میں نے ان طلسمات کی کوئی پروانہ کی۔ نرگس کے قاتل کو اتنی آسانی سے معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسے اس عالم میں دیکھ کر میرا جوشِ انتقام بھڑک اٹھا۔ میں نے گرجدار آواز میں کہا۔ ”بدری نرائن کوئی آخری خواہش کرنی ہو تو کر لے، آج تجھے میرے ہاتھوں سے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ میں تیرا خون پیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ میں نے بہت صبر کر لیا۔“

میں نے سوچا مجھے اب دیر نہیں کرنی چاہیے، بدری نرائن کسی صورت میں دوبدو مقابلے کے لیے تیار نہ ہو گا۔ حالانکہ جی یہی چاہتا تھا کہ میں بہادر لوگوں کی طرح اسے شکست دوں لیکن وہ تو گھگھیا رہا تھا اور مورتی کے آگے گڑگڑا کر

داد فریاد کر رہا تھا میں اس بار اس کے سینے پر چڑھ جانے کے ارادے سے آگے بڑھا تو وہی نسوانی آواز تھرتھراتی ہوئی کمرے میں گونجی۔ "جمیل احمد خاں رک جاؤ۔ رک جاؤ۔ میرا حکم ہے تم جہاں ہو وہیں کھڑے رہو۔"

میں نے جس ظالم شخص کو اتنے دنوں تک زندہ رہنے دیا ہو اب اُسے ان آوازوں کے فریب میں آکر کیسے چھوڑ سکتا تھا جب نرگس کا چہرہ میرے تصور میں اُبھرا اور اس کی خون آلود لاش یاد آئی تو میں اور مشتعل ہو گیا۔ میں نے اس پراسرار آواز کی کوئی پروا نہ کی۔ بدری نرائن کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میں پھر آگے بڑھا لیکن اسی وقت گھنٹیوں کی پُرشور آواز تیز ہو گئی۔ اتنی تیز کہ عام آدمی چکرا کر گر جائے۔ میں نے زمین پر مضبوطی سے قدم جمائے اور لپک کر بدری نرائن پر ٹوٹ پڑنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ٹھیک اسی وقت کمرے میں روشنی ہوئی اور ایک لمحے میں ہر طرف آگ کے بڑھتے ہوئے شعلے نظر آنے لگے۔ کمرے کے تمام در و دیوار آگ کی لپیٹ میں تھے۔ میں مجبوراً درمیان میں کھڑا ہو گیا۔ آگ کے ان شعلوں میں کوئی فوری فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ باہر سے دروازہ بند ہے۔ کوئی اور راستہ بھی نہیں۔ گویا یہ سازش تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے سمجھ لیا کہ میرا آخری وقت آپہنچا ہے۔ میں پھر ان کے دام میں آگیا ہوں۔ اس بار رہائی مشکل ہے۔ اس لیے کہ انکا بھی موجود نہیں ہے رہی پریتم لال کی شکتی تو کالی کے مندر میں اس کی اوقات ہی کیا ہے؟ میں نے یہ سوچ کر بدری نرائن پر چھلانگ لگا دی کہ مرنے سے پہلے اس کا کام تمام کر جاؤں۔ وہ پہلو بچا کر کمرے میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ میں نے آگ کے شعلے خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایک بار پھر بدری نرائن کو پکڑنا چاہا۔ یہ چوہے بلی کا کھیل تھا اس وقت میرے ہاتھ میں اس کی دھوتی آگئی۔ میں نے دھوتی کا سرا پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ وہ پھر بھاگنے لگا تو میں نے اُسے آگ کی طرف دھکیل دیا۔ میرے لیے تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ آگ میں جھلسنے کے بجائے صاف نکل آیا۔ اُسے کوئی موقع دیئے بغیر میں نے پھر ایک کوشش کی۔ وہ ایک بڑی مورتی کی پشت چھپنے لگا۔ وہاں بھی آگ لگی ہوئی تھی۔ میں نے مورتی کے پہلو سے اُسے پکڑنے کا ارادہ کیا لیکن کالی کی وہ بڑی مورتی جو میرے بائیں جانب ایک چبوترے پر نصب تھی، تیزی سے میرے اوپر گری۔ میں نے بچنے کی کوشش کی لیکن بچ نہ سکا۔ مجھے اپنے شانے پر شدید چوٹ کا احساس ہوا۔ میری نظروں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا اور میں تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ تمام حواس ساتھ چھوڑ گئے اور دل ڈوبنے لگا۔ یہ محسوس ہوا جیسے میری روح جسم سے جدا ہوا چاہتی ہے۔

مگر سخت جان جمیل احمد خاں یہ وار بھی سہہ گیا۔ وہ کالی کے مندر سے کوئی ایک فرلانگ دور کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر غلاظتوں کے درمیان پڑا ہوا تھا جب دل کچھ قابو میں آیا اور حواس بجا ہوتے تو سارا واقعہ ذہن میں گھوم گیا۔ کالی کی قوت نے مجھے اپنے پوتر استھان سے اٹھا کر یہاں لا پھینکا تھا بات صاف تھی کہ آخر کالی نے اپنے سیوک بدری نرائن کو میرے ہاتھوں سے بچا لیا تھا۔ میں بے چین ہو کر وہاں سے اُٹھا اور تیزی سے جوش کے عالم میں دوبارہ مندر کی طرف بڑھا۔ میں اس آگ میں کہیں بھی نہ جھلسا تھا اور نہ مجھے اپنے شانے پر چوٹ کا کوئی شدید احساس تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد میں نے اپنے جذبات کے سرکش گھوڑے کی لگام کھینچی۔ میں انکا سے دریافت کرنا چاہتا تھا کہ پریتم لال کی شکتی کے باوجود اس ناکامی کا سبب کیا ہے اور میرا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ انکا نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مندر سے واپسی پر میرے سر پر آجائے گی۔ مگر وہ غائب تھی۔ میں نے اُسے بے تحاشا آوازیں دیں، لیکن بے سود۔ غصے نے مجھ پر دیوانگی طاری کر دی، یہ انکا کہاں چلی گئی۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک پریشان کن خیال اُبھرا۔

شوہر

کو انتقال کیے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ بیوی کو حاضرات بلانے کے کسی عامل کا پتہ چلا وہ اُس کے پاس پہنچی اور اُس سے اپنے شوہر کی رُوح کو بلانے کی درخواست کی۔

حاضرات کے عامل نے دیر تک بڑی کوشش کی لیکن مرحوم شوہر کی رُوح کو حاضر کرنے میں ناکام رہا۔ اُس نے نہایت افسوس کے ساتھ غمزدہ بیوہ سے کہا۔ "محترمہ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں آپ کے شوہر کی رُوح کو نہیں بلا سکا۔ آپ یقین کیجیے کہ میں نے عملیات کی زبان میں اُسے زور زور سے آوازیں دیں لیکن اُس کا آنا تو درکنار اُس کا کوئی جواب تک موصول نہ ہوا۔"

بیوی نے فوراً کہا۔ "او ہو! آپ فکر مند بالکل نہ ہوں۔ ایک بار پھر کوشش کیجیے اور ذرا اور زور سے آوازیں دے کر بلائیے۔ اللہ بخشے جب وہ زندہ تھے تب بھی دو چار آوازوں پر تو چونکتے بھی نہ تھے۔ دراصل اس میں اُن کی بھی کوئی خطا نہیں، اُن کا پیشہ ہی ایسا تھا۔"

عامل نے حیرت سے پوچھا۔ "اُن کا پیشہ کیا تھا؟"

بیوہ نے جواب دیا۔ "وہ ایک ہوٹل میں ویٹر تھے۔"

کہیں کالی کی مہان شکتی نے اُلکا کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچایا ہو۔ اگر ایسا ہو گیا تو میں تو لُٹ گیا۔ اُلکا کی غیر موجودگی نے مجھے اتنا الجھایا کہ میں پاگلوں کی طرح سڑک پر دوڑنے لگا جیسے اُلکا مجھے سڑک پر کہیں کھڑی ہوئی نظر آجائے گی۔ چار و ناچار تھک کر مندر میں دوبارہ جانے کا ارادہ ترک کر کے میں اپنے ہوٹل کی طرف چل دیا۔

دن چڑھ آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں زیادہ دیر تک کوڑا کرکٹ پر بے ہوش نہیں پڑا رہا۔ ہوٹل میں اپنے کمرے پر پہنچا تو میرے ذہن کو دوسرا جھٹکا لگا۔ کمرہ باہر سے مقفل تھا جس کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ کلکتے میں مالارانی کا تنہا باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں۔ پھر وہ لوگ کہاں چلے گئے۔ کیا۔ کہیں مالارانی کو بھی؟ میں اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ تیزی سے ہوٹل کے منیجر کے کمرے تک گیا۔ میں اس سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ مالا کہاں گئی؟ منیجر مسلمان تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پیچھے سے اپنے دفتر کا دروازہ بند کیا پھر خوفزدہ لہجے میں کہنے لگا "جمیل صاحب... آپ"

"جلدی بتاؤ منیجر۔" میں نے منیجر کا جملہ درمیان سے اُچکتے ہوئے کہا "میرے کمرے میں قفل کیوں پڑا ہے؟ جن لوگوں کو میں کمرے میں چھوڑ گیا تھا وہ کہاں ہیں؟ کیا کہہ گئے ہیں؟ کب آئیں گے؟" میں نے ایک ہی سانس میں منیجر سے نہ جانے کتنے سوال کر ڈالے۔

وہ بیچارہ مجھے حیرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا، مجھے بیٹھنے کے لیے اس نے کرسی پیش کی اور رازداری سے کہنے لگا "خاں صاحب جن لوگوں کو آپ کمرے میں چھوڑ گئے تھے، انھیں پولیس گرفتار کر کے لے گئی ہے، مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ نے جس لڑکی کو اپنی بیوی بتایا تھا وہ دراصل ایک ہندو لڑکی تھی اور اسے آپ اغوا کر کے لائے تھے۔ پولیس نے جس وقت چھاپا مارا اس وقت لڑکی کے رشتے دار بھی ساتھ تھے۔"

"منیجر" میں صدمے سے چکرا کر بولا "یہ سب اتنی جلدی کیسے ہو گیا؟"

"خاں صاحب، آپ مسلمان ہونے کے رشتے سے میرے بھائی ہیں" منیجر نے قریب آکر دبی زبان سے کہا "یہاں کے بنگالی ہندو بہت متعصب ہیں۔ میرا مشورہ مانیے تو آپ کلکتے سے فوراً فرار ہو جائیے۔ یہ ہنگامہ کسی وقت بھی بڑھ کر فرقہ وارانہ فساد کی شکل اختیار کر سکتا ہے، پولیس آپ کی تلاش میں ہے۔ لڑکی کا باپ کلکتے کا بہت بڑا بزنس مین ہے۔ اگر آپ ایک بار اس کے چنگل میں پھنس گئے تو بچنا محال ہو جائے گا۔ یوں بھی یہ ہندو مسلم فساد کا معاملہ ہے۔ لڑکیوں کا چکر ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ اس لڑکی پر لعنت بھیجیے، جتنی جلدی ممکن ہو...... یہ ہوٹل کی بدنامی کا معاملہ بھی ہے۔ معاف کیجیے میں ایسی حرکتیں پسند نہیں کرتا۔"

"منیجر۔ بکواس بند کرو۔" میں نے غصے سے اٹھ کر منیجر کے گال پر اس زور کا طمانچہ رسید کیا کہ وہ لڑکھڑا کر کرسی سے ٹکرایا اور کرسی سمیت فرش پر اُلٹ گیا۔ مجھ پر خون سوار تھا۔ بدری نرائن کے معاملے میں ناکامی کے بعد اس دوسرے صدمے نے میرا ذہنی توازن بگاڑ دیا۔ نہ جانے مجھے کیا ہوا میں اچھل کر منیجر کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور اپنے واحد ہاتھ سے اس کا گلا دبانے لگا۔ منیجر اس صورتحال کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میں ایک ذرا سی بات پر اس قدر مشتعل ہو جاؤں گا۔ وہ خود کو بچانے کی خاطر میرے جسم کے نیچے مچل رہا تھا۔ اُسے مارنے کی کوئی تُک نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ منیجر کا دم نکل جاتا اُلکا میرے سر پر آگئی ـــــــ دوسرے ہی لمحے اُلکا کی گھبرائی ہوئی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

"جمیل ہوش میں آؤ۔ اس غریب نے تمھارا کیا بگاڑا ہے۔ یہ تو تمھارا ہمدرد ہے۔"

اُلکا کی آواز سن کر میرے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی میں منیجر کو چھوڑ کر اسے دھتکارتے ہوئے اُٹھا۔ اور بڑے بیزار لہجے میں اُلکا سے اس کی عدم موجودگی کا سبب پوچھا۔ اُلکا خود بھی اس وقت بہت پریشان نظر آرہی تھی وہ جلدی سے بولی "مجھے معلوم ہے جمیل تم مجھ سے ناراض ہو لیکن بات ہی کچھ ایسی تھی کہ مجھے کالی کے مندر سے یہاں آنا پڑا۔ تمھارے چچا اور مالارانی کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔ مالارانی کو تو اس کے دادا اور بھائی اپنے گھر لے گئے۔ تمھارے چچا حوالات میں بند ہیں۔ پولیس والوں نے انھیں بڑی بے رحمی سے مارا ہے۔ وہ ان سے تمھارا پتہ دریافت کر رہے ہیں جمیل تمھاری قسمت بڑی خراب ہے، جب حالات ذرا سُدھرنے لگتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی مصیبت آجاتی ہے۔"

"لیکن اچانک یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟" میں نے تلملا کر سوال کیا۔

"بھاگ کے کھیل ہیں جمیل۔" اُلکا نے سرد آہ بھر کر کہا "اسٹیشن سے آتے وقت مالارانی کے کسی رشتے دار نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ پولیس کے سامنے مالارانی نے یہی بیان دیا ہے کہ وہ تمھارے ساتھ اپنی مرضی سے آئی ہے لیکن تمھارے بااثر اور مالدار سُسر نے پولیس والوں کی مٹھی گرم کر رکھی تھی۔

مالارانی کی ایک نہ چل سکی۔ باپ اور بھائی زبردستی اُسے پکڑ کر لے گئے۔"

"اور تم نے کیا کیا؟" میں نے انکا سے پوچھا۔

"یہ واقعہ دوپہر کا ہے۔ جب میں پہنچی تو سارا کھیل بگڑ چکا تھا میں مالارانی کے سر پر گئی۔ وہ بہت پریشان تھی۔

میں نے اسے پریشانی سے بچانے کے لیے اُس کا ذہن ماؤف کر دیا وہ سارے وقت میرے اشاروں کی تابع رہی پھر میں وہاں سے چلی آئی ابھی میں اکیلی کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ تمھارے پاس آنے کی ضرورت پڑ گئی۔" انکا نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

"اب کیا کیا جائے کبھی زندگی میں سکون بھی نصیب ہو گا انکا؟"

"ایک شرط پر سکون مل سکتا ہے' صرف تمھاری خامی ہے جمیل"

"وہ کیا؟"

"تم یہ جذباتی حرکتیں، ضدی پن اور جلد مشتعل ہو جانا چھوڑ دو" ابھی میں نہ آتی تو تم ایک اور جرم میں پھنس جاتے۔"

"انکا۔ ایسے حالات میں کون شخص خود کو قابو میں رکھ سکتا ہے' تمھاری زبان سے نصیحتیں اچھی نہیں لگتیں۔"

"جمیل۔ تم بعض اوقات اجنبیّت کی باتیں کرنے لگتے ہو۔" انکا اُداسی سے بولی۔

"اچھا اچھا۔ زیادہ باتیں نہ کرو۔ اب یہ بتاؤ کہ مالارانی اور چچا جان کو کس طرح اس مصیبت سے نجات دلائی جائے۔" میں نے جز بز ہو کر کہا۔

"چلو اپنے کمرے میں چلو غسل کر کے کپڑے تبدیل کرو۔ میں جو تمھارے ساتھ ہوں۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔"

میں نے انکا کی زبانی پوری تفصیل دوبارہ معلوم کر کے اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ کپڑے تبدیل کیے اور ٹیکسی پکڑ کر تھانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ میری ذہنی حالت بڑی ابتر تھی پے درپے صدمات نے مجھے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ راستے میں انکا کے پوچھنے پر میں نے کالی کے مندر میں پیش آنے والی ساری روداد اسے سنائی تو انکا غور و فکر میں ڈوب گئی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولی "تمھارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ دھوکا ہے جمیل۔ بدری نرائن کوئی معمولی پنڈت تو ہے نہیں۔ اس نے خود کو تم سے بچانے اور تمھیں موت کے منہ میں دھکیلنے کے لیے یہ سارا بہروپ بھرا تھا۔ پریتم لال کی پُراسرار قوت نے اگر تمھاری مدد نہ کی ہوتی تو شاید......"

"مگر میں نے دیوی کی آنکھیں اور ہونٹ متحرک دیکھے تھے کمرے میں ایک نسوانی آواز گونج رہی تھی۔ وہ مجھے بار بار وہاں سے بھاگ جانے کی تلقین کر رہی تھی۔ پھر وہاں اچانک خوفناک آگ لگ گئی۔ اور ایک مورتی میرے سر پر آگری۔"

"یہ تو معمولی سے کرتب ہیں جمیل۔ بدری نرائن نے ایک مدت تک دیوی اور دیوتاؤں کے لیے بڑے بڑے جاپ کیے ہیں۔ اس کے لیے یہ معمولی قسم کے چمتکار دکھانا کوئی مشکل نہیں۔ کچھ شکتیاں اس کے قبضے میں بھی ہیں۔ شاید تمھیں پریتم لال کی شکتی سے صحیح طور پر کام لینا نہیں آیا۔ لیکن اس کا بندوبست ہمیں بعد میں کرنا پڑیگا۔ پہلے ہمیں مالارانی اور تمھارے چچا جان کے بارے میں کچھ کرنا ہے۔"

"انکا۔ کیا کم بخت بدری نرائن ہمیشہ مندر ہی میں رہے گا؟"

"ہاں۔ اسے مجھ سے ڈر ہے۔ وہ جب تک پریتم لال جیسی بڑی شکتی حاصل نہیں کر لیتا اور ایک خاص علاقے میں گیان دھیان کے لیے کالی اسے آگیا نہیں دیتی۔ اس وقت تک وہ مندر میں مقید رہے گا، مجھے یقین ہے کہ وہ ایک بار ضرور باہر آئے گا۔ مجھے اس کے باہر آنے ہی کا انتظار ہے۔"

"جب تک میری موت واقع ہو جائے گی" میں نے زہرخند سے کہا۔

"ارے جمیل۔ تم بہت مایوسی کی باتیں کر رہے ہو۔ ابھی تو تمھیں نہ جانے کیا کیا دیکھنا ہے۔ ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔" انکا نے اٹھلا کر اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

"بس کرو انکا۔ اب اعصاب میں دم نہیں رہا۔ خاموش ہو جاؤ۔"

راستے بھر انکا حسب معمول مجھے پُرسکون رہنے کی تلقین کرتی رہی میرا ذہن کئی حصّوں میں بٹ چکا تھا۔ نرگس کا قاتل اپنی قوت کی وجہ سے میری آنکھوں میں دھول جھونک کر صاف بچ نکلا تھا۔ اگر میں پریتم لال کی شکتی کا غلاف نہ اوڑھے ہوتا تو عین ممکن تھا کہ نرگس کے پاس دوسری دنیا میں پہنچا دیا جاتا۔ مجھے ایک طرف مالارانی کی فکر لاحق تھی اور دوسری طرف اپنے چچا جان خورشید احمد خاں کی گرفتاری کا غم تھا۔ ایک عرصے بعد ان سے ملاقات ہوئی تھی اور وہ میری وجہ سے کتنے شرمناک واقعات میں ملوث ہو کر پریشانیوں کا شکار ہو گئے تھے۔

تھانے پہنچ کر میں سیدھا انسپکٹر کے کمرے میں گیا۔ انسپکٹر نے غالباً میری خوش پوشی سے متاثر ہو کر مجھے کرسی پیش کی لیکن جب میں نے

اپنا نام بتایا اور کہا کہ میں خورشید احمد خاں کی ضمانت لینے آیا ہوں تو انسپکٹر کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ مجھے فاتحانہ انداز میں قہر آلود نظروں سے گھور کر کہنے لگا "ہوں۔ تو تم ہو، وہ جمیل احمد خاں۔ اچھا ہوا تم خود آگئے۔ ہمیں تمھاری ہی تلاش تھی۔"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا انسپکٹر۔" میں نے دبنگ آواز میں کہا "ملا مجھے ایک مہان پجاری پریتم لال نے سورگ باش ہوتے وقت دان کی تھی۔ کنیا دان کے ساتھ اس نے جہیز میں کچھ شکتی بھی دی تھی۔"

"اچھا۔ بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہو۔" انسپکٹر نے میرا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ پھر گرج کر بولا "دو چار روز حوالات میں رہ گے تو تمھارا ذہنی توازن خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمیں بڑے بڑوں کے دماغ ٹھکانے لگانا آتا ہے۔"

"انسپکٹر تم گستاخی کر رہے ہو۔ شاید تم نے جمیل احمد خاں کا نام نہیں سنا؟" میں نے بھی لہجہ بدلا۔

"بکواس بند کر مسٹر یہ تھانا ہے۔ تیرے باپ دادا کی جاگیر نہیں ہے۔" انسپکٹر ایک دم اکھڑ گیا۔

"تم اوقات سے بڑھ رہے ہو انسپکٹر۔ کھال میں رہنے کی کوشش کرو۔ ورنہ یہ پورا تھانا کھنڈر میں تبدیل کر دوں گا۔" میں نے بگڑتے ہوئے کہا۔ انسپکٹر نے میری جرأت اور بے باکی دیکھ کر شاید حفظِ ماتقدم کے طور پر جھٹ اپنا پستول نکال لیا اور میری طرف تان کر اپنے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔

"اس معمولی کھلونے سے تو آپ واقف ہوں گے جمیل احمد خاں۔ کیا اب بھی آپ کچھ بکواس کرنے کی زحمت کریں گے؟"

"انسپکٹر یہ کھلونا اپنے پاس رکھو۔ یہ بچوں کی باتیں ہیں۔ یہ کھیل میں بہت دن ہوئے چھوڑ چکا ہوں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"خوب خاں صاحب! آپ خاصے کھاتے کھیلے معلوم ہوتے ہیں، بہرحال اب آپ اپنے آپ کو گرفتار سمجھیے۔" انسپکٹر نے سرد لہجے میں کہا۔

"شاید تم بھول گئے۔ میں اپنے چچا جان کی ضمانت لینے آیا ہوں۔"

"ہاں ہاں وہ تو جناب نے پہلے بتا دیا تھا مگر میری عرض بھی سنیے ۔۔۔ آپ کو معلوم ہوگا خاں صاحب کہ یہ اغوا کا کیس ہے اس میں گرفتار شدہ شخص کی ضمانت صرف عدالت قبول کر سکتی ہے مجھے یہ اختیار نہیں ہے البتہ مجھے اور اختیارات ضرور حاصل ہیں۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔" میں آپے سے باہر ہوگیا۔ "یہ اغوا کا کیس ہرگز نہیں ہے میرے خلاف جھوٹا اور خواہ مخواہ کا مقدمہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں اس سلسلے میں عدالت وغیرہ سے رجوع کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہوں یہاں میرے چچا کی ضمانت قبول کرنی ہی پڑے گی۔"

انسپکٹر مسکرایا۔ "فی الحال تو میں آپ کو گرفتار کر رہا ہوں یقیناً یہ بات میرے اختیار میں ہے۔"

"یہ تم کچھ اچھا نہیں کر رہے ہو تم وہ کام کرنا چاہتے ہو جو تمھارے امکان سے باہر ہے۔"

"میں ابھی آپ کو بتاؤں گا خاں صاحب کس کے امکان میں کیا ہے" اتنا کہنے کے بعد اس نے اٹھ کر پستول کا رخ میری طرف کیا۔ اگلا ہی موقع کی منتظر تھی، وہ اسی وقت میرے سر سے رینگ کر اتر گئی دوسرے ہی لمحے انسپکٹر کا رویہ نرم پڑ گیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر کچھ دیر تک تذبذب کی کیفیت سے دوچار رہا۔ پھر بولا "معاملہ بے حد سنگین صورت اختیار کر گیا ہے خاں صاحب، لیکن میں اپنے اختیارات کی حدود سے تجاوز کر کے خورشید احمد خاں کے سلسلے میں آپ کی ضمانت قبول کرنے کو تیار ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ الکا انسپکٹر کے سر پر چلی گئی ہے۔ میں نے بات کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ خاموشی سے ضمانت کے کاغذات الٹے سیدھے پر کیے اور انسپکٹر کی طرف بڑھا دیئے۔ البتہ میں نے اس دوران اس سے ملا کے باپ کنور پرتاپ کے بارے میں ضروری تفصیلات حاصل کر لیں۔ انسپکٹر کے بیان کے مطابق کنور پرتاپ کا شمار بہت بڑے جاگیرداروں میں ہوتا تھا۔ اس کا لمبا چوڑا کاروبار دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ تفصیلات معلوم کرنے کے بعد میں انسپکٹر کے ساتھ حوالات کے اندر گیا جہاں میرے چچا نہایت خستہ حالت میں بچتہ زمین پر پڑے کراہ رہے تھے۔ پولیس والوں نے انھیں حقیقتہً بڑی بے دردی اور بے رحمی سے مارا تھا۔ ان کا لباس شکستہ ہو گیا تھا۔ جلد جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی اور خون رس رہا تھا۔ سر اور داڑھی کے بال خون میں لت پت تھے۔ ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اپنے چچا کو اس اذیت ناک حالت میں دیکھ کر

میں کھول اُٹھا۔ جی میں آئی کہ ڈیوٹی پر تعینات تمام پولیس والوں کو اُن کے سنگدل افسروں سمیت موت کے گھاٹ اتار دوں مگر اس وقت کوئی ہنگامہ مناسب نہیں تھا۔ مجھے مالا کی خبر لینی تھی۔ میں خون کا گھونٹ پی کر چپ ہو رہا۔ پولیس والوں کو جب خورشید احمد خاں کی ضمانت کا علم ہوا تو ان کی حیرتوں کی انتہا نہ رہی۔ شاید انھیں یقین نہیں تھا کہ میرے چچا ان کے شکنجے سے زندہ بچ سکیں گے، لیکن چونکہ انسپکٹر میرے ہمراہ تھا۔ اسلیے کسی نے زبان نہیں کھولی۔ میں نے ایک پولیس والے کے ذریعے ٹیکسی منگوائی۔ انسپکٹر کی مدد سے اپنے بے ہوش چچا کو اُٹھا کر ٹیکسی میں ڈالا اور تھانے سے روانہ ہو گیا۔

ٹیکسی ابھی کچھ ہی دُور گئی تھی کہ اَلکا دوبارہ میرے سر پر آگئی۔ اس نے مجھے ایک ایسے اسپتال کا پتہ بتایا جو شہر سے خاصی دُور تھا۔ میں نے مصلحت کے تحت راستے میں دو ٹیکسیاں بدلیں اور چچا کو لے کر سیدھا وہاں پہنچا اور انھیں اسپیشل وارڈ کے ایک پرائیویٹ روم میں داخل کرا دیا۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ ان کی حالت مخدوش ہے، میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اَلکا نے مجھے اُداس دیکھا تو میری ڈھارس بندھاتے ہوئے بولی۔

"اتنی پریشانی کی کیا بات ہے۔ تمھارے چچا ایک ہفتے میں ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"خدا تمھاری زبان مبارک کرے۔" میں نے دل ہی دل میں اَلکا سے کہا اور ڈاکٹر سے گفتگو کرنے لگا۔

چچا جان کو ڈاکٹر کے حوالے کر کے میں وارڈ سے باہر کوریڈور میں آگیا۔ اب مجھے مالا کے سلسلے میں کچھ سوچنا تھا۔ میں ہر صورت میں کنور پرتاپ کے گھر جا کر مالا کو اس کی قید سے آزاد کرانا چاہتا تھا لیکن اَلکا میری رائے سے متفق نہیں تھی۔ کچھ دیر ہمارے درمیان گرم و تلخ بحث ہوئی۔ پھر اَلکا نے مشورہ دیا کہ "تم چچا جان کے پاس ٹھیرو۔ میں مالا رانی کے پاس جا کر حالات کا جائزہ لیتی ہوں۔ اس کے بعد اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔ ممکن ہے میں اسے کنور پرتاپ کے قبضے سے باہر نکال لانے میں اسی وقت کامیاب ہو جاؤں۔"

"نہیں اَلکا۔" میں نے افسردگی سے کہا "مالا کو مزید اُلجھنوں میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ وہ بہت معصوم ہے، اس کے دل دماغ پر ان غیر متوقع حادثات کا گہرا اثر پڑے گا۔ وہ برسوں سے پریتم لال کی صحبت میں زندگی گزار رہی تھی۔ اس لیے شہر کے لوگوں کی عیاریوں سے واقف نہیں ہو گی

اگر وہ کلکتے میں رہی تو اس کے باپ بھائی اسے پھر تلاش کر لیں گے۔ چچا جان کی طبیعت خراب ہوتی تو میں مالا کو لے کر لکھنؤ چلا جاتا۔ وہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"اگر تمھاری یہی خواہش ہے تو میں کسی طرح حالات اپنے حق میں ہموار کر کے مالا کو لکھنؤ پہنچا سکتی ہوں لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟" میں نے اَلکا کی خاموشی سے اُلجھتے ہوئے پوچھا۔ "تم کہنا کیا چاہتی ہو اَلکا۔ کیا مجھے مالا سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا؟ تم خاموش کیوں ہو گئیں؟"

"میں سوچ رہی ہوں جمیل۔" اَلکا سنجیدگی سے بولی "کلکتے میں تمھارا تنہا رہنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ مالا کے رشتے داروں کو جب تمھارے چچا جان کی ضمانت کا علم ہو گا تو وہ دنگے فساد پر اتر آئیں گے، یہاں تمھارا روپوش رہنا مشکل ہو جائے گا۔ مجھے ڈر ہے جمیل کہ تم پھر کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جاؤ۔ مجھے تم پر اعتبار نہیں رہا۔"

"کیا اعتبار نہیں رہا؟" میں نے غصّے سے پوچھا۔

"یہی کہ تم اپنی حفاظت تنہا کر سکتے ہو۔ تم اتنی جلدی برہم ہو جاتے ہو۔"

"اَلکا تمھارے سوا بھی تو میری کوئی ذات ہے۔"

"لیکن تم ایسے خطرات میں گھر جاتے ہو جو عام آدمیوں کو پیش نہیں آتے۔ اسی لیے تمھیں میری ضرورت پڑتی ہے۔" پھر اَلکا بہت اُداسی سے کہنے لگی "یہ سب کچھ میری وجہ سے ہو رہا ہے۔ کاش میں تمھارے سر پر نہ آتی تو تم عام آدمیوں کی طرح خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہوتے میری وجہ سے تم پر کیسے کیسے غم ٹوٹے۔"

"اَلکا۔ مجھ بدنصیب کے لیے تو تم نے بہت کچھ کیا ہے۔" میں نے خجالت سے کہا۔

"کیا کیا۔ یہی کہ تمھارا ہاتھ چھنوا دیا۔ تمھارا خون مجھے پینا پڑا تمھیں میری وجہ سے سڑکوں پر بھیک مانگنی پڑی۔"

"چھوڑو اَلکا۔ ماضی کی باتیں نہ کرو دل کڑھتا ہے۔" میں نے سوچا اَلکا نے تو مجھے زندگی کے اصل رنگ دکھائے ہیں۔ میں نے یہ موضوع بدل دیا اور اصرار کرنے لگا "تم میری فکر نہ کرو۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔ مالا کی خبر لو۔"

اَلکا نے مجھے حالات کے تاریک پہلوؤں پر بہت سمجھایا لیکن میں

نے اسے یہی حکم دیا کہ وہ میری فکر نہ کرے اور جتنی جلد ممکن ہو، مالا کو اس کے باپ کے قبضے سے نکال کر لکھنؤ پہنچا دے۔ اُلکا میرے حکم کے آگے بے بس ہو گئی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ مجھے تنہا چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہیں ہے۔ میں نے تصور کے عالم میں سر پر نگاہ کی تو اُسے متذبذب دیکھا میں نے کہا "کیا سوچ رہی ہو؟ وقت مت ضائع کرو اُلکا۔ ہمارے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، نہ جانے مالا کے باپ بھائی اب تک اس پر کتنے ظلم کر چکے ہوں گے، تم مالا کو بچاؤ، میرے لیے پریشان نہ ہو میرے پاس پریتم لال کی شکتی ہے، میں اپنے دشمنوں سے نپٹ لوں گا۔"

اُلکا نے سراسیمگی سے ایک نظر مجھے دیکھا پھر خاموشی سے رینگ کر میرے سر سے اتر گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں دوبارہ اپنے چچا کے کمرے میں چلا گیا۔ میں رات گئے تک ان کے پاس رہا۔ ان کی بے ہوشی برقرار تھی۔ میں خود کو ملامت کر رہا تھا۔ ساری ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی تھی۔ اب میں انھیں ہر قیمت پر موت کے منہ سے بچانا چاہتا تھا۔ میں نے ڈاکٹروں کو ایک لمبی رقم دے کر ان کی تمام تر توجہ خرید لی تھی لیکن میرا دل ابھی تک مطمئن نہیں تھا۔ کبھی میں اُٹھ کر کوریڈور میں ٹہلنے لگتا۔ کبھی دوبارہ چچا کے سرہانے جا بیٹھتا۔ دل کا کیا کرتا جو قابو میں نہیں آتا تھا۔

اگلی صبح کو کہیں چچا جان ہوش میں آئے اور ڈاکٹروں نے یہ مژدہ سنایا کہ اب اُن کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ میری جان میں جان آئی میں نے گزشتہ روز سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ اس لیے اسپتال سے نکل کر درمیانہ درجے کے ایک قریبی ہوٹل میں گیا اور شکم سیر ہو کر ناشتہ کیا تو حالت ذرا درست ہوئی لیکن اب مالا کی فکر دامنگیر تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے یونہی وقت گزاری کے لیے ایک اخبار اٹھا لیا۔ مجھے پہلے ہی صفحے پر جو سرخی نظر آئی وہ میرے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ میں تمام تر انہماک سے وہ اہم خبر پڑھنے لگا جس میں ہوٹل پر پولیس کے چھاپے سے لے کر مالا کے دوبارہ پُراسرار طور پر اغوا ہو جانے تک کی تفصیل درج تھی۔ اس انسپکٹر کو ملازمت سے معطل کر دیا گیا تھا جس نے میرے چچا کی ضمانت قبول کی تھی مجھے یہ پڑھ کر یک گونہ سکون ہوا کہ مالا دوبارہ اغوا کر لی گئی ہے کسی کو کیا معلوم تھا کہ اسے اُلکا کی پُراسرار قوت لے اُڑی ہے۔ اخبار میں میرے بارے میں صرف اتنا درج تھا کہ خورشید احمد خاں کی ضمانت لینے والے شخص کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے اور پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ میں نے ہوٹل میں موجود افراد کو غور سے دیکھا۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف تھا۔ بل ادا کر کے میں

فرید اسکول سے واپس آیا تو ڈاکٹر صاحب دروازے پر ہی مل گئے۔ "فرید میاں، تمہارا ایک مُنّا سا بھائی پیدا ہوا ہے۔"

فرید یہ سُنتے ہی اندر بھاگا۔ ڈاکٹر صاحب نے حیران ہو کر پوچھا "کہاں جا رہے ہو، رُکو تو سہی۔"

"ذرا امّی کو خوشخبری سُنا دوں۔"

باہر آیا اور کم آباد علاقوں کے درمیان سے گزرتا ہوا بازار گیا جہاں سے میں نے کامدار چادر خریدی اور اسے فوراً اس طرح شانوں پر ڈال لیا کہ کسی کو مجھ پر شبہ بھی نہ ہو اور میرا کٹا ہوا ہاتھ بھی چھپا رہے، ہندوؤں میں اس قسم کی چادر شانوں پر ڈال کر باہر نکلنا عام بات ہے، مجھے اب صرف اس بات کی فکر تھی کہ چچا ٹھیک ہو جائیں اور میں انہیں ساتھ لے کر کلکتے سے دُور چلا جاؤں۔ میں بدری نرائن کا معاملہ فی الوقت ذہن سے نکال دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اپنے خیالات میں محو میں اسپتال کے قریب پہنچا تو دروازے کے باہر پولیس کی گاڑی دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا، چنانچہ صدر دروازے سے اسپتال میں داخل ہونے کے بجائے میں ایک لمبا چکر کاٹ کر پشت کی جانب پہنچا اور احاطے کی دیوار کے قریب رُک کر اندر دیکھا تو میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ یہاں سے مجھے پرائیویٹ وارڈ کا وہ برآمدہ صاف نظر آ رہا تھا جہاں میں نے ایک کمرے میں چچا جان کو داخل کرایا تھا۔ برآمدے میں چار پانچ پولیس افسر موجود تھے۔ ان کے ساتھ ایک موٹا تازہ آدمی بھی سوٹ بُوٹ میں کھڑا تھا اور منہ بنا بنا کر ایک پولیس افسر سے کچھ کہہ رہا تھا۔ میں ان کے درمیان ہونے والی باتیں نہیں سن سکتا تھا۔ البتہ میں نے اتنا اندازہ ضرور لگا لیا تھا کہ وہ شخص کنور پرتاپ ہی ہو سکتا ہے، برآمدے کے سامنے ہی ایک شاندار گاڑی کھڑی تھی جو میرے اندازے کی تصدیق کر رہی تھی۔

میں دیوار کے قریب سے ہٹ کر سڑک پر آ گیا۔ اب میرا وہاں رُکنا مناسب نہیں تھا۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ آخر پولیس کو میرے چچا کے بارے میں کس ذریعے سے معلومات حاصل ہو گئیں۔ اسپتال میں پولیس کی موجودگی کا مطلب یہی تھا کہ میں وہاں چلا جاتا تو گرفتاری یقینی تھی۔ مجھے اس بات کی بھی فکر ستانے لگی کہ نہ جانے پولیس والے میرے چچا کے ساتھ کیا برتاؤ کر رہے ہوں۔ اگر اُلکا میرے سر پر ہوتی تو بہت کچھ کر سکتا تھا لیکن وہ اس وقت مالا کے پاس تھی اور اس کی فوری واپسی ممکن نہیں تھی۔

میں نے اسپتال سے کوئی چار میل دور ایک معمولی درجے کے ہوٹل

میں کمرہ لیا اور گوشہ نشین ہو گیا۔ انکا کی واپسی سے قبل میرا آزادانہ گھومنا
پھرنا مصلحت کے خلاف تھا۔ اس روز سارا دن اور تمام رات میں چچا
کی خیریت نہ معلوم ہونے کے سبب مضطرب رہا۔ دوسری صبح اخبار کے
ذریعے مجھے بس اتنا پتہ چل سکا کہ خورشید احمد خاں کو پولیس نے دوبارہ
برآمد کر لیا ہے لیکن ابھی ان کی حالت مخدوش ہے اس لیے پولیس اُن
سے کوئی بیان نہیں لے سکی ہے نامہ نگار نے پولیس کے حوالے سے یہ بھی
لکھا تھا کہ جس شخص نے خورشید احمد خاں کی ضمانت کرائی تھی وہ بھی عنقریب
گرفتار کر لیا جائے گا۔ میں نے اخبار اُٹھا کر زمین پر پھینک دیا۔ پھر میں دن بھر
چچا جان کے بارے میں سوچتا رہا۔ شام ہوئی تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ
خواہ حالات کچھ بھی ہوں میں رات کے وقت اسپتال ضرور جاؤں گا۔ نہ
جانے چچا میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔

رات ہونے تک میں اپنے کمرے ہی میں بند پڑا رہا۔ جب رات کا اندھیرا
ہوا تو میں نے کمرے سے نکلنے کی ٹھانی۔ مجھے اس وقت پریتم لال یاد آیا اس
نے مجھ سے کہا تھا کہ دُنیا کی کوئی قوت مجھے گزند نہیں پہنچا سکتی میں اس
کی طاقت ایک بار ریل میں آزما چکا تھا، دوسری بار کالی کے مندر میں مجھے
پریتم لال کی پُراسرار شکتی کا اندازہ ہوا۔ میرا بے ہوش ہو جانے کے بعد زندہ سلامت
مندر سے باہر آ جانا یقیناً کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ اب ایک ایسا موقع
پھر آ گیا تھا۔ میں نے چادر اُٹھا کر کندھے پر ڈالی اور باہر جانے کا ارادہ کر
ہی رہا تھا کہ دستک کی آواز سن کر چونکا۔ پھر اس خیال سے کہ ہوٹل کا بیرا
برتن واپس لینے آیا ہو گا میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا لیکن دوسرے
ہی لمحے مجھے پیچھے ہٹنا پڑا۔

دروازے پر ہوٹل کے کسی بیرے کے بجائے ایک دُبلا پتلا سادھو کھڑا
ہوا تھا جو جسم پر گیروے رنگ کی ایک دھوتی لپیٹے ہوئے تھا۔ پاؤں میں
کھڑاؤں تھے۔ سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ آنکھیں
چھوٹی چھوٹی لیکن بے حد ڈراؤنی تھیں، میں نے سادھو کو سر تا پا غور سے
دیکھنے کے بعد لاپروا ہو کر پوچھا "کس سے ملنا ہے؟"

جواب میں سادھو نے مجھے کچھ سمجھنے اور جائزہ لینے والی نگاہوں
سے دیکھا پھر ہاتھ کے دھکے سے مجھے پیچھے ہٹا کر اندر آ گیا۔ اس کے جسم
میں بلا کی طاقت تھی۔ مجھے اس کے اس گستاخانہ رویّے پر غصّہ آ گیا
لیکن میری کسی جوابی کارروائی سے پہلے ہی سادھو نے دروازہ اندر سے بند کر
لیا اور میری طرف متوجہ ہو کر سپاٹ آواز میں بولا "بالک۔ کیا تیری مت
ماری گئی ہے جو باہر جانے کی کوشش کر رہا ہے؟" اس کی چمکتی نظریں
میرے سارے جسم کا احاطہ کر رہی تھیں۔

"تم کون ہو اور اس قسم کی باتیں کیوں کر رہے ہو؟" میں نے
زچ ہو کر کہا۔ نہ جانے سادھو کے چہرے پر وہ کون سا تاثر تھا کہ میں اس
کے خلاف کوئی جارحانہ قدم نہیں اُٹھا سکا۔

"میری چنتا مت کر۔ اپنا من ٹٹول۔ اس لمحے اپنے چچا کے پاس
تیرا جانا ٹھیک نہیں" سادھو نے حکمیہ لہجے میں مجھ سے کہا۔ پھر اس سے
پیشتر کہ میں کسی حیرت کا اظہار کرتا یا کوئی جواب دیتا، سادھو نے مجھے حکم
دیا "اب تو یہاں سے باہر قدم نہیں نکالے گا۔"

"مہاراج" میں نے سادھو کے شفقت آمیز حکم سے متاثر ہو
کر جواب دیا "میرے چچا پر جو بپتا پڑی ہے اس کی ذمے داری مجھ پر ہے
میں اپنی جان پر کھیل کر بھی اپنے چچا کو بچانا چاہتا ہوں۔"

"آگے بات نہ کر۔ باہر پگ دھرا تو پکڑا جائے گا" سادھو نے خشک
آواز میں کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا "تیرے من میں جو بے دھڑکا
ہوا ہے تو اپنے چچا کو لے کر یہاں سے جانا چاہتا ہے، پرنتو پولیس کی نظروں
سے کیسے بچے گا؟ اس کی آنکھ میں دھول جھونکنا تیرے بس کی بات نہیں
کوئی اور اُپائے کرنا ہو گا۔ تو چاروں طرف سے گھر گیا ہے۔"

اتنا کہہ کر سادھو نے اپنی آنکھیں بند کر لیں میں بڑی صاف گوئی
سے اعتراف کروں کہ سادھو کی سحر انگیز شخصیت، اس کے لہجے اور اس
کے رویّے نے مجھے دم بخود کر دیا تھا۔ پتہ نہیں اسے میرا راز کس طرح معلوم
ہو گیا۔ آخر اس کا اس طرح میرے پاس آنے سے کیا مقصد تھا؟ کہیں ایسا
تو نہیں کہ کسی بیرے نے میرا کٹا ہوا ہاتھ دیکھ لیا ہو اور پولیس نے اُس کی
مخبری کی تصدیق کے لیے اپنے کسی آدمی کو سادھو کے رُوپ میں میرا کھوج
نکالنے بھیجا ہو؟۔ اس خیال نے مجھے چونکا دیا لیکن ٹھیک اسی لمحے سادھو
نے آنکھیں کھول کر مجھے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا "تیرے پاس منش کو پرکھنے
والی نظر کی کمی ہے۔ تیرے من میں جو کھوٹ ہے اسے دور کر۔ میں تیری سہائتا
کے کارن یہاں آیا ہوں اور تو مجھ پر شک کرتا ہے اپرادھی۔"

سادھو کی بات سن کر میں اور حیرت زدہ ہو گیا۔ میری آنکھیں کھلی
کی کھلی رہ گئیں۔ میرے دل میں جو شبہ اُبھرا تھا وہ جاتا رہا۔ میں نے عقیدت
مندانہ نظروں سے سادھو کی طرف تکتے ہوئے کہا "بگڑے ہوئے حالات
منش کو اپنے سائے سے بھی خوف کھانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مجھے شما

کر دو مہاراج؟"

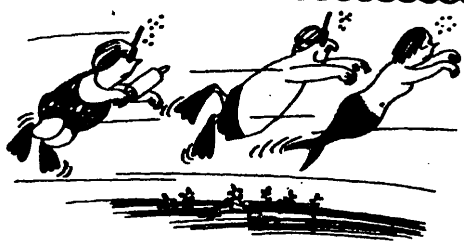
"سُن، تو صبح والی گاڑی سے بنارس چلا جا۔ اس کے لیے تجھے چنتا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، میرا آشیرواد تیرے ساتھ ہے، کوئی شکتی تجھے راستے میں پریشان نہیں کر سکتی۔"

"مگر میرے چچا کا کیا ہوگا مہاراج۔ میں انھیں چھوڑ کر کیسے جاؤں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تو اس کی چنتا نہ کر مورکھ۔ اسے مجھ پر چھوڑ دے، میں تجھے وچن دیتا ہوں کہ سب کچھ تیری آشا کے انوسار ہوگا۔" سادھو نے ترشی سے کہا "پرنتو یہ دھیان میں رکھنا کہ کہیں اور نہ بھٹکنا ورنہ پچھتائے گا۔"

میں جواب دینے میں ہچکچا رہا تھا۔ سادھو نے اس کی مطلق پروا نہ کی، اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ کئی لمحوں تک میں سوچتا رہا اور پھر ایسے عالم میں کیا فیصلہ ہوتا۔ چچا جان کو اس حالت میں چھوڑ کر جانا مناسب نہیں تھا لیکن اب سادھو کا حکم ٹالنا بھی میرے بس کی بات نہیں تھی۔ کوئی میرے اندر سے مجھے بار بار اکسا رہا تھا کہ میں سادھو کی ہدایت پر بے چون وچرا عمل کروں۔ رات بھر میں اسی ادھیڑبن میں مبتلا رہا۔ بنارس کی گاڑی صبح ساڑھے پانچ بجے جاتی تھی، نیند میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی، میں نے رات ہی بینجر کو بلا کر بل ادا کیا اور ڈرتا جھجکتا اسٹیشن کی طرف چل دیا میں نے اس وقت بھی اپنا ہاتھ چادر میں چھپا رکھا تھا۔ اسٹیشن پر میرے اندیشے کے عین مطابق پولیس والے موجود تھے۔ کچھ سادہ لباس والے بھی تھے جو ایک ایک مسافر کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے دوسرے درجے کا ٹکٹ لیا اور انتظار گاہ میں جا کر بیٹھ گیا جب تک گاڑی نہ آگئی اور میں اس پر بیٹھ کر اسٹیشن کی حدود سے باہر نہیں نکل گیا، مجھے برابر اس بات کا خدشہ لاحق رہا کہ کہیں کسی مشکوک نظر کی زد میں نہ آجاؤں لیکن سادھو کا کہا ٹھیک ثابت ہُوا۔ پولیس والوں اور سادہ لباس والوں نے مجھے دوسرے مسافروں کی طرح ٹٹولتی ہُوئی نظروں سے دیکھا تو ضرور لیکن کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ سفر کے دوران مجھے برابر اپنے چچا کی فکر لاحق رہی اور ساتھ ہی مالا کی یاد بھی ستاتی رہی۔

بنارس پہنچ کر میں گاڑی سے اترا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ کلکتے کے ہوٹل کے کمرے میں ملنے والا سادھو وہاں پہلے سے میرا منتظر تھا۔ مجھ پر حیرتوں نے یلغار کر دی۔ یہ یہاں کس طرح پہنچا؟ متعدد سوالات ذہن میں کلبلانے لگے، میں ابھی اس بات پر ششدر ہو رہا تھا کہ سادھو خاموشی



سے میرا ہاتھ پکڑ کر پہلے درجے کی انتظار گاہ کی جانب چلنے لگا۔ میں چپ نہ رہ سکا، بے چینی سے پوچھ بیٹھا۔ "مہاراج۔ میرے چچا کا کیا حال ہے؟"

"دھیرج سے کام لے بالک۔" سادھو نے میرے سوال پر کوئی توجہ نہ دی۔

انتظار گاہ کے دروازے پر پہنچ کر سادھو نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور گمبھیر لہجے میں کہنے لگا "بالک اندر جا کر بیٹھ جا۔"

سادھو کا لب و لہجہ اور انداز ناقابلِ فہم تھا۔ اس کی شخصیت میرے لیے معمّہ تھی۔ پہلے اس نے مجھے کلکتے سے روانہ کیا۔ پھر خود بھی بنارس آ گیا۔ وہ اچانک میری مدد کو کس طرح آ گیا۔ آخر یہ سب کیسے اسرار ہیں؟ میں خاموشی سے اس کی ہدایت پر انتظار گاہ میں داخل ہُوا۔ مگر اندر قدم رکھتے ہی میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ میرے چچا سامنے ایک صوفے پر لیٹے سو رہے تھے۔ میں تیزی سے باہر نکلا، سادھو کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض تھا لیکن سادھو مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے اسٹیشن کا کونا کونا چھان مارا لیکن وہ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ پھر میں نے انتظار گاہ کی طرف لوٹتے ہُوئے ایک قلی سے سادھو کے بارے میں پوچھا۔ قلی نے سادھو کا ذکر سنا تو مجھے حیران کُن نگاہوں سے دیکھنے لگا "کس سادھو کی بات کرتے ہو صاب۔ تم تو تنہا تھے۔ میں نے خود تمھیں ویٹنگ روم میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"میرے ساتھ ایک سادھو بھی تھا۔" میں نے قلی کو باور کرانے کی کوشش کی۔ "اس کے جسم پر گیروے رنگ کی دھوتی بھی تھی۔"

"کیوں مذاق کرتے ہو صاب، میری آنکھیں ابھی ٹھیک ہیں، تم اپنے ڈبے سے اُتر کر سیدھے اِدھر آئے تھے، تمھارے ساتھ کوئی اور آدمی نہیں تھا۔ تمھیں دھوکا ہوا ہے صاب، زیادہ تھک گئے ہو؟"

قلی سے مزید استفسار بے سود تھا۔ قلی کو سادھو کا نظر نہ آنا



حیرت انگیز تھا جبکہ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس قلی نے مجھے سادھو کے ساتھ انتظار گاہ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ نہ جانے یہ سب کیسے ہو گیا تھا ذہن پر بہت زور دیا لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر میں دوبارہ اندر داخل ہو گیا۔ میرے چچا بدستور آنکھیں بند کیے پڑے تھے، ان کے چہرے پر نقاہت تھی، مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے سادھو کے بارے میں ضرور کچھ بتا سکیں گے۔ بنارس تک یقیناً وہی پراسرار سادھو انھیں لایا ہوگا۔ میں نے چچا جان کے قریب جا کر انھیں غور سے دیکھا۔ سونے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ گہری نیند میں ہیں، مجھے ایک بات پر اور بھی ششدر ہونا پڑا۔ چچا کو میں نے خود اپنی آنکھوں سے سرتاپا زخمی دیکھا تھا۔ اسپتال میں انھیں دو دن رہنا پڑا تھا محض دو دنوں میں زخموں کے نشانات کا اس طرح غائب ہو جانا کہ کہیں نشان تک نہ رہے بڑی تعجب خیز بات تھی۔ پھر یہ کہ چچا کے پاس صرف ایک شیروانی تھی جسے پولیس والوں نے تار تار کر ڈالا تھا اس وقت وہ ایک نئی شیروانی میں ملبوس تھے۔

اب مجھے یہ فکر تھی کہ ہوش میں آنے کے بعد جب وہ مالا کے بارے میں باز پرس کریں گے تو میں کیا جواب دوں گا۔ مالا کا نام میں نے انھیں نرگس بتایا تھا اور نرگس کو اپنی بیوی ظاہر کیا تھا۔ میں ابھی اسی پریشانی سے دوچار تھا اور سوچ سوچ کر الجھ رہا تھا کہ یکلخت میرے بالوں میں جنبش ہوئی۔ میں نے چونک کر تصوّر کے عالم میں سر کی جانب دیکھا تو دل باغ باغ ہوگیا۔ میری انکا میرے سر پر موجود تھی۔ اس کے چہرے پر شوخی اور مسکراہٹ تھی۔ میں نے سب سے پہلے اس سے مالا کے بارے میں دریافت کیا۔ جس کے جواب میں انکا نے بتایا کہ وہ میرے حکم کے مطابق اسے میرے چچا کے مکان پر لکھنؤ چھوڑ آئی ہے۔ حالات کے تحت اس نے اپنا پُراسرار وجود مالا پر ظاہر بھی کر دیا تھا اور اسے کچھ ضروری ہدایتیں بھی دے آئی تھی تاکہ چچا کے لڑکے اور لڑکیاں اس پر سوالات کی بوچھاڑ کریں تو وہ انھیں خاطر خواہ جواب دے سکے۔ مالا کے بارے میں جان لینے کے بعد میں نے انکا کو اپنے اور چچا کے بارے میں تفصیل بتائی تو اس نے انکشاف کیا۔ ”جمیل، جس شخص کی تم بات کر رہے ہو، وہ دراصل پریتم لال کا ایک دوست تھا۔ شاید پریتم لال نے مرنے سے پہلے اُسے تمھارے بارے میں کچھ بتایا ہو یا اس کی آتما نے تمھاری سفارش کی ہو بہرحال پریتم لال کی شکتی نے پھر تمھاری مدد کی ہے۔ یہ سادھو اپنی عظیم طاقت کے نشے میں ایک بار پریتم لال سے بھی ٹکرا چکا ہے لیکن اسے منہ کی کھانی پڑی۔ پھر یہ سچّے دل سے پریتم لال کا دوست بن گیا۔ یہ کوئی چالیس سال پہلے کی بات ہے اس کا نام جگدیو ہے۔ یہ بوڑھا بھی پہاڑیوں کی کھوہ میں تنہا رہتا ہے۔

اگر سادھو کی حقیقت کا مجھے پہلے علم ہو جاتا تو میں یقیناً دل کھول کر اس کی پذیرائی کرتا اور اس سے دوستی بڑھاتا۔ اب وہ ہاتھوں سے نکل چکا تھا انکا نے اس کے متعلق مجھے بہت کچھ بتایا اور میں کفِ افسوس ملتا رہا۔ پھر انکا کے مشورے پر میں نے چچا جان کو بیدار کیا۔ چھ سات بار آوازیں دینے کے بعد بازو سے ہلایا تو انھوں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ آنکھیں پھاڑے دیر تک یہ بدلی ہوئی جگہ دیکھتے رہے۔ پھر بولے ”نرگس کہاں ہے اور ہم لوگ اس وقت کہاں بیٹھے ہیں؟“

”ہم لوگ اس وقت بنارس ریلوے اسٹیشن پر ہیں۔ نرگس کو میں نے لکھنؤ بھجوا دیا ہے۔ اس وقت وہ آپ کے بچّوں کے ساتھ ہوگی“ میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

”لکھنؤ بھجوا دیا۔ کیوں؟“ چچا جان نے حیرت سے پوچھا۔ پھر کچھ یاد کر کے بولے۔ ”ہم لوگ کلکتے کے کسی ہوٹل میں مقیم تھے۔ ایکاایکی بنارس کیسے آ گئے؟“

” آپ اپنے ذہن پر زور نہ دیجیے“ انکا کی ہدایت پر میں نے ایک

مختصر فرضی داستان سُنا کر انہیں مطمئن کرنا چاہا۔" چچا جان کلکتے میں آپ کی طبیعت اچانک ایسی خراب ہوگئی تھی کہ آپ کوئی چار روز اسپتال میں بے ہوش پڑے رہے چنانچہ میں نے نرگس کو لکھنؤ بھجوا دیا اور خود آپ کی دیکھ بھال کے لیے رُک گیا۔ اب ڈاکٹروں کے مشورے پر آپ کو لکھنؤ لے جا رہا ہوں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ جلد صحت یاب ہوگئے۔"

چچا نے میری تخلیق کی ہوئی سرگزشت سُنی تو تشویش میں پڑ گئے۔ وہ بار بار کرید کرید کر مجھ سے سوالات کرتے اور میں انہیں اپنی دانست میں اطمینان بخش جواب دے دیتا پھر بھی وہ مضطرب ہی رہے۔ الٹے سیدھے منہ بناتے رہے اور کہنے لگے۔ "مجھے کچھ بھی یاد نہیں آتا۔ نہ جانے مجھے کیا ہوگیا ہے۔ دماغ کچھ بوجھل سا معلوم ہوتا ہے۔ اب تم یہاں کیوں رُک گئے۔ لکھنؤ کب چلو گے؟"

میں نے انہیں تسلّی دی اور خود اٹھ کر باہر آگیا۔ لکھنؤ جانے کے لیے ہمیں ابھی دو گھنٹے انتظار کرنا تھا۔ میں نے دو ٹکٹ خریدے اور دوبارہ انتظار گاہ میں آگیا۔ چچا جان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ دیوانگی کی حالت میں اپنی شیروانی کی اندر کی جیب باہر نکالے اس پر بار بار ہاتھ مار رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو رُندھی ہوئی آواز میں بولے۔ "جمیل بیٹے! میری رقم کیا ہوئی۔ تم نے تو نہیں نکالی؟"

"جی نہیں۔" میں جلدی میں کہہ گیا۔

"میں برباد ہوگیا بیٹے۔ مہاجن نے مجھے ایک لمبی رقم دی تھی۔ میں نے تم سے تذکرہ بھی کیا تھا۔ وہ رقم اب میری جیب میں نہیں ہے۔ یہ شیروانی بھی میری نہیں ہے۔ اب کیا ہوگا۔ وہ ظالم بنیا تو مجھے زندہ در گور کر دے گا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ دُنیا کیا سمجھے گی۔ ساتھ میں تمہاری جوان جوان بہنیں ہیں بیٹے یہ سب کیا ہوا؟ مجھے اپنا سامان بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔"

مجھے غلطی کا احساس ہوا۔ انکل نے فوراً مجھے بتایا کہ جو رقم مہاجن نے چچا جان کو اعتماد سے دی تھی وہ پولس والوں نے اُڑا لی۔ میں نے چچا جان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ کسی بات کی فکر نہ کیجیے۔ آپ کے ساتھ آپ کا بھتیجا جو موجود ہے۔ ہم سب کا سامان چوری ہوگیا ہے اس لیے کہ میں آپ کے ساتھ اسپتال میں رہا اور میری عدم موجودگی میں کوئی بدنیت سارا سامان لے گیا۔ لکھنؤ پہنچتے ہی جتنی رقم آپ کہیں گے میں فراہم کر دوں گا رہا مہاجن کا مسئلہ تو آپ اسے بھول جائیں میں اب آپ کو ملازمت بھی نہیں کرنے دوں گا۔ خدا نے آپ کی دُعا سے بہت دے رکھا ہے۔"

چچا جان بہت تلملائے۔ مگر کیا کرتے۔ سرد سرد آہیں بھر کر خاموش ہوگئے۔ چپ چاپ بیٹھے ہاتھ ملتے رہے۔ ان کی غیرت مند آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ میں نے یہ موضوع مزید جاری رکھنے سے گریز کیا اور دوسری باتیں چھیڑ دیں۔ انہیں ہر طرح کا اعتماد دلایا۔ دو گھنٹے بعد گاڑی آئی تو میں چچا جان کے ساتھ بنارس روانہ ہوا۔ چچا جان اب تک ملول نظر آ رہے تھے۔ راستے میں ہمارے درمیان زیادہ باتیں نہیں ہوئیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ ان کی دو لڑکیاں ہیں اور ایک لڑکا ہے۔ لڑکا زیرِ تعلیم ہے اور لڑکیاں گھر کی ذمے داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔ ابھی تک ان دونوں کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ انکل بھی چچا جان کی پریشانی سے دل گرفتہ تھی۔

ہم اوّل درجے کے ڈبّے میں تھے۔ ڈبّے میں ہمارے سوا کوئی دوسرا مسافر نہیں تھا لیکن الٰہ آباد کے اسٹیشن سے ایک ایسی سراپا ناز میرے ڈبّے میں آئی کہ میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اس حسین و جمیل



لڑکی کی عمر مشکل سے اٹھارہ سال ہوگی۔ اس کے خدوخال بہت نظر فریب اور بہت ہی دلکش تھے۔ وہ ناک میں ایک بڑا سا نتھ اور آسمانی رنگ کا دوپٹا پہنے ہوتے تھی۔ غرارے جمپر اور زیورات سے لدی پھندی چمن کا نوشگفتہ نودمیدہ پھول معلوم ہو رہی تھی۔ لانبا قد، متوازن بدن، آنکھیں ہرنیوں جیسی، انداز میں تمکنت۔ گفتگو سے کلیاں مہکیں۔ دو افراد اسے چھوڑنے آئے تھے۔ ساتھ میں ادھیڑ عمر کی ایک عورت بھی تھی۔ میں چچا جان کی موجودگی کے باعث صرف کنکھیوں سے لڑکی کو دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں قدرت کی صناعی کی داد دیتا رہا۔ دل تھا کہ اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ نظر تھی کہ اس کی جانب مسلسل دیکھنے کو بے قرار تھی۔ جب لڑکی اپنی ماں کے ساتھ جم کر بیٹھ گئی اور گاڑی الہ آباد سے روانہ ہوئی تو چچا جان نے اوپر کی نشست پر جا کر خراٹے لینے شروع کر دیئے۔ لڑکی میری بائیں جانب اپنی نشست پر بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ میں اس کے خیال افروز نظارے میں گم تھا کہ انکا رینگ کر میرے شانے پر اتر آئی اور بہت دنوں بعد اٹھلاتے ہوئے بولی "کیوں جی مچل رہا ہے نا؟"

"ہاں" میں نے شرما کر کہا۔

"بہت اچھی ہے نا؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"بہت خوبصورت۔"

"تم بڑے ندیدے ہو۔" وہ شوخی سے بولی۔

"کون ہے یہ کچھ بتاؤ تو" میں نے کریدا۔

"بتا دوں؟ سچ مچ۔"

"بتاؤ نا۔ تم تو تڑپاتی ہو۔"

"تو دل پر ہاتھ رکھ کر سنو۔ اس کا نام تزئین ہے۔ لکھنؤ کی ایک مشہور طوائف کی اکلوتی لڑکی اس کے ساتھ جو عورت ہے وہ اس کی ماں کی معتمد خادمہ ہے۔ الہ آباد میں اپنے پہلے مجرے کی غرض سے آئی تھی۔ ابھی اس کی نتھ نہیں اتری ہے۔ لکھنؤ کے بڑے بڑے رئیس بڑھ بڑھ کر بولیاں لگا رہے ہیں لیکن تجربہ کار ماں نے ابھی تک کسی بولی پر حامی نہیں بھری ہے وہ ایک زمانہ شناس اور فتنہ پرداز عورت ہے۔ لڑکی کے ذریعے پہلے ہی وار میں اتنی رقم اینٹھ لے گی کہ باقی زندگی آرام سے گزر جائے۔"

"انکا! تزئین تو بہت خوبصورت ہے اور بہت معصوم معلوم ہوتی ہے اسے تو کسی محل میں ہونا چاہیئے۔ اگر یہ برباد ہوگئی تو مجھے افسوس ہوگا۔"

"تمہیں کیوں افسوس ہوگا۔ تمہارا اس سے کیا واسطہ؟"

"نہ معلوم کیوں میں اس کے لیے اپنے دل میں شدید انسیت اور اپنائیت محسوس کر رہا ہوں۔ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ یہ کسی معزز گھرانے سے وابستہ ہو۔ اس کی شادی شریفانہ طریقے سے ہو۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو جمیل؟ میں تو تمہاری دلچسپی کا مقصد کچھ اور ہی سمجھی تھی۔"

"دیکھو نا انکا" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اس کے چہرے کی معصومیت اور اس کا حرص و ہوس کو ہوا دینے والا شباب دیکھ کر کون ظالم اس کی بھلائی نہیں سوچے گا" میں نے لڑکی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"سوچ لو جمیل اس کی ماں بڑی ظالم عورت ہے۔ تم جو کچھ سوچ رہے ہو۔ وہ قریب قریب ناممکن ہے۔ تمہاری دال مشکل سے گلے گی نہ جانے کون کون امید لگائے بیٹھا ہے۔" انکا سنجیدہ ہو کر بولی۔

"لکھنؤ پہنچ کر دیکھا جائے گا۔ لکھنؤ میں کچھ دن آرام کے گزارے جائیں گے۔ میں تھک بھی تو بہت گیا ہوں۔"

وہ حسین لڑکی تزئین کچھ دیر تک باہر کے بھاگتے ہوئے مناظر کا نظارہ کرتی رہی۔ پھر اس نے مجھ پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور اپنے بستر پر نیم دراز ہو کر کسی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگی۔ میں دلچسپ نظروں سے اس کی خوبصورتی اور معصومیت دیکھتا رہا اور سوچتا رہا، اس کی خادمہ اور نگران غنودگی کی حالت میں تھی اور چچا جان بھی گہری نیند سو رہے تھے۔ نیند آتی تھی پر نہیں آتی تھی۔ جب طبیعت بہت مضطرب ہوئی تو میں نے کچھ سوچ کر انکا کو حکم دیا کہ وہ اس کی خادمہ کے سر پر چلی جائے انکا میرے سر سے اتر گئی۔



جمیل احمد خاں اور انکا کی اس دلچسپ پُراسرار سرگزشت کا سلسلہ جاری ہے۔ باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔



جب پُرتگال کے مغربی ساحل پر تراشیدہ لکڑیوں کے چند ٹکڑے اور غیر معمولی شکل کی دو انسانی لاشیں بہہ کر خشکی پر آگئیں تو مہم جُو ملاح نے زمین کی شکل کے بارے میں زمانے سے ہٹ کر سوچنا شروع کیا۔ اب اُسے یقین ہو چکا تھا کہ زمین گول ہے اور لکڑی کے ٹکڑے اور دونوں لاشیں مغرب کے کسی نامعلوم ملک سے بہہ کر وہاں تک پہنچی ہیں ۔ وہ تجربے سے اپنے اس یقین کو سچ کر دکھانا چاہتا تھا، لیکن تجربے کے لیے کثیر رقم کی ضرورت تھی۔ اس رقم سے وہ مضبُوط جہاز، کھانے پینے کی اشیا کی وافر مقدار اور اپنے ساتھیوں کا تعاون حاصل کرتا۔ شاہِ پرتگال نے مدد کا وعدہ کیا لیکن حیلے حوالوں پر ٹالتا رہا بالآخر وہ پرتگال سے اسپین چلا گیا۔ وہاں مسیحی فرماں روا فرڈی ننڈ اور اُس کی ملکہ آزابیلا نے عربوں کو اُندلس سے نکال کر خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔

فروری ۱۴۹۲ء کی ایک صبح، سفید ریش بوڑھا، شکستہ دلی سے خچر کی پُشت پر سوار قلعہ الحمرا کی طرف جا رہا تھا۔ اُس کا سر مایُوسی کے بوجھ سے جُھکا ہوا تھا۔ وہ ماضی کے اس المناک تصوّر میں بھٹک رہا تھا جس نے اُسے فاقوں تک پہنچا دیا تھا۔ وہ شیخ چلّی کی طرح مغرب کی نامعلوم سرزمین تک پہنچنے کے نقشے اور منصوبے بناتا رہا یہاں تک کہ اُس کی معاشی حالت تباہ ہوگئی، بیوی کا انتقال ہوگیا اور دوستوں نے اُسے دیوانہ اور خبطی سمجھ کر کنارہ کشی اختیار کر لی۔ جب وہ قصرِ الحمرا میں فرڈی ننڈ اور ملکہ ازابیلا کے رُوبرُو پہنچا تو وہاں پہلے ہی سے چند عقلمند بحث مباحثوں میں اُلجھے ہوتے تھے۔ اُنہوں نے دِل شکستہ اور پریشان حال ملاح کو گردن جھکاتے ہُوئے اندر داخل ہوتے دیکھا تو کسی نے بھی جوش اور سرگرمی سے اس کا استقبال نہ کیا۔ ماحول خاموشی میں ڈُوب گیا لیکن چند لمحوں بعد ایک عقلمند کی آواز سُنائی دی۔ اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "اگر زمین گول ہے تو یہ قائم کس چیز پر ہے ؟"

ملاح نے سوال کیا۔ "اگر سُورج اور چاند گول ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ زمین بھی گول نہ ہو۔ رہا سوال یہ کہ اگر زمین گول ہے تو یہ قائم کس چیز پر ہے، اس سوال کے جواب میں میں یہ پوچھتا ہوں کہ یہ چاند اور سُورج کس چیز پر قائم ہیں ؟"

جواب کے بجائے، کسی بہت بڑے عالم نے کہا۔ "آدمی کا سر نیچے ہو اور پیر اُوپر تو یہ چل کس طرح سکتا ہے ؟" کسی دُوسرے فلسفی نے کہا: "آدمی تو آدمی سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ پانی جیسی سیّال شے کس طرح رُکی رہ سکتی ہے کیا یہ بہہ نہیں جائے گا ؟" کسی پادری نے مقدّس لہجے میں کہا۔ "اور پھر زمین کے گول ہونے کا اصُول انجیلِ مقدّس کے سراسر خلاف ہے ۔ انجیل میں صاف صاف یہ بتایا گیا ہے کہ آسمان شامیانے کی طرح تنا ہُوا ہے اور زمین سپاٹ ہے ۔ زمین کو گول کہنا کُفر میں داخل ہے ۔"

ملاح اس بوچھاڑ سے تنگ آ کر اُٹھا اور آہستہ آہستہ اپنے خچر کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ خچر تک نہیں پہنچا تھا کہ ایک خدمتگار نے اُسے روک کر بتایا کہ "ملکہ ازابیلا تم سے مِلنا چاہتی ہے ۔" ملاح اس خدمتگار کے ساتھ ملکہ کے پاس چلا گیا۔

ملکہ نے گرمجوشی سے اُس کا استقبال کیا اور کہا: "ملاح! تم مایُوس مت ہو سرمایے کا انتظام میں کرُوں گی تم سفر کی تیاریاں کرو۔ تمہاری مہم کے مصارف میں برداشت کرُوں گی، اس کے لیے اگر مجھے اپنے زیورات تک گروی رکھنے پڑے تو بھی گریز نہ کرُوں گی۔"

ملکہ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ مہم جُو اور سر پھرا ملاح اپنے جہاز کو لے کر کسی نامعلوم دُنیا کی تلاش میں روانہ ہوگیا اور ۱۲، اکتوبر ۱۴۹۲ء کو اُس نے ایک نئی دُنیا دریافت کر لی۔ جزائر غرب الہند کی سرزمین اُس کی محنتوں کے صِلے میں سامنے آگئی اور اُس نے خشکی پر قدم رکھتے ہی جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا۔ "ملکہ آزابیلا اور فرڈی ننڈ کے جھنڈے کی تنصیب ۔"

آج اس نئی دُنیا امریکہ سے کون ہے جو واقف نہیں ۔ امریکہ کے تصوّر کے ساتھ ہی کولمبس کا نام خود بخود ذہن میں آجاتا ہے اور کولمبس کے ساتھ ہی ملکہ ازابیلا بھی شہرتِ دوام حاصل کر چکی ہے۔ ایسی شہرت جو مُلکوں کی تسخیر اور کشت و خُون سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع ہے۔

* عشق کی مہم *

آپ بریگیڈیر جیرارڈ سے خوب واقف ہوگئے ہوں گے۔ کون جیرارڈ؟ نپولین کی گھڑسوار فوج کا ایک بہادر شخص۔ اُس کی باتیں دِلچسپ اور اُس کے کارنامے بے مثال ہیں۔ اُنہیں پڑھ کر حوصلے جوان ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا تھا۔ خطروں سے کھیلنا اُس کا مشغلہ اور آگ میں بے خطر کُود جانا اُس کا پیشہ تھا۔ کوئی بھی مرحلہ ہو وہ اُس میں خوفناک حد تک سنجیدہ ہوجاتا تھا۔ وہ رزم گاہ ہو یا بزمِ ناز۔ جب وہ ہتھیاروں سپاہیوں گھوڑوں اور معرکوں کا ذِکر کرتا ہے تو ایک کھرے جیالے کی شجاعت اُس میں جھلکتی ہے۔ جب وہ حُسن وعشق اور فنونِ لطیفہ کے بارے میں زبان کھولتا ہے تو وہ ایک شاعر ایک مُصوّر اور موسیقار بن جاتا ہے۔ اُس کا اندازِ بیان بے حد دِلکش، پُرلطف اور نرالا ہے۔ ایک کیفے میں وہ اپنے ماضی کے ناقابلِ فراموش واقعات سُنا رہا ہے اور سُننے والے ہیں کہ تمام دلچسپی تمام اشتیاق سے اُسے سُن رہے ہیں۔ اپنے بارے میں اُس کا خیال ہے کہ وہ ایک خبطی اور بیوقوف آدمی ہے۔ مگر آپ اُس کی شاندار مُہمیں پڑھ کر خود اندازہ لگائیے کہ وہ کِس قدر سچ کہتا ہے۔ ہاں اُس کے اندر ایک کمزوری ہے کہ وہ خُود پسند ہے خاصا شیخی بگھارنے اور خود اپنی تعریف وستائِش کرنے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اپنی دلیری کے واقعات اُسے بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی عادت ہے لیکن وہ ایک پیارا، معصوم اور سچا آدمی ہے۔ کون اُس کی باتوں کو تسلیم نہیں کرے گا۔ اُس کے چہرے کی جھریاں اور سینے پر آویزاں تمغے اُس کی خودستائیوں کی تصدیق کیلیے موجود ہیں

سب سے بڑی بات یہ کہ ان واقعات کو شرلاک ہومز کے ابدی کردار کے خالق، سر آرتھر کانن ڈائل نے لکھا ہے۔ جیرارڈ جیسے غیر معمولی شخص کے کارنامے ہوں اور کانن ڈائل کا قلم تو کیسی دلچسپ اور خوبصورت تحریریں پڑھنی نصیب نہ ہوں گی۔ اتفاق سے راجپوت اقبال احمد نے بھی جیرارڈ کی اس چوتھی کہانی کا ترجمہ کیا تھا اور حمید اللہ خاں حسن پوری نے بھی۔ میں نے راجپوت اقبال احمد کا ترجمہ رہنے دیا کیونکہ وہ میرے دوست ہیں اور حسن پوری صاحب میرے بزرگ۔

مُدیر



بریگیڈیئر جیرارڈ پیرس کے ایک قہوہ خانے میں ہمنشینوں سے اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ اور سب لوگ اس کی طرف متوجہ تھے۔

میرے دوستو! میں نے کثرت سے بڑے بڑے شہر دیکھے ہیں صحیح تعداد کس طرح بتاؤں۔ اُن میں سے اکثر شہروں میں مجھے اپنے آٹھ سو مسلح بہادر ماتحتوں کے ساتھ فاتحانہ انداز میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ گرانڈ آرمی یعنی بڑی فوج کے آگے گھڑسواروں کے رسالے اور ان رسالوں کے آگے ولایتی لڑاکا سپاہیوں کا رسالہ اور اس رسالے کے پیش پیش یعنی سب سے آگے بندہ ہوتا تھا۔ جتنے شہر ہم نے دیکھے ان میں وینس کی تعمیر عجب بے ہودہ طرز کی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان لوگوں نے اس شہر میں رسالے کے ساتھ داخل ہو کر جنگ کرنا کیوں مناسب خیال کیا تھا جنرل میورنٹ یا لاسلی حیران تھا کہ وہ کس طرح اپنا اسکواڈرن شہر کے محلوں اور گلیوں میں گھمائے گا۔ اسی وجہ سے کلرمین کا بھاری بریگیڈ اور میرا رسالہ پڈوا کے وسیع میدان میں پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا۔ البتہ جنرل سوچیٹ اپنی پلٹن کے ساتھ شہر میں داخل ہوا تھا اور اُس نے مجھے موسم سرما کے لیے اپنا اے ڈی سی منتخب کر لیا تھا۔ وہ اٹلی کے پٹھے بازوں سے میلان کے مقام پر دو دو ہاتھ کرنے کا متمنی تھا۔ یہ شخص عمدہ شمشیر زن تھا۔ میں اسے فرانس کی فوج کی بدنصیبی کہوں گا کہ میرے سوا اور کوئی اُس کا مدِمقابل نہ تھا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجیے کہ اگر کوئی بدذوق شخص پیرس کی مشہور ترین حسین وجمیل مُطربہ پریما ڈونا کا گانا پسند نہیں کرتا تو وہ اس کے خلاف عام منافرت پھیلانا بھی گوارا نہ کرے گا۔ بس اسی قسم کی ہمدردی اُسے میرے ساتھ تھی۔ اس لیے وہ مجھے اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا غرض ہم سوچیٹ کے ہم رکاب شہر وینس میں داخل ہوئے وینس میں میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ دوستو۔ دل والے ہو تو اسے سنو۔

جیرارڈ کے کارنامے

کانن ڈائل کے قلم سے

حمید اللہ خان حسن پوری

کیا آپ کبھی وینس گئے ہیں؟ نہیں۔ اس لیے کہ فرانسیسی لوگ شاذونادر ہی سفر کرتے ہیں۔ اُن دنوں ہم بڑے سیّاح تھے یاسکو سے قاہرہ تک ہم ہر جگہ گھومے پھرے کافی بڑی جماعت ہمارے ساتھ ہوتی تھی۔ ہم جہاں جاتے وہیں سفر کی آسائش مہیّا ہو جاتی۔ راہ داری کے پروانے تو ہمارے بازوؤں کی لچک میں تھے، یورپ کے لیے وہ دن بڑا منحوس ہوتا تھا۔ جب فرانس والے سفر پر روانہ ہوتے تھے، فرانسیسی گھر سے نکلتے وقت بہت کاہل ہوتے ہیں۔ مگر جب وہ نکل جاتے ہیں اور مجھ جیسے سپاہی ان کی راہبری کے لیے ہوتے ہیں تو پھر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ وہ کہاں تک جائیں گے اور کب واپس آئیں گے، مگر وہ زمانہ گزر گیا۔ وہ لوگ مر چکے، البتہ ان میں سے ایک میں باقی رہ گیا ہوں اور قہوہ خانے میں ارغوانی شراب پی کر پرانی داستانیں سنایا کرتا ہوں۔

ہاں۔ تو میں وینس کے بارے میں آپ سے کہہ رہا تھا۔ اس شہر میں لوگ اس طرح رہتے ہیں جیسے دلدلی کناروں پر چوہے رہتے ہیں، مگر یہاں کے مکانات بڑے عالیشان ہیں خصوصاً گرجا اور اُن میں بالخصوص سینٹ مارک جیسی عظیم الشان عمارات میں نے کم دیکھی ہیں۔ خاص بات



یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے بتوں کی اور تصاویر کی بے حد قدر کرتے ہیں۔ یہ چیزیں فنی خوبیوں کے اعتبار سے یورپ بھر میں مشہور ہیں۔ سپاہیوں میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کا پیشہ محض جنگ اور لوٹ مار کرنا ہوتا ہے، وہ اس کے سوا کوئی اور بات سوچنے کے لیے کبھی دماغ پر زور نہیں دیتے۔ ہمارے ہاں بیوٹ نامی ایک سپاہی تھا جو پروشین کے ہاتھوں اُس دن مارا گیا جس دن مجھے شاہی تمغہ عطا ہوا تھا۔ اُس کی حالت یہ تھی کہ اگر اُس شخص سے کیمپ کے باہر کسی قہوہ خانے میں بیٹھ کر علم و فضل کے موضوع پر گفت گو کی جاتی تو وہ غریب منہ لٹکا کرتا تھا۔ اسے آپ خود ستائی نہ سمجھیں، میری طرح مکمل سپاہی وہی ہے جو دوسروں کی باتیں سمجھے اور ان کے دل و دماغ کی کیفیت محسوس کرے۔ درحقیقت جب میں فوج میں بھرتی ہوا تھا تو بہت کم عمر تھا۔ ایک کوارٹر ماسٹر سے میں نے پڑھنا لکھنا سیکھا۔ دُنیا میں گھومنے پھرنے سے آنکھیں کھلتی ہیں اور انسان بہت کچھ سیکھ جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے وینس کی تصاویر کی تعریف اور ان بزرگ ہستیوں کے ناموں سے واقفیت حاصل کی جنہوں نے وہ شاہکار تصویریں بنائی تھیں۔ مچل ٹٹانس، اینجلس اور دوسرے صناع جنھوں نے ان سپہ سالاروں کو رنگ و روغن دیئے تھے۔ کون کہتا ہے، نپولین نے ان کی تعریف نہیں کی۔ شہر فتح کرتے ہی اُس نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ بہترین مجسّمے انتخاب کر کے پیرس روانہ کر دیئے تھے جو ہم لے سکتے تھے ہم نے لے لیے۔ میرے حصے میں دو تصویریں آئی تھیں، ایک کا نام تھا "حیران پری" اور دوسری کا نام "پیر بیابان"۔ میں نے "حیران پری" اپنے لیے رکھ لی اور "پیر بیابان" اپنی والدہ کو تحفتہً بھیج دی۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے کچھ آدمیوں نے ان تصویروں اور مجسموں کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا۔ وینس کے لوگ ان شاہکاروں سے بہت اُنسیت رکھتے تھے خصوصاً پیتل کے اُن چار گھوڑوں سے اُنھیں بہت عقیدت تھی جو بڑے گرجا کے صدر دروازے پر نصب تھے، ان گھوڑوں کا وہ اتنا احترام کرتے تھے جیسے سعادت مند اولاد اپنے اسلاف کا احترام کرتی ہے۔ مجھے ہمیشہ گھوڑوں کے انتخاب سے دلچسپی رہی ہے، اس لیے میں بھی انہیں استحسان کی نظر سے دیکھتا تھا مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وینس کے لوگ انھیں اس قدر اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے ہاتھ پیر رسالے کے گھوڑوں سے کچھ زیادہ موٹے اور توپ خانے کے گھوڑوں سے کسی قدر کم تھے، بہرحال وہ چاروں گھوڑے جنھیں مُردہ کہو یا زندہ، شہر کے تمام گھوڑوں سے افضل خیال کیے جاتے تھے، جب وہ وہاں سے علیحدہ کر دیئے گئے تو شہر والے بلک بلک کر روئے۔ اُسی رات دس فرانسیسی سپاہیوں کی لاشیں نہر میں تیرتی ہوئی دیکھی گئیں اس پر ہمارے آدمیوں نے انتقاماً اُن کی اور بہت سی یادگار تصویریں تباہ و برباد کر دیں، ان کے بہترین مجسّمے توڑ ڈالے آئینے دار بند کھڑکیاں بندوقوں سے گولیاں مار مار کر چکنا چور کر دیں۔ وینس کے لوگ اور زیادہ مشتعل ہو گئے۔ شہر میں عام منافرت پھیل گئی۔ میرے اکثر ماتحت اور ساتھی افسر اس جاڑے کے موسم میں غائب ہو گئے تھے۔ آج تک اُن کی لاشوں کا پتہ نہیں چلا۔

میرا حال سُنیئے، میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ میں کسی مصیبت سے نہیں گھبرایا۔ میں جس ملک میں پہنچا تھا وہاں کی زبان سیکھنے کی پُوری کوشش کرتا تھا۔ اس مقصد کے لیے مجھے ہمیشہ ایک مہربان عورت کی تلاش رہتی تھی۔ پھر ہم دونوں مل کر بول چال کی مشق کر لیتے تھے۔ کسی ملک کی زبان سیکھنے کا بہترین طریقہ یہی ہے۔ میں تیس سال کی عمر میں یورپ کی ہر زبان بول سکتا تھا۔ مگر یہ واضح رہے کہ اس طرح جو کچھ سیکھا جاتا ہے وہ زیادہ کارآمد نہیں ہوتا۔ بس کام چلانے کے لائق ہوتا ہے، میرا واسطہ سپاہیوں سے پڑتا تھا یا کسانوں سے، اُن سے محض اس قسم کی باتیں ہوتی تھیں "میں آپ سے محبّت کرتا ہوں جنگ ختم ہونے پر ہم پھر ملیں گے" وغیرہ۔

ہائے جیسی مہربان اُستاد مجھے وینس میں ملی ویسی کہیں نہیں ملی۔ اُس کا پہلا نام لوسیا تھا اور دوسرا..... شریف آدمی اکثر بھول جاتے ہیں۔ میں اپنے درست حافظے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ وینس کی قانون ساز جماعت کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اُس کا دادا شہر کا ڈاج یعنی سرپنچ تھا۔ وہ خوبصورتی میں بے مثل تھی، جسے اینٹنی جیرارڈ بے مثل کہتا ہو، سمجھ لیجیے وہ کیا ہو گی؟ میرے پاس موازنے کے لیے ذرائع نہیں ہیں۔ البتہ جتنی عورتوں نے مجھ سے محبّت کی اُن میں بیس عورتیں منتخب تھیں مگر کسی ایک سے بھی لوسیا کو تشبیہہ نہیں دی جا سکتی جس طرح اشرفی کو روپے سے تشبیہہ نہیں دے سکتے، لوسیا درحقیقت بے مثل عورت تھی۔ جب میں پرتگال میں جنرل مسینا کی ماتحتی میں تھا تو سینٹارم میں ایک بھوری عورت کو مجھ سے محبّت ہو گئی تھی۔ اس کا نام اس وقت ذہن سے اُتر گیا ہے، وہ بھی خوبصورتی کا ایک نادر مجسمہ تھی مگر اس

کا قد و قامت اور اس کے خد و خال لوسیا جیسے نہ تھے، یوں تو اینجنس بھی خوبصورت تھی مگر میں اس معاملے میں ناانصافی نہیں کروں گا۔ درحقیقت لوسیا بے مثل حسینہ تھی اور اُس وقت کی حسیناؤں میں اُس کی مدِ مقابل کوئی حسینہ نہ تھی۔

تصویروں کے واقعے سے قبل میری اُس سے ملاقات ہوئی تھی، اُس کا باپ بڑی نہر کے کنارے ریلٹو برج کے قریب ہی ایک بڑے محل میں رہتا تھا۔ محل کے در و دیوار تصویروں سے پٹے ہوئے تھے، سوچیٹ نے سپاہیوں کی ایک جماعت بھیجی تاکہ محل سے کچھ تصویریں کاٹ کر لے آئیں جو پیرس بھیجی جانی تھیں۔ میں بھی اس جماعت کے ساتھ تھا وہیں میں نے لوسیا کو دیکھا وہ زار و قطار رو رہی تھی اور یہ کہتی تھی "اب بس کرو۔ تمام دیواروں کا پلاسٹر اُکھڑا جا رہا ہے"۔ میں نے اُس کی تائید کی اور سپاہی اس کام سے باز آگئے، اس کے بعد میں اُس کے خاندان کا دوست بن گیا۔ اُس کے باپ کے ساتھ بہت سے جام شراب لنڈھا کر توڑ دیئے اور اُس کی حسین دختر سے بہت سے مفید سبق حاصل کیے۔

بہت سے فرانسیسی سپاہیوں نے وینس میں شادیاں کریں، میں بھی ایسا کر سکتا تھا اور دل سے چاہتا تھا مگر اینٹنی جیراڈ کے پاس اُس کی اپنی تلوار تھی، اپنا گھوڑا، اپنی رجمنٹ، اپنی ماں، اپنا بادشاہ، نپولین اعظم، اپنا وقار۔ یہ کس کے سپرد کرتا؟ ایک خوش مزاج ولایتی سوار دل میں محبت کی جگہ ضرور رکھتا ہے مگر جورو کے لیے نہیں۔ اے دوستو! اُس وقت میرے تخیلات یہ تھے۔ یہ کیا خبر تھی کہ ایک وقت بیکسی کا بھی آئے گا۔ جب میں اپنے رفقا کو دیکھتا ہوں، ان کی جوان جوان اولادیں ان کی کرسیوں کے گرد خدمت کے لیے مستعد کھڑی ہوئی نظر آتی ہیں تو کفِ افسوس ملنا پڑتا ہے۔ اُس طرف سے منہ پھیر لیتا ہوں، وہ محبت جس کا میں قائل نہیں تھا اور جسے قابلِ استہزا سمجھتا تھا۔ اب سمجھ میں آیا کہ دراصل وہ زندگی یعنی ازدواجی زندگی، حالات میں انقلاب پیدا کر کے انسان کو نہایت سنجیدہ اور پاکیزہ بنا دیتی ہے۔ شکریہ، شکریہ دوستو یہ عمدہ شراب ہے، دوسری بوتل اور منگالی جائے تو کیا مضائقہ ہے؟

اب میں آپ سے بیان کرتا ہوں کہ میں نے کس طرح لوسیا سے محبت کر کے خود کو خطرے میں ڈالا تھا۔ اب تک مجھ پر جو حادثات گزرے ہیں یہ اُن سب سے زیادہ پُرخطر اور عجیب تر واقعہ ہے، آج کی رات پہلی مرتبہ آپ سے یہ دل گداز واقعہ بیان کرتا ہوں۔

سوچیٹ کا ہیڈ کوارٹر اس وقت کے ایک پُرانے محل میں تھا۔ یہ محل ایک خوبصورت جھیل کے کنارے واقع ہے۔ موسم سرما کا آخر تھا۔ ایک رات جب میں تھیٹر سے واپس آیا تو مجھے لوسیا کی طرف سے ایک رقعہ ملا جس میں استدعا کی گئی تھی "میں بڑی مصیبت میں ہوں فوراً آکر میری مدد کرو"۔ ایک فرانسیسی سپاہی کی طرف سے ایسے مراسلے کا جواب وہی ہو سکتا تھا جو میں نے دیا۔ لوسیا کے خط میں میری سواری کے لیے ایک کشتی کی فراہمی کا ذکر بھی تھا۔ میں فوراً تیار ہوا اور پھر میں پل بھر میں اُس کشتی کے اندر تھا اور کشتی بان کشتی کھے رہا تھا، مجھے یاد ہے کہ جب میں کشتی میں جا کر بیٹھا تو ناخدا کا فربہ جسم دیکھ کر چونکا تھا۔ اگرچہ وہ زیادہ لمبا تڑنگا نہیں تھا مگر اُس جیسا چوڑا چکلا آدمی میں نے اپنی عمر میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وینس کے کشتی چلانے والے ایک مضبوط نسل کے لوگ ہیں۔ ان میں عام طور پر بڑے طاقتور ہوتے ہیں۔ اُس نے میری پشت کی طرف آکر کشتی چلانی شروع کر دی۔

ایک اچھا سپاہی دشمن کے ملک میں ہر وقت اور ہر مقام پر چوکس رہتا ہے، میرا بھی یہی اصول رہا۔ ساری عمر انھی تجربات میں گزاری، یہاں تک کہ یہ بال سفید ہو گئے۔ مگر میں اُس رات کچھ ایسا غافل ہوا جیسے کوئی نوجوان رنگروٹ خطرے سے اس لیے بے پروا ہو جاتا ہے کہ لوگ اُسے ڈرپوک خیال نہ کریں۔ میں عجلت کے سبب اپنا پستول بھی بھول آیا تھا۔ تلوار ضرور پہلے میں تھی لیکن یہ ہر موقع کے لیے کامیاب ہتھیار نہیں ہوتا۔ میں کشتی میں کمر لگا کر لیٹ گیا۔ میری پیٹھ کشتی چلانے والے کی طرف تھی، پانی کی ہلکی ہلکی چھپ چھپاہٹ کشتی کی چال اور پتوار کی سریلی کرکراہٹ نے مجھے لوری دینا شروع کر دی۔ ہمارا راستہ اُن پیچ دار تنگ گلیوں میں ہو کر گزرتا تھا جن کے دائیں اور بائیں کناروں پر اُونچی اُونچی بُرجیوں والے مکانات کا سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا۔ ٹھیک سر کے اوپر ننھے ننھے تاروں بھری کہکشاں تھی۔ کچھ دُور کچھ قریب فاصلوں پر محراب دار پُل تھے جو نہر کا سلسلہ قطع کرتے تھے۔ تیل کے چراغوں کی دھیمی روشنیوں میں کسی طاق سے موم بتی کی سفید روشنی کی شعاعیں بھی نظر آجاتی تھیں۔ یہ شمعیں کسی بزرگ کے مجسمے پر جلائی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ ہر طرف اندھیرا تھا۔ کشتی کے گرد پانی کی سفید جھالر تھی۔ کشتی کی مڑی ہوئی ناک منہ کے سامنے نظر آجاتی۔ یہ موقع محل بڑا ہی خواب ناک تھا

میں نے اپنے گزشتہ واقعات اور کارناموں پر غور کرنا شروع کر دیا گھوڑے جن پر میں نے سواری کی تھی۔ عورتیں جن سے میں نے محبت کی تھی، پھر مجھے اپنی بیکس ماں کا خیال آیا۔ جب وہ گاؤں کے لوگوں سے اپنے بیٹے کی شہرت کے متعلق خبریں سنتی ہوگی تو کیسی خوش ہو کر دعائیں دیتی ہوگی۔ شہنشاہ کا خیال، اپنے وطن کا تصور، آہ وہ پر فضا فرانس جو حسین و جمیل بیٹیوں اور بہادر بیٹوں کی ماؤں کا مسکن ہے مگر ایک خیال آنے سے میرا دل اور بھی روشن ہو گیا کہ ہم کیسے سلوک اور اتحاد کے ساتھ اپنے ملک کا جھنڈا اپنی سرحدوں کے پار لے کر آتے ہیں۔ میں اس جھنڈے کی عظمت کے لیے اپنی جان تک قربان کر دوں گا۔ اس خیال کے بعد میں نے سیدھا ہاتھ اپنے دل پر رکھا۔ گویا میں اس وقت ایک عہد کر رہا تھا۔ معاً اسی لمحے ناخدا پیچھے سے مجھ پر آ گرا۔ میں نے کہا وہ مجھ پر آ گرا اس سے مطلب واضح نہیں ہوتا یعنی یہ کہ اس نے مجھ پر حملہ کیا ہو سکتا ہے کہ وہ بھاری جسم ہونے کی وجہ سے ٹھوکر کھا کر گر گیا ہو۔ ایک شخص آپ کی پیٹھ کے پیچھے کھڑا ہوا کشتی چلا رہا ہو اور اس کی پشت آپ کی طرف ہو۔ نہ آپ اسے دیکھ رہے ہوں نہ کوئی دوسرا انگریز موجود ہو تو آپ کیا سمجھیں گے؟ ایک لمحے کے لیے میں خود ان خیالات کے چکر میں پھنس کر رہ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے کسی نے میرا جسم کشتی کی تلی میں زور سے دے پٹکا میرا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ مردود میرے اوپر چڑھا ہوا مجھے دبوچ رہا تھا۔ میں نے اپنی گردن پر اس کی گرم گرم سانس محسوس کی۔ اس نے میری تلوار توڑ کر پانی میں پھینک دی اور سر کی طرف سے مجھے ایک تھیلا پہنا کر رسی سے مضبوط کس دیا۔ اب میں جال میں پھنسی ہوئی چڑیا کی طرح کشتی کی تہہ میں پڑا تھا۔ نہ چیخ سکتا تھا نہ حرکت کر سکتا تھا۔ بس ایک گٹھڑی تھا۔ چند لمحوں کے بعد میں نے پھر پانی کی چپ چپاہٹ اور چپو چلنے کی آوازیں سنیں۔ دل میں خیال آیا کہ یہ حرامزادہ اپنا کام کر کے بلا شرکتِ غیرے پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص اس کام کا ماہر ہے، ضرور ہفتے میں ایک دو بار ولایتی رسالے کے کسی نہ کسی افسر کو تھیلا پہناتا ہوگا۔

اس وقت کی خفت اور غصے کی کیفیت جو میرے دل و دماغ پر مسلط تھی، میں آپ سے کیا بیان کروں۔ بس مجھے اس بھیڑ کی طرح سمجھیے جو ذبح ہونے کے لیے مذبح خانے لے جائی جاتی ہے۔ میں اینٹی جیرارڈ نمبر ۲ بریگیڈ کے لائٹ کیولری کا چیمپئن اور بڑی فوج کا اوّل شمشیر زن اس طرح ایک غیر مسلح شخص سے مغلوب ہو کر رہ گیا؟ میں خاموش تھا کیونکہ جدوجہد کا بھی وقت ہوتا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی ہوتا ہے جس میں آدمی کو اپنی طاقت کسی آنے والے وقت کے لیے محفوظ رکھنی پڑتی ہے میں خاموش رہا۔ جب اس نے مجھے اپنے بازوؤں پر اوپر اٹھایا تھا... میں اسی وقت سمجھ گیا تھا۔ میں نے اس کی گرفت اپنے بازوؤں پر محسوس کرتے ہوئے خیال کیا تھا کہ میرا وجود اس کے لیے ایک بچے کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ میں خاموش پڑا ہوا دل ہی دل میں جھنجھلا رہا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ متواتر چپو چلنے کی کرکراہٹ اور پانی کی چپ چپاہٹ کان میں آ رہی تھی جب کشتی کسی موڑ پر رخ بدلتی تو ملاح ایک دوسرے کو اپنی آمد سے مطلع کرنے کے لیے دور سے شور مچاتے۔ خدا خدا کر کے سفر تمام ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ کشتی کی تلی زمین سے مس ہو رہی ہے ملاح نے اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لیے کشتی کے ڈانڈ سے تین بار لکڑی پر ٹھوکے لگائے۔ اس پیغام کے جواب میں لوہے کی سیخوں کا دروازہ کھلنے اور تالے میں کنجی گھومنے کی آواز آئی۔ پھر ایک بھاری پھاٹک کھلا اور کسی نے اطالوی زبان میں دریافت کیا "کیا وہ تمہیں مل گیا؟"

اس مردود نے ہنستے ہوئے میرے تھیلے میں ٹھوکر مار کر کہا "ہاں وہ کمینہ یہ ہے۔"

"وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" اس کے بعد اس نے کچھ اور کہا جو میں نہ سمجھ سکا۔

"لو اسے تھامو" اتنا کہہ کر میرے صیّاد نے مجھے اپنے بازوؤں پر اُٹھایا اور چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد پتھر کے فرش پر پٹک دیا۔ اس کے بعد سینخچے گڑگڑائے اور چابی تالے میں گھومنے کی آواز آئی۔ اب میں ایک مکان میں قید کر دیا گیا تھا۔ آدمیوں کی آوازیں اور قدموں کی آہٹوں سے میں سمجھا کہ میرے پاس کچھ لوگ جمع ہیں۔ اطالوی زبان بولنے کی نسبت میں سمجھتا زیادہ ہوں۔ اس لیے وہ جو کچھ کہہ رہے تھے، میں سمجھ رہا تھا۔

"موٹو تم نے اُسے کہیں مار تو نہیں ڈالا؟"

"اگر مار بھی ڈالا تو کیا ہُوا۔"

"تمھیں عدالت کے سامنے جواب دہی کرنی ہو گی۔"

"وہ بھی تو اُسے مار ہی ڈالیں گے، اور کیا کریں گے۔"

"ہاں مگر تمھیں یا مجھے اپنے ہاتھوں سے ایسا کرنے کا اختیار ہرگز نہیں ہے۔"

"توبہ۔ میں نے نہیں مارا۔ مُردہ آدمی کیسے کاٹ سکتا ہے۔ یہ دیکھو اس کمبخت کے دانت میرے انگوٹھے میں لگے ہوئے ہیں۔ ابھی میں اُسے نکالنے کے لیے اُس کے سر سے تھیلا نیچے سرکا رہا تھا تو اُس نے یہ کاٹ لیا۔"

"پھر وہ اس قدر خاموش کیوں پڑا ہے۔"

"ٹھوکر مار کر دیکھو، بالکل زندہ ہے۔"

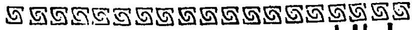
جس رسّی سے میں بندھا ہوا تھا وہ کھول دی گئی تھی۔ تھیلا سر سے اُتار دیا گیا تھا۔ مگر میں آنکھیں بند کیے فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔

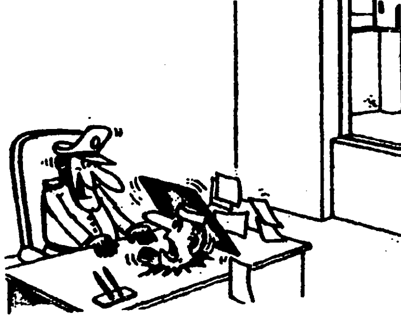
"معلوم ہوتا ہے موٹو تم نے اس کی گردن توڑ دی ہے۔"

"نہیں یار یہ بے ہوش ہو گیا ہے اور یہی اس کے لیے بہتر ہے۔"

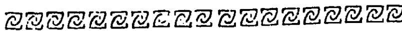
پھر میں نے اپنے بنیان کے اندر ایک ہاتھ پھرتا ہُوا محسوس کیا۔ "موٹو ٹھیک کہتا ہے۔ اس کا دل تو ہتھوڑے کی طرح حرکت کر رہا ہے۔"

ایک دو منٹ بعد میں نے اپنی پلکوں کے درمیان سے جائزہ لینا چاہا تو مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ کیونکہ عرصے تک اندھیرے میں رہنے کے بعد روشنی ذرا دیر سے نظر آتی ہے پہلے دھندلا سا کچھ نظر آیا پھر صاف،





قیدی :۔ "ہائے ری بد قسمتی"



اُونچی چھت دیوی اور دیوتاؤں کی تصویروں سے رنگی ہُوئی تھی۔ یہ مکان قتل خانہ نہیں تھا بلکہ وینس کے کسی بڑے محل کا ہال تھا۔ پھر میں نے حرکت کیے بغیر ان آدمیوں کا جائزہ لیا جو مجھے گھیرے ہوئے کھڑے تھے۔ کشتی چلانے والا، ظالم، ڈاکو، کئی لوگ نظر آئے' ان کے بیچوں بیچ ایک ایک پستہ قد شخص چابیوں کا گچھا لیے کھڑا تھا یہ کوئی افسر معلوم ہوتا تھا دو آدمی جوان اور لمبے قد کے تھے' یہ نوکر معلوم ہوتے تھے کیونکہ اچھی پوشاک پہنے ہوئے تھے' اُن کی گفتگو سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ پستہ قد آدمی اس مکان کا منتظم ہے اور دوسرے لوگ اس کے ماتحت ہیں میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ اگر اس چھوٹے قد کے آدمی کو شمار میں نہ لوں تو بھی ان چار کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے۔ مقابلہ فرداً فرداً ہوتا تو میں یقیناً ان کے بس کا نہیں تھا۔ وہ بھی اپنی پھرتی سے طاقت سے نہیں۔ یہ خیال کر کے میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ اُن سے بچ کر نکل جانے کے خیال میں میرے سر کو ذرا سی حرکت ہو گئی، جو محافظوں نے تاڑ لی۔

"اٹھو، اُٹھ کر بیٹھو۔ آنکھیں کھولو۔" منتظم نے بلند آواز سے کہا،

"کھڑا ہو بے فرانسیسی کے بچّے۔ میں کہتا ہُوں کھڑا ہو جا"

ملّاح نے مجھے ایک ٹھوکر اور رسید کر دی۔

ایسی مستعدی سے شاید ہی دُنیا میں کسی حکم کی تعمیل ہُوئی ہو گی۔ میں کسی ربڑ کی گڑیا کی طرح اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا اور فوراً پوری طاقت سے ہال کے عقب کی طرف بھاگا۔ وہ لوگ میرے پیچھے دوڑے جیسے لومڑی کے پیچھے شکاری کتّے ہوتے ہیں نیچے کی طرف لمبا چکردار

راستہ تھا۔ میں بائیں طرف دوڑ رہا تھا، میں دوڑتے دوڑتے ایک دفعہ پھر اُسی کمرے
میں آ گیا۔ وہ میرے پیچھے لگے آ رہے تھے، کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی
نہ تھا۔ سامنے زینہ تھا۔ میں نے زینے کا رُخ کیا۔ دیکھا، دو آدمی اُوپر
سے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے مجبوراً اُسی دروازے میں گھس جانے کا قصد
کیا جس میں پہلی مرتبہ لایا گیا تھا مگر وہ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ میں
توڑ کر کس طرح گھس سکتا تھا۔ کشتی والا شخص چھرا ہاتھ میں لیے میرے
پیچھے تھا۔ وہ وار کرنا ہی چاہتا تھا کہ میں پینترا بدل کے دائیں ہاتھ گھوم
کر ترچھا ہو گیا۔ میں نے وار خالی دیا اور ایک لات اُس کی چھاتی پر ایسی
جمائی کہ وہ چاروں شانے چت زمین پر جا پڑا۔ اُس کا چھرا ہاتھ سے چھوٹ
کر سنگِ مرمر کے فرش پر جھنجھناتا ہوا دُور جا گرا۔ اتنا موقع نہیں تھا کہ
میں چھرا اٹھا سکتا کیونکہ نصف درجن آدمی مجھے حلقے میں لے چکے تھے
میں مجبوراً اُن پر جھپٹ پڑا مگر پستہ قد منتظم نے مجھے ایسی ٹانگ ماری کہ میں
بے اختیار زمین پر گر گیا لیکن پھر فوراً ہی کھڑا ہو گیا اور چیر پھاڑ کر ان کی
گرفت سے نکل گیا اور اُسی پھاٹک کی طرف لپکا جو ہال کے آخر میں
دُوسری جانب تھا۔ اس مقام پر پہنچ کر میں نے ایک خوشی کا نعرہ مارا
اُس کا ہینڈل گھمایا تو وہ کھل گیا۔ میں نے خیال کیا کہ اب میں آزاد ہوں۔
میں اُس وقت اس شہر کی عجیب ساخت بھول گیا تھا یعنی یہ کہ یہاں کا
ہر مکان جزیرہ ہے۔ پھاٹک کھولا اور خیال یہ تھا کہ اب صاف سڑک
پر نکلوں گا مگر وہاں خاموش گہرے سیاہ پانی کی سطح اور پکی سیڑھی تک
تھی اور اُس پر محل کی جھلملاتی ہوئی روشنی دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔
مجبوراً پیچھے لوٹا۔ تعاقب کرنیوالے قریب آ پہنچے تھے مگر میں آسانی سے
قابو میں آنے والا نہیں تھا۔ دوبارہ ان سے خوب لپا ڈگی ہوئی، لڑ بھڑ
کر میں ایک بار پھر چھوٹ گیا۔ مگر اُن میں سے ایک کمینے نے میرے
سر سے مٹھی بھر بال لیے بغیر مجھے نہ چھوڑا۔ پستہ قد منتظم نے چابیوں
کی ایسی کھرونچ ماری تھی کہ میرا چہرہ لہولہان ہو گیا تھا۔ غرض ان سے
پیچھا چھڑا کر میں ایک مکان کی سیڑھیوں پر جا چڑھا جس کا بڑا دروازہ
کھلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ کوشش بھی
بے سُود تھی۔

کمرہ روشنی سے منور تھا۔ سنہرے کلس بھاری تھم، در و دیوار
منقش ظاہر تھا کہ یہ وینس کے کسی بڑے محل کا دیوانِ خاص ہے۔ اس
شہر میں سینکڑوں محلات ہیں جن کے دیوان خانوں میں داخل ہونے
سے پہلے درمیلنر کی شان و عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ ہال کے وسط میں ایک
اونچا چبوترا تھا جس پر ہلالی شکل میں ایک درجن آدمی کالی عبائیں پہنے
کرسیوں پر بیٹھے تھے، ہر ایک کے نصف چہرے پر نقاب تھا۔ مسلح آدمیوں
کا ایک گروہ دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ ان کے چہروں سے وحشت
اور بربریت برس رہی تھی۔ ان کے درمیان ایک شخص ڈائس کی طرف منہ
کیے کھڑا تھا جو ہمارے سبک سواروں کی وردی میں ملبوس تھا۔ جیسے
ہی اُس نے رُخ بدلا میں نے پہچان لیا کہ یہ پلٹن نمبر ۲ کا کپتان اوریٹ
ہے۔ یہ بڑا خوش مزاج نوجوان تھا۔ موسمِ سرما میں میں نے اس کے
ساتھ جامِ صحت نوش کیے تھے، اُس غریب کا چہرہ زرد تھا مگر قاتلوں کے
درمیان بڑی استقامت سے کھڑا تھا۔ میں اُس کی آنکھوں میں اُس
وقت کی چمک کبھی نہیں بھول سکتا جب اس کی اور میری آنکھیں چار
ہوئیں تو میں نے اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک محسوس کی، کچھ
اُمید کی جھلک کچھ مایوسی کی افسردگی، اُمید اس قسم کی جو اپنے ساتھی یا ہمدرد
کو دیکھ کر ایسے موقعوں پر ہوا کرتی ہے اور مایوسی اس لیے کہ اُس نے سمجھ
لیا کہ میں اس کی قسمت بدلنے نہیں آیا ہوں، بلکہ رنج و غم میں شریک
ہونے آیا ہوں۔

آپ خیال کر سکتے ہیں جب میں اس حلیے میں گھسا تو وہ لوگ کیسے
حیران ہوئے ہوں گے تعاقب کرنے والے میرے پیچھے پیچھے فوراً ہی داخل
ہو گئے اور دروازہ گھیر کر وہیں کھڑے ہو گئے تاکہ آئندہ بھاگنے کا سوال ہی
باقی نہ رہے۔ میں اپنی عادت کے مطابق بڑی خودداری سے ججوں کی طرف
بڑھا، میری جیکٹ پھٹی ہوئی تھی، سر کے بال بکھرے ہوئے تھے، کنپٹی سے
خون بہہ رہا تھا مگر میری آنکھوں اور میری چال ڈھال سے یہ ظاہر ہو رہا
تھا کہ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ میری گرفتاری کے لیے کوئی ہاتھ
نہ بڑھا، یہاں تک کہ میں اس بوڑھے خطرناک جج کے قریب پہنچ گیا جس
کی داڑھی لمبی تھی۔ اس کے تحکمانہ انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس اجلاس
کا افسرِ اعلا ہے۔

"جناب" میں نے کہا "شاید آپ مجھے یہ بتانے سے گریز نہیں فرمائیں
گے کہ میں جبراً گرفتار کر کے یہاں کیوں لایا گیا ہوں؟ میں ایک معزز سپاہی
ہوں اور میرا ایک دوسرا ساتھی بھی یہاں موجود ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ
آپ ہم دونوں کو فوراً رہا فرمائیں گے۔"

میری اس اپیل سے حاضرین پر ایک خاموشی سی چھا گئی، بارہ نقاب

پوش ججوں کی چوبیس متجسّس نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں لیکن میں ایک آزمودہ کار سپاہی کی طرح تنا کھڑا تھا۔ میں نے وہاں بھی اپنی سپاہیانہ شان اور مستانہ انداز میں فرق نہیں آنے دیا۔ ایسے نازک اور مشکل حالات میں شاید ہی کوئی شخص مجھ جیسا عمل کرسکتا۔ میں نہایت استقلال اور دلیری کے ساتھ ان ظالموں کی طرف سے جواب کا منتظر کھڑا تھا۔

آخر بوڑھے داڑھی والے جج نے مہرِ سکوت توڑی۔ "یہ کون شخص ہے؟"

"اس کا نام جیرارڈ ہے۔" پستہ قد منتظم نے دروازے کی طرف سے جواب دیا۔

"جیرارڈ کے ساتھ کرنل بھی کہیے۔" میں نے کہا۔ "میں آپ کو دھوکا نہیں دوں گا۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں کرنل اٹینی جیرارڈ ہوں جو پانچ مرتبہ سورڈ آف آنر کے اعزاز سے سرفراز ہوچکا ہے اور جنرل سوچیٹ کا اے ڈی سی ہے اور آپ سے اپنی اور اپنے ساتھی کی رہائی کا طالب ہے۔"

اجلاس پر پھر خوفناک خاموشی طاری ہوگئی۔ بارہ آنکھوں کے جوڑے برابر ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ داڑھی والا پھر بولا "یہ کچھ آپے سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ ہماری فہرست میں یہ دو نام ہیں۔"

پیچھے سے آواز آئی "جناب یہ ہم سے خود کو چھڑا کر بھاگا تھا اور یہاں آکر داخل ہوگیا۔"

"خیر اسے اپنے اعمال کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ فی الحال اسے نیچے لکڑی کی حوالات میں لے جاؤ۔"

"حضور اگر یہ پھر مزاحمت کرے؟"

"اپنے چھرے اس کے پیٹ میں گھونپ دینا۔ عدالت تمھارا ساتھ دے گی۔ اسے ہٹاؤ تاکہ ہم دوسروں کی سن سکیں۔"

وہ میری طرف بڑھے۔ اس وقت میرے دل میں مزاحمت کا خیال ضرور تھا کہ کیوں نہ بہادروں کی طرح جان دوں مگر یہ سوچ کر رہ گیا کہ یہاں میری شجاعت کی داد دینے والا کون ہے۔ جب میں کئی مشکل اور خطرناک موقعوں سے بچ کر نکل آیا ہوں تو قسمت ضرور ایک موقع اور دے گی۔ میں نے کبھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ہمیشہ اپنے طالع پر بھروسا کیا ہے۔ میں نے خود کو ان حرامزادوں کے حوالے کردیا۔ وہ مجھے کمرے سے باہر لے گئے۔ کشتی والا شخص ایک لمبا چھرا ہاتھ میں لیے میرے پہلو بہ پہلو چل رہا تھا۔ اس کی بھیڑیے جیسی آنکھوں میں کچھ اطمینان کے آثار تھے اور کچھ حیلہ سازی کی فکر تھی تاکہ کسی بہانے اپنا چھرا میرے فولادی جسم میں گھونپ دے۔

وینس کے محلات کچھ عجیب ہیں۔ ایک مکان بیک وقت محل بھی ہے، قلعہ بھی اور قید خانہ بھی۔ میں جس تنگ راستے سے لایا گیا تھا وہاں پتھر کی سیڑھیوں سے اتر کر ایک تنگ گلی تھی جس میں تین دروازے تھے، مجھے ایک کھلے ہوئے دروازے کے اندر دھکیل کر کمرہ بند کردیا گیا اور تالا لگادیا گیا۔ روشندان کی جالی سے مدھم روشنی آرہی تھی۔ میں نے اس لکڑی کی کوٹھری کا بغور معائنہ کیا۔ یہ سن ہی چکا تھا کہ عدالت کے سامنے دوبارہ پیش ہونا ہے، مگر یہ میری کچھ عادت ہے کہ بیکار بیٹھنا پسند نہیں کرتا اور معمولی سا موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ کوٹھری میں پتھر کا فرش تھا جس میں بے حد سیل تھی۔ فرش سے چند فٹ کی اونچائی تک دیواریں سیلی ہوئی تھیں۔ کیونکہ پانی کی سطح وہاں تک تھی۔ چھت کے قریب ڈھلواں روشندان تھا جو ہوا اور روشنی کا واحد ذریعہ تھا۔ اسی ذریعے سے مجھے ایک روشن ستارہ نظر آرہا تھا جو میری تسلی اور امید کا سہارا تھا۔ میں کبھی مذہب کا پابند نہیں رہا مگر مذہبی لوگوں کی عزت کرتا ہوں۔ مجھے وہ رات خوب یاد ہے۔ اُس تارے کو عوام کی نظریں خیال کرکے میرا محبوب سمجھا، جس طرح میدانِ جنگ میں کوئی ڈرپوک نوجوان رنگروٹ اپنے کرنل کی سرمہری دیکھ کر کھسیانا ہوجاتا ہے۔ اس حوالات کے تین طرف پتھر کی دیواریں تھیں مگر چوتھی دیوار لکڑی کی تھی جو جال کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی یعنی ایک بڑے کمرے کے دو چھوٹے چھوٹے کمرے کردیے گئے تھے۔ پتھر کی پرانی دیوار میں یا روشندان میں یا بھاری دروازے میں میرے لیے کوئی امید افزا بات نہیں تھی۔ اگر کچھ مطلب برآری ہوسکتی تھی تو وہ یہی پردے کی دیوار والی سمت تھی۔ میرے دل نے کہا کہ اگر اس میں ایک خلا پیدا کرلوں ..... یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ اس طرح دوسرے کمرے میں جانا ہوسکتا ہے۔ مگر وہ کمرہ بھی ایسا ہی مستحکم اور مضبوط بنا ہوا ہوگا جیسا یہ ہے۔ بہرحال کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہے۔ ان خیالات کے آنے سے میری تمام تر توجہ اس دیوار کی طرف لگ گئی۔ میں نے دیکھا کہ دو تختوں کا جوڑ نہایت بھدّے طریقے سے ملایا گیا تھا۔ ان میں کافی درز باقی رہ جانے کے علاوہ تختے ڈھیلے تھے جو ہلانے سے ہلتے تھے۔ انھیں میں آسانی سے علیحدہ کرسکتا تھا۔ میں



خلیفہ جعفر منصور مُصر تھا کہ امام اعظم اُبو حنیفہؒ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا منصب قبول کرلیں لیکن اُبو حنیفہؒ اپنے تقوے اور بے داغ کردار کے پیشِ نظر یہ عہدہ اس لیے نہیں قبول کر رہے تھے کہ اُن کے فیصلوں میں خلیفہ منصور کے دباؤ، لحاظ یا اثر کے دخل انداز ہونے کا اندیشہ تھا اور بصُورتِ دیگر اُنہوں نے یہ بھی سوچا کہ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ہو جانے کے بعد اگر وہ خلیفہ منصُور کی مرضی کے خلاف فیصلے کریں گے تو یقیناً خلافت کا عتاب نازل ہوگا۔ ان حالات میں حضرت اُبو حنیفہ نے یہی منا ب سمجھا کہ انکار کردیں۔

کئی بار کی ناکامی کے بعد خلیفہ منصور نے حضرت اُبو حنیفہ کو جبراً آمادہ کرنا چاہا، کہا۔ "یُوں سمجھو، میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم اس منصب کو قبول کرلو۔"

حضرت ابو حنیفہؒ نے انکار کر دیا۔ بولے۔ "جنابِ والا! میں خود کو اس منصب کا اہل نہیں پاتا۔"

خلیفہ منصُور آگ بگولہ ہوگیا، تُرش لہجے میں بولا۔ "تم جھُوٹ بولتے ہو۔"

حضرت اُبو حنیفہؒ نے برجستہ جواب دیا، "تو آپ خود ہی فیصلہ فرمالیں کہ ایک جھُوٹا آدمی قاضی القضاۃ کے منصب کا اہل کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔"

نے اِدھر اُدھر کسی اوزار کی جستجو کی۔ اتفاق سے ایک کونے میں کسی ٹوٹی ہُوئی چارپائی کا ایک پایا مل گیا۔ میں نے پائے کی نوک تختوں کی درز میں ٹھونس کر زور لگایا۔ ابھی میں اُسے مروڑ ہی رہا تھا کہ باہر سے کسی کے جلدی جلدی قدم ڈگمگاتے ہُوئے چلنے کی آواز آئی۔ میں نے ہاتھ روک لیا اور کان لگا کر سُننے لگا۔

جو کچھ میں نے سُنا کاش میں اُسے بھول جاتا۔ سینکڑوں آدمی میدانِ جنگ میں مرتے ہوئے دیکھے اور بہت سے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیئے۔ کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ مگر وہ کھلی جنگ ہوتی تھی۔ ہر سپاہی اپنا منصبی فرض ادا کرتا تھا مگر یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ کمبخت دھوکے سے قیدی کو حوالات میں مار ڈالتے تھے، اس وقت بھی وہ ایک قیدی کو حوالات میں بند کرنے کے لیے راستے پر دھکیلتے ہوئے لا رہے تھے اور قیدی آگے چلنے میں حجت کر رہا تھا۔ جب وہ میری کوٹھری کے قریب آئے تو قیدی دروازے سے چمٹ گیا۔ وہ اسے تیسری کوٹھری میں لے جانا چاہتے تھے، جو میری کوٹھری کے آخر میں تھی۔

ایک آواز آئی "مدد۔ مدد۔ کوئی میری مدد کرو۔"

پھر میں نے ایک سخت ضرب کی آواز سُنی، اُس کے بعد ایک چیخ۔ پھر وہی آواز آئی "کوئی میری مدد کرو۔ جیرارڈ۔ اے کرنل جیرارڈ! مدد۔"

میں نے دل میں کہا ارے یہ تو وہی پلٹن کا کپتان معلوم ہوتا ہے جسے یہ ظالم اس وقت ذبح کر رہے ہیں۔ میرا دل بھر آیا۔ میں غصے کے مارے آپے سے باہر ہوگیا۔ میں نے زور سے چیخ کر کہا "خبردار ظالمو۔ خبردار۔" اتنا کہہ کر میں نے زور سے دروازے میں ٹھوکر ماری۔ مگر پھر وہی چیخ پکار سنائی دی۔ اس کے بعد ایک دم خاموشی ہوگئی اور ایک منٹ کے بعد کسی بھاری بوجھ کے گرنے کی آواز آئی، پھر سنّاٹا ہوگیا۔ میں سمجھ گیا کہ اور یٹ ہمیشہ کے لیے دُنیا کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ وینس میں جہاں اور سینکڑوں بدنصیب ختم ہوگئے وہاں ایک یہ بھی سہی۔ آج کے بعد اس کا نام بھی حاضری کے رجسٹر میں نہیں پکارا جائے گا۔

قدموں کی چاپ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اب میری طرف آرہے ہیں مگر انھوں نے برابر کی حوالات کا دروازہ کھولا اور اس میں سے کسی کو باہر نکالا، پھر زینے پر چلنے کی آواز آتی رہی اس کے بعد ختم ہوگئی۔ میں نے چند منٹ میں تختے اتنے ڈھیلے کرلیے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹانے کے بعد پھر اُسی جگہ لگائے جا سکتے تھے، اس شگاف سے گزر کر میں ساتھ والی حوالات میں پہنچ گیا۔ اُسے میں نے اپنے خیال کے مطابق ویسا ہی پایا جیسی میری کوٹھری تھی۔ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا نہ کوئی دوسری لکڑی کی دیوار وہاں تھی جس میں شگاف کیا جاتا۔ دروازے میں بھی تالے لگے ہوئے تھے اور وہاں کوئی قیدی بھی نہیں تھا جو میرا ساتھ دیتا۔ تختے اُن کی جگہ لگا کر میں اپنی حوالات میں واپس آگیا اور دل مضبوط کرکے وہ لمحات سننے کا منتظر ہو کر بیٹھ گیا جو یقیناً موت کی گھنٹی کا حکم رکھتے تھے۔

کافی وقت گزر جانے کے بعد میں نے پھر کسی کے قدموں کی آہٹ سُنی اور اس طرف متوجہ ہُوا، یہ دیکھنے کے لیے کہ اب کیا ظہور میں آتا ہے یا کسی اور قربانی کے بکرے کی آواز سنائی دے گی مگر اس دفعہ کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔ کسی جبر و تشدد کے بغیر قیدی کو اُس کی جگہ واپس پہنچا دیا گیا۔ خبر رسانی کے لیے میں نے جو سوراخ بنایا تھا اس میں جھانکنے کا وقت ہی نہ مل سکا۔ دوسرے لمحے میرا دروازہ کھُلا اور وہی حرامزادہ کشتی والا

شخص دوسرے ہمراہیوں کے ساتھ میری حوالات میں داخل ہوا" فرانسیسی کُتّے! اِدھر آؤ۔"

اُس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا، اور بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میرے پیٹ میں چھُرا گھونپنے کا بہانا تلاش کر رہا ہے۔ میں کسی حُجّت کے بغیر اس کے ساتھ ہو لیا — میں پھر اس عالی شان کمرۂ عدالت میں لایا گیا۔ اندر پہنچ کر مجھے بڑی حیرت ہُوئی۔ کیونکہ اس وقت اُن ججوں کی توجہ کا مرکز انھی میں کا ایک دراز قامت جوان تھا جو اُن کے سامنے کھڑا ہوا نہایت سنجیدگی اور سرگرمی سے کسی معاملے کی وکالت کر رہا تھا مگر کبھی کبھی اضطراب اور تشویش کی وجہ سے اُس کی آواز بھرّا جاتی تھی، اپنا بیان پُراثر بنانے کے لیے اُس کے ہاتھ بار بار اُوپر اٹھتے اور پھیلتے تھے، اُس نے بلند آواز سے کہا "آپ ایسا نہیں کر سکتے، ہرگز نہیں۔ میں عدالت سے درخواست کرتا ہُوں کہ وہ اپنے فیصلے پر نظرِثانی کرے۔"

"بھائی اب تم ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔" اُس بوڑھے آدمی نے کہا جو عدالت کی صدارت کر رہا تھا "یہ مقدمہ طے ہو چکا ہے۔ اب دوسرا شروع ہوتا ہے۔"

جوان نے بلند آواز سے کہا "خدا کے لیے رحم کیجیے۔"

"ہم نے پہلے ہی رحم سے کام لیا ہے۔" دوسرے نے جج نے کہا۔ "ورنہ ایسے جرم کی سزا موت سے کم نہیں ہوتی۔ اب ذرا خاموش ہو جاؤ، فیصلے پر عمل درآمد ہونے دو۔"

وہ جوان غم اور غصّے سے نڈھال ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اُس کی تکلیف کا سبب دریافت کرتا۔ کیونکہ گیارہ ججوں کی آنکھیں میری طرف لگی ہوئی تھیں اور اب میرے مقدمے کا فیصلہ درپیش تھا۔

"کرنل جیرارڈ تم ہو؟" بوڑھے صدر نے سوال کیا۔

"جی ہاں، میں ہُوں۔"

"اُس ڈاکو کے اے ڈی سی بھی ہو؟ جو اپنے آپ کو جنرل سوچیٹ کہتا ہے اور بونا پارٹ کمپنی کا بڑا ڈکیت ہے۔"

میرے منہ سے یہ نکلنے ہی والا تھا کہ تم جھوٹے ہو۔ پھر میں نے سوچا بعض اوقات خاموشی، بولنے سے بہتر ہوتی ہے "میں ایک معزّز سپاہی ہوں۔ جو کچھ میں نے کیا، اپنا فرض ادا کیا اور حکم کی تعمیل کی ہے۔"

بوڑھے جج کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ نقاب میں آنکھیں چمکنے لگیں "تم چور ہو، ڈاکو ہو، قاتل ہو، تم سب ایک جیسے ہو۔ تم ہمارے ملک میں کیوں آئے؟ تم اپنے ملک فرانس میں کیوں نہیں ہو؟ کیا تمھیں ہم بلانے گئے تھے؟ بتاؤ تم یہاں کیوں آئے؟ ہماری وہ تصاویر اور بزرگوں کے مجسّمے کہاں ہیں؟ وہ سینٹ مارک کے گھوڑے کیا ہوئے؟ جو خزانہ ہمارے بزرگوں نے صدیوں میں جمع کیا تھا، تم اُس کے لوٹنے والے کون ہو؟ ہماری تہذیب تم سے کہیں زیادہ پُرانی ہے، جب تم جنگلی اور وحشی تھے تو ہم شہری تھے، تمھارے جاہل، غنڈے، اور شرابی سپاہیوں نے ہمارے رُوحانی پیشواؤں کا کام تمام کر دیا۔ کیا تمھارے پاس اس کا کوئی جواب ہے؟"

وہ ہیبت ناک بوڑھا اپنی سفید لمبی داڑھی غصّے سے جھٹک جھٹک کر یہ چھوٹے چھوٹے جملے اس طرح ادا کر رہا تھا جیسے کوئی شکاری کتّا غضب ناک ہو کر شکار پر بھونکتا ہے۔ میں اپنی بریّت کے لیے کہہ سکتا تھا کہ تمھاری تصویریں پیرس میں محفوظ ہیں۔ گھوڑے محض نمود و نمائش کے لیے تھے، ہمارے کس کام کے؟ البتہ تمھارے پیشواؤں کے بارے میں مجھے معلومات نہیں۔ میں نے سب اعتراضات کے جوابات سوچ لیے تھے مگر بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ بات بڑھنے سے مذہبی بحث شروع ہو جاتی، وہ کون کرتا۔ اس لیے میں خاموش کھڑا سنتا رہا اور اپنے شانے ہلاتا رہا۔

"ملزم کے پاس دعوے کا کوئی جواب نہیں ہے۔" ایک نقاب پوش جج نے کہا۔

"اگر کسی کو کچھ کہنا ہو تو فیصلہ لکھے جانے سے پہلے کہہ سکتا ہے" بوڑھے جج نے اپنے گرد و پیش نظریں گھما کر دیکھا۔

انھی میں سے ایک نے کہا "اعلا حضرت، یہ معاملہ ہمارے بھائی کے زخمِ دل سے تعلق رکھتا ہے جسے میں اس لیے دہرانا نہیں چاہتا کہ ہمارے بھائی کے دل کو تکلیف پہنچے گی۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اس افسر کے حق میں عبرتناک سزا تجویز کی جائے۔"

"میرے معزّز بھائی میں یہ چیز بھُولا نہیں ہُوں، اگر عدالت نے تمھارے حق میں ایک جگہ سختی سے کام لیا ہے تو دوسری جگہ اُس کا تسلّی بخش تدارک کر دے گی۔" بوڑھے جج نے اپنے جوان ساتھی کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

جوان پیر گھسیٹتا ہوا اُٹھا۔ ”اب میں قطعی برداشت نہیں کر سکتا‘ اعلاحضرت مجھے معاف فرمائیں۔ عدالت میرے بغیر کام کر سکتی ہے‘ میری طبیعت زیادہ خراب ہے جس کی وجہ سے غالباً دماغی توازن دُرست نہیں ہے۔“ وہ غصّے سے ہاتھ ہلاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

”جانے دو“ صدر نے کہا ”اچھا ہوا وہ چلا گیا۔ یہاں بیٹھے رہنے سے اُس کا خون کھول رہا تھا اور گوشت جل رہا تھا۔ وہ وینس کا سچّا ہمدرد ہے۔ جب اُس کا غصّہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو ہماری بات اس کی سمجھ میں آ جائے گی۔“

اتفاقیہ قصّہ درپیش ہو جانے سے میرا معاملہ کچھ دیر کے لیے کھٹائی میں پڑ گیا تھا مگر میں خوب سمجھتا تھا کہ میں زیادہ دیر فراموش رہنے والی چیز نہیں ہوں۔ بوڑھے جج نے میری طرف پلٹ کر دیکھا جیسے چیتا اپنے شکار پر جھپٹ کر واپس آتا ہے ”اس تمام خرابی کے ذمّے دار تم ہو تمھی کو اس کا معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ یہ ہمارا متفقہ فیصلہ ہے۔ ایک خود دار پردیسی ہوتے ہوئے تم نے وینس کے ڈاج کی پوتی سے آنکھیں لڑانے کی جُرات اور عشق کرنے کی ہمّت کیسے کی؟ جبکہ وہ لاری ڈینس کے وارث سے منسوب ہو چکی ہے۔ جو شخص اس قسم کے فائدے حاصل کرے گا وہ پورا معاوضہ بھی ادا کرے گا۔“

”شاید وہ معاوضہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا جو آپ نے تجویز کر لیا ہے۔“ میں نے جُرات سے جواب دیا۔

”کیا آپ ہمیں بتائیں گے اس کی پہلی قسط آپ کب ادا کر رہے ہیں شاید پھر طبیعت میں یہ زور و شور باقی نہ رہے۔ موٹو اس ملزم کو لکڑی کی حوالات میں واپس لے جاؤ۔ آج پیر کی شب ہے‘ اسے کھانے پینے کو قطعی نہ دیا جائے‘ بدھ کے دن عدالت میں پیش کرنا پھر ہم اس کی موت کے بارے میں سوچیں گے کہ اسے کس طرح مارا جائے۔“ صدر نے حکم دیا۔

اگرچہ اس حکم میں کوئی قابلِ مسرت بات نہیں تھی‘ صرف موت کی سزا میں التوا تھا۔ مگر مصیبت میں پھنسا ہوا شخص تھوڑے سے رحم کو بھی بہت سمجھتا ہے۔

جلّاد اپنے بالدار ہاتھ میں برہنہ خون آلود خنجر لیے پہلو میں کھڑا تھا اور موقع کا منتظر تھا۔ وہ مجھے گھسیٹ کر کمرے سے باہر لایا اور دھکیلتا ہوا سیڑھیوں پر لے گیا اور حوالات میں لے جا کر ٹھونس دیا۔ باہر سے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ میں اپنے خیالات میں مستغرق ہو گیا۔

اس بدنصیبی کے عالم میں مجھے اپنے پڑوسی سے رشتہ جوڑنے کا خیال آیا۔ میں ان لوگوں کے واپس جانے کی آہٹ لیتا رہا‘ زینے پر جا کر قدموں کی آواز ختم ہو گئی۔ میں نے مستعدی سے دونوں تختے علیحدہ کیے اور اندر جھانکا۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک کونے میں کوئی چیز ہلتی جلتی معلوم ہوئی پھر آہستہ آہستہ کسی کے بڑبڑانے کی آواز آئی جیسے کوئی خوف و ہراس کے عالم میں دُعا مانگتا ہے‘ تختوں کی کھڑکھڑاہٹ ہوئی تو وہ آواز ایک ہلکی سی خوفزدہ چیخ میں بدل گئی۔

”شاباش دوست ہمّت نہ ہارو‘ دل مضبوط کر لو۔ ابھی اُمید باقی ہے۔ اینٹنی جیرارڈ تمھارے پہلو میں ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا اینٹنی جیرارڈ؟“

یہ سُریلی آواز نسوانی تھی اور اس سے میرے کان بخوبی آشنا تھے میں اس خود ساختہ کھڑکی سے بدشواری نکلا اور اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں ”لوسیا‘ میری جان لوسیا۔“

یہ وہ وقت تھا جب بچھڑے ہوئے لوسیا اور اینٹنی جیرارڈ مل رہے تھے۔ ایسے وقت میں زبان سے باتیں نہیں ہوا کرتیں۔ اُس کے کھوئے ہوئے حواس دُرست ہوئے تو اُس نے کہا ”آہ اینٹنی جیرارڈ۔ اب وہ تمھیں مار ڈالیں گے‘ تم ان کے پنجے میں کس طرح پھنس گئے؟“

”تمھارے خط کے جواب میں۔“

”میں نے تو کوئی خط تمھیں نہیں لکھا؟“

”اچھا“ میں نے سر ہلایا ”تو یہ ان شیطانوں کی شرارت ہے اور تم؟“

”میں بھی تمھارے خط کے جواب میں آ گئی۔“

”تو گویا ہم دو شکار ایک ہی دانے پر مارے گئے‘ لوسیا۔ مجھے اپنی تو کوئی فکر ہے نہیں‘ اس لیے کہ کوئی خاص خطرہ نہیں ہے‘ عدالت نے محض حوالات میں رکھنے کا حکم دیا ہے۔“

”آہ اینٹنی وہ تمھیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مار ڈالیں گے‘ لارنیزو وہاں موجود ہے۔“

”لارنیزو! وہ بھوری داڑھی والا بوڑھا؟“

”نہیں نہیں وہ ایک سخت مزاج جوان ہے وہ مجھ سے محبّت کرتا ہے‘ میں بھی اس سے محبّت کرتی تھی۔ اس وقت تک میں یہ نہیں

سمجھتی تھی کہ محبّت کیا چیز ہے۔ ایٹنی وہ بڑا سنگدل آدمی ہے وہ تمھیں ہرگز نہیں بخشے گا۔"

"وہ جو چاہیں کریں، اس سے زیادہ اور کیا کریں گے۔ مگر پیاری لوسیا تمھارا کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ ایٹنی ذرا دیر کی تکلیف ہوگی جو مجھے برداشت کرنی پڑے گی۔ اس کے بعد کچھ نہیں پیارے، وہ جسے کلنک کا ٹیکا کہتے ہیں، اُسے میں اپنے سر کا تاج سمجھتی ہوں۔"

اُس کے یہ پرجوش الفاظ سُن کر میرا خون جمنے لگا۔ میں نے اپنی تمام سرگزشت بھول کر بلند آواز سے کہا۔ "لوسیا خدارا مجھے بتاؤ آخر وہ قصائی تمھارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

"پیارے ایٹنی میں صاف طور سے اس لیے نہیں کہتی کہ تمھیں سُن کر صدمہ ہوگا مگر مجھے ڈر ہے کہیں تم خفا نہ ہو جاؤ، بات یہ ہے کہ صدر جج نے میرا کان کاٹنے کا حکم دیا ہے تاکہ آیندہ کوئی اطالوی عورت کسی فرانسیسی سے عشق نہ کرسکے اور میں ہمیشہ کے لیے عبرت کا نمونہ بن جاؤں۔"

میں نے دل میں سوچا۔ کان؟ وہ نازک کان کاٹ لیا جائے گا؟ جس کا میں نے بارہا بوسہ لیا ہے۔ اس وقت میں نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے اُس کے مخملی گوشے چھو کر دیکھے کہ آیا وہ ابھی تک صحیح و سالم ہیں یا نہیں۔ ان کے ساتھ کوئی گستاخی تو نہیں کی گئی ہے۔ پھر میں نے دانت بھینچ کر قسم کھائی کہ میرے جیتے جی کوئی انھیں ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ ہاں شاید میری لاش پر سے گزرنے کے بعد....

"ایٹنی، تم فکر نہ کرو۔ یہ سب کچھ گزر جانے کے بعد بھی میں تم سے محبّت کروں گی۔"

"وہ شیطان ہرگز تمھیں کوئی ایذا نہیں پہنچا سکتے۔"

"ایٹنی۔ مجھے امید ہے۔ لارنیزو وہاں موجود ہے، جب میری پیشی ہورہی تھی تو وہ خاموش کھڑا تھا میرے چلے آنے کے بعد اُس نے میری طرف سے بحث کی ہوگی۔"

"ہاں۔ اُس نے کی تھی۔ میں نے اسے بحث کرتے سُنا تھا۔"

"معلوم نہیں وہ ان کے پتھر دل موم کرسکا یا نہیں۔"

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہُوا۔" اتنا کہہ کر میں خاموش ہوگیا میں اسے تفصیل کس طرح بتاتا، میرے خاموش ہوجانے سے وہ خود ہی سب کچھ سمجھ گئی۔ میں عورتوں کی ذہنیت اور ذہانت خوب سمجھتا ہوں، وہ تو بڑی ذی فہم تھی۔

"پیارے تمھیں جھجکنے کی کیا ضرورت ہے، میں خوب جانتی ہوں کہ انھوں نے اُس کی ایک نہ مانی ہوگی۔ دراصل میں تم جیسے بہادر سپاہی سے محبّت کرنے کی اہل ہوں۔ لارنیزو اب کہاں ہے؟"

"اجلاس سے تو وہ باہر چلا گیا تھا۔"

"اب وہ گھر آنا بھی چھوڑ دے گا۔"

"مجھے یقین ہے، ضرور۔"

"اور مجھے اُس نے میرے مقدّر پر چھوڑ دیا ہے۔ ایٹنی کوئی آرہا ہے۔"

کچھ فاصلے پر قدموں کی آہٹ اور پھر تالے میں کنجی گھومنے کی آواز آئی۔ اب وہ کس لیے آرہے ہیں؟ اب تو مقدمے کے لیے کوئی لزوم بھی باقی نہیں رہا۔ اس کے سوا اور کیا مطلب ہوسکتا ہے کہ میری محبوبہ کو جو سزا تجویز کی گئی ہے اُس کی تعمیل کی جائے۔ میں اُس کے اور دروازے کے درمیان میں اڑ کر کھڑا ہوگیا۔ اس وقت میں اپنے بازوؤں میں شیر کی سی طاقت محسوس کر رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا۔ اگر میری محبوبہ کو کسی نے ذرا بھی ہاتھ لگایا تو عجب نہیں کہ میں یہ مکان تہ و بالا کردوں۔

"ہٹو۔ پیچھے ہٹو۔" لوسیا نے چلّا کر کہا۔ "ایٹنی وہ تمھیں مار ڈالیں گے البتہ میری جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے تمھیں میری محبّت کی قسم ایٹنی پیچھے جاؤ۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی، تم میری آواز تک نہیں سنو گے۔ میں اُف بھی نہ کروں گی۔"

جب میں نہ ہٹا تو وہ نازک بدن مجھ سے کشتم کشتا ہوگئی اور پوری طاقت سے دھکیلتی ہُوئی مجھے میری خود ساختہ کھڑکی تک لے گئی اسی وقت میرے دماغ میں ایک تجویز آئی۔

"ہم محفوظ رہ سکتے ہیں۔" میں نے آہستہ سے اُس کے کان میں کہا "بشرطیکہ تم کسی پس و پیش کے بغیر میرا کہنا مان لو۔ تم میری کوٹھری میں چلی جاؤ۔ جلدی کرو۔"

میں نے اُسے کھڑکی میں دھکیل دیا اور تختے لگانے میں اُس کی مدد کی اُس کی شال وہیں پڑی رہ گئی تھی۔ میں نے وہ شال سر سے پاؤں تک لپیٹی اور حوالات کے ایک تاریک کونے میں جا کر لیٹ گیا۔

ادھر میں لیٹا ہوں، ادھر دروازہ کھلا اور چند آدمی اندر داخل ہوئے مجھے یاد ہے ان کے ساتھ کوئی لالٹین نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ لالٹین

کے بغیر آئے تھے انھیں میں کونے میں ایک ڈھیر سا معلوم ہو رہا تھا۔
"کوئی روشنی تو لاؤ" ان میں سے ایک نے کہا۔
"نہیں نہیں، لعنت بھیجو روشنی کا کیا کرنا ہے" کسی نے بھاری آواز میں کہا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ آواز اُسی حرام زادے موٹو کی ہے۔
"اگرچہ مجھے یہ کام سخت ناپسند ہے مگر محترمہ کیا کیا جائے عدالت کا حکم ماننا ضروری ہے، حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔"
دروازہ کھلنے پر مجھے خیال گزرا کہ اچھا موقع ہے بھاگ کر باہر نکل جاؤں، پھر سوچا لوسیا کا کیا حشر ہوگا۔ وہ ضرور ان کے ظلم و ستم کا نشانہ بن جائے گی۔ اُس کے لیے تنہا ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوگا۔

یہ خیالات اُس وقت میرے دماغ میں ہوا کے جھونکوں کی طرح آئے اور لہروں کی طرح گزر گئے۔ آخر اسی پر اکتفا کیا کہ خاموش ہو کر لیٹ جاؤں اور جو کچھ پیش آئے، صبر سے برداشت کروں۔ شال جو میں اُس وقت اوڑھے ہوئے تھا، اُس میں مجھے ایک بھاری ہاتھ ٹٹولتا ہوا محسوس ہوا یعنی اس ڈلاری میں جس میں کبھی اُس نازنین کی نرم و نازک انگلیاں گردش کرتی تھیں۔
دوسرے ہی لمحے اس ظالم ہاتھ نے میرا کان پکڑ لیا۔ بس ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے گرم گرم تپتا ہوا لوہا کان پر رکھ دیا ہو۔ چیخ روکنے کی غرض سے میں نے اپنے ہونٹ دانتوں میں دبا رکھے تھے۔ گرم گرم خون گردن سے بہہ کر کمر تک پہنچ گیا۔
اُس شخص نے میرا سر تھپکتے ہوئے کہا "خدا کا شکر ہے کام ہو چکا محترمہ آپ واقعی بڑی دلیر لڑکی ہیں۔ ایک فرانسیسی سے محبت کرنے کی سزا؟ آپ نے دلیری کا ثبوت یہ دیا ہے۔ آپ انھیں الزام دے سکتی ہیں جنھوں نے حکم دیا تھا۔ میں بے قصور ہوں۔"
میں کیا کر سکتا تھا۔ خاموش لیٹا ہوا اپنی بیکسی پر دانت چباتا رہا۔
اس خیال سے ذرا تسلی تھی کہ میں نے اپنی محبوبہ کی خاطر یہ سب کچھ برداشت کیا۔ مردوں کا دستور ہے کہ عورتوں سے اکثر کہا کرتے ہیں۔ ہم تمھاری خاطر ہر تکلیف برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ میں نے کہا نہیں کر کے دکھا دیا۔ یہ بھی خیال ہوتا تھا کہ لوگ جب میرا قصہ سنیں گے تو ضرور کہیں گے کہ واقعی اس نے بڑا شریفانہ کام کیا اور میری رجمنٹ کے سپاہی ایسے کرنل پر فخر کریں گے۔ غرض اس قسم کے خیالات سے میں اپنے دل کو تسلی دیتا رہا۔ خون گردن سے بہہ کر پتھر کے فرش پر جمع ہو گیا تھا۔ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ نوکروں میں سے کسی نے کہا "خاتون کے بہت خون بہہ



ڈاکٹر: "بہتر ہے اب آپ میرے اس بھائی سے رابطہ قائم کریں جو کفن دفن کا کام کرتا ہے۔"

رہا ہے، کسی ڈاکٹر کو بلا لاؤ ورنہ صبح تک کوئی بُری خبر سننے کو مل سکتی ہے"
"مگر وہ بڑی خاموش لیٹی ہیں، منہ تک نہیں کھولا۔"
"صدمے نے ڈھا رکھا ہے" کسی دوسرے نوکر نے کہا۔
"ابے نالائق" موٹو نے کہا "کہیں جوان عورت بھی آسانی سے مرتی ہے۔ میں نے زیادہ نہیں کاٹا صرف عدالت کے حکم کی تعمیل کی ہے اُٹھیے۔ اُٹھیے محترمہ اٹھ کر بیٹھ جائیے" یہ کہہ کر اُس نے میرا شانہ پکڑ کر ہلایا یہ خیال کرتے ہوئے کہ اب چادر کے اندر سے ان کی اُمید کے خلاف ایک بلا برآمد ہوگی میرے دل کی حرکت بند ہوئی جا رہی تھی۔
"آپ کی طبیعت کیسی ہے" اُس نے پھر دریافت کیا۔
"توبہ، توبہ، لعنت۔ اس عورت کے بجائے جو ڈینس کی یکتا حسینہ ہے، میں نے کسی مرد کا کان کاٹ ڈالا۔ نکولس ذرا اپنا رومال دینا۔ دوڑ کر روشنی تو لاؤ۔"
اب کیا باقی رہا تھا۔ سارا کھیل بگڑ گیا۔ بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں تھی۔ ایک جنگلی بلی کی طرح جو اپنے ناخن سمیٹے، جھپٹنے کے لیے تیار بیٹھی ہو۔ میں اپنے رگ پٹھے سکیڑے ہوئے اس کونے میں پڑا تھا اور یہ تہیہ کیے ہوئے تھا کہ اگر یہاں میرا وقت ہی آ گیا ہے تو کیوں نہ زندگی کی شہرت کے مطابق جان دوں۔
ان میں سے ایک شخص لالٹین لینے گیا۔ موٹو ہاتھ میں رومال لیے مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے راز فاش ہونے والا تھا وہ یکایک کودا

اور الگ جاکر ساکت کھڑا ہوگیا۔ اُسی وقت مجھے اُوپر کی کھڑکی سے چہل پہل اور شور و شر کی آوازیں، آدمیوں کے غل مچانے کی صدائیں، اوپر کے زینے کا دروازہ کھٹکھٹانا، خوفناک آوازیں، چلّا چلّا کر پکارنا دروازہ کھولو شہنشاہ کا نام سُن کر شیطان ایسے بھاگے جیسے آنے والے پنڈتوں نے اُن پر کوئی منتر پڑھ کر پھونک دیا ہو۔ موٹو، دوسرے ملازمین اور منتظم غرض قاتلوں کے اس گروہ میں سے وہاں ایک بھی نہ ٹھیرا۔ پھر تو شور اور بھی زیادہ بلند ہوا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کلہاڑیوں سے تختے پھاڑے جا رہے ہیں ہتھیاروں کی جھنجھناہٹ، برابر کے کمرے میں فرانسیسی سپاہیوں کا شور و غوغا۔

دوسرے ہی لمحے زینے پر کھٹ پٹ ہوئی پھر ایک جواں بانکا آدمی، میری حوالات میں داخل ہوا۔ اُس نے پکار کر کہا ”لُوسیا۔ لُوسیا۔“

وہ دھیمی دھیمی روشنی میں کھڑا ہوا پکار رہا تھا۔ اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور کچھ کہنے کے لیے موزوں الفاظ نہیں مل رہے تھے، وہ ایک دم پھوٹ پڑا ”کیا میں نے تم پر ثابت نہیں کر دیا کہ میں تم سے کس قدر پیار کرتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا ثبوت چاہتی ہو۔ تمھاری خاطر میں نے اپنے ملک کو دھوکا دیا، اپنی قسم توڑ دی، اپنے دستوں کو خیرباد کہہ دیا صرف تمھارے بچانے کے لیے اپنی جان تک خطرے میں ڈال دی اور کیا چاہتی ہو؟“

یہ جوان لارنیزو تھا جسے میں نے عشق کی کرسی سے معزول کر دیا تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ مگر عشق کا وہ کھلاڑی بازی ہار چکا تھا۔ جب دو کھلاڑی ایک کھیل کھیلتے ہیں تو ان میں ایک ضرور ہارتا ہے۔ ہارنے والا اناڑی اور جیتنے والا کھلاڑی کہلاتا ہے۔ میں اُسے یہی فلسفہ بتانا چاہتا تھا۔ مگر میرے منہ سے ابھی ایک لفظ بھی نہ نکلا تھا کہ اس نے مجھے ایک استعجابانہ ڈانٹ پلائی اور لپک کر باہر برآمدے میں رکھا ہوا لیمپ اُٹھا لایا۔ ”اچھا! بدمعاش یہ تم ہو، فرانسیسی مسخرے۔ تم نے مجھے جو نقصان پہنچایا ہے اس کی پوری تلافی کرنی ہوگی۔“ پھر اُس نے میرے زرد چہرے اور سر کی طرف سے خون بہتا ہوا دیکھ کر کہا ”یہ کیا ہُوا؟ تمھارا کان کس نے کاٹا ہے؟“

کمزوری دُور کرتے ہوئے اور رُومال سے زخم صاف کرتے ہوئے میں اپنی جگہ سے اُٹھا۔ گویا ایک کرنل کی شان اور تمکنت کے ساتھ بریگیڈیئر جیرارڈ اُٹھا۔

”جناب یُوں ہی ذرا سی چوٹ آگئی۔ میری رائے میں آپ اس ذاتی جھگڑے میں نہ پڑیں۔“

لیکن اسی وقت لُوسیا کوٹھری سے باہر نکل آئی اور اُس نے لارنیزو کے بازو سے چمٹ کر اُسے ساری کہانی سُنا دی۔

”لارنیزو! اس شخص نے میری جگہ لے کر خود تمام تکلیف برداشت کی جو اس کے مقدّر میں تھی اور مجھے بچا لیا۔“

اس وقت میں نے لارنیزو کے چہرے پر کچھ ہمدردی کے آثار دیکھے، اُس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کرنل جیرارڈ! در حقیقت تم محبّت کے مستحق ہو۔ میں تمھیں معاف کرتا ہُوں، جو بُرائی تم نے میرے ساتھ کی تھی، اُس کا نہایت مہذّب کفارہ ادا کر دیا ہے مگر حیرت تو یہ ہے تم اب تک زندہ کیسے ہو؟ میں تمھارے مقدمے کے وقت عدالت سے باہر چلا گیا تھا میرے خیال میں وینس کے جواہر و نوادر کی تباہی کے بعد کسی فرانسیسی کے ساتھ کوئی رعایت روا نہیں رکھی گئی۔“

لُوسیا نے کہا ”اس نے انھیں برباد نہیں کیا بلکہ اس نے تو خود ہمارے محل کے زر و جواہر بچانے میں بہت مدد دی تھی۔“

”اور ان میں کا ایک بیش قیمت موتی یہ ہے۔“ میں نے لُوسیا کے ہاتھ کا بوسہ لے لیا۔

یہ وجوہ تھیں دوستو جس کے لیے میں نے اپنا کان کٹوایا۔ میرے اُس شب کے واقعے کے دو دن بعد لارنیزو کی لاش سینٹ مارک کے درختوں کی سایہ دار روش میں پڑی پائی گئی۔ اُس کے دل پر خنجر مارا گیا تھا۔ عدالت کے جج اور اُن کا ہلاکو عملہ، موٹو اور اُس کے ساتھی گولی کا نشانہ بنا دیے گئے بقیہ سرکشوں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ میری محبوبہ لُوسیا فرانسیسیوں کے واپس چلے آنے کے بعد مورانو کی خانقاہ میں چلی گئی تھی۔ شاید وہ اب بھی وہیں ہوگی۔ مگر وہ مہذب راہبہ وہ ایّام بھول گئی ہوگی جب دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے اور محبّت کی آگ ہمارے رگ و پے میں روشن تھی۔ اس محبّت کے آگے دُنیا ہیچ تھی، اُسے یاد ہو کہ نہ یاد ہو، مگر اس سن رسیدہ سپاہی کے دل میں گزشتہ دنوں کی یاد اب تک اسی طرح تازہ ہے جس طرح یہ اُس وقت اُس سے محبّت کرتا تھا۔ جوانی گزر جاتی ہے، جذبہ ختم ہو جاتا ہے مگر شریف رُوح میں کبھی تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔ ایٹینی جیرارڈ اب بھی اپنا سفید سر اُس کی خاطر جھکا سکتا ہے اور بڑی خوشی سے دوسرا کان کٹوا سکتا ہے۔ اگر اُسے کوئی خدمت درکار ہو۔




یہودی ادب میں کہانیوں کی ایک خاص صنف ہے جسے عبرانی میں "ھیگادا" کہا جاتا ہے۔ ھیگادا ربانوی کہانیوں کیلئے مخصوص ہے۔ اس میں تخیل کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے



شہنشاہِ اعظم

جب دُنیا کو فتح کرنے کے ارادے سے نکلا تو اُس کا گزر افریقہ کی ایک ایسی بستی میں ہوا جو دُنیا کے ہنگاموں سے دُور اور بڑی پُرسکون تھی۔ یہاں کے باشندوں نے جنگ کا نام تک نہ سُنا تھا اور وہ فاتح اور مفتوح کے معنی سے ناآشنا تھے۔ بستی کے باشندے شہنشاہِ اعظم کو مہمان کی طرح ساتھ لے کر اپنے سردار کی جھونپڑی میں پہنچے۔ سردار نے اُس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا اور ہیرے جواہرات کے پھلوں اور سونے کی روٹیوں سے شہنشاہ کی تواضع کی۔



شہنشاہ نے حیرت سے سوال کیا۔ کیا آپ کے علاقے میں ہیرے جواہرات اور سونا کھایا جاتا ہے؟"

"معزز شہنشاہ! جہاں تک بہترین اور لذیذ ترین غذاؤں کا سوال ہے تو وہ شہنشاہ کو اپنے ملک میں بھی میسر آتی ہوں گی لیکن آپ کو جس شے کی طمع یہاں تک پہنچا لایا ہے وہ یہی چیزیں ہیں اور اگر ہم غلط سمجھے ہیں، تو کیا شہنشاہِ اعظم ہمیں یہ بتائیں گے کہ وہ یہاں کس مقصد سے تشریف لائے ہیں؟"

شہنشاہ نے شرمندہ ہو کر جواب دیا "مجھے آپ کی دولت سے کوئی دِلچسپی نہیں، ہم تو آپ کے رسم و رواج کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں؟"

"بہت خوب" سردار اس طرح ہنسا گویا اُسے شہنشاہ کی بات کا یقین تو نہیں، لیکن احتراماً مانے لیتا ہے۔ فراخ دِلی سے کہا: "آپ جب تک چاہیں رہیں۔"

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ دو قبائلی فریق مدعی اور مدعا علیہ کی حیثیت سے اندر داخل ہوئے۔ سردار کی یہ جھونپڑی عدالت کا کام بھی دیتی تھی۔

مدعی نے کہا "میں نے اس شخص سے زمین کا ایک ٹکڑا خریدا تھا۔ ہل چلانے کے دوران اس میں سے خزانہ برآمد ہوا۔ میں نے یہ خزانہ اس شخص کو دینا چاہا لیکن یہ نہیں لیتا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ خزانہ میرا نہیں ہے کیونکہ میں نے اس سے صرف زمین خریدی تھی۔"

مدعا علیہ نے جواب میں کہا "میرا ضمیر ابھی زندہ ہے۔ میں یہ خزانہ اس سے کس طرح لے سکتا ہوں، میں نے تو اس کے ہاتھ زمین فروخت کر دی تھی۔ اب اس میں سے جو کچھ بھی برآمد ہو یہ اس کی قسمت ہے اور یہی اس کا مالک ہے۔"

سردار نے فریقین کے سوال و جواب خود بھی ادا کیے اس طرح وہ دونوں کو یہ یقین دلانا چاہتا تھا کہ اُس نے دونوں کی رُوداد پُوری توجہ سے سُن لی ہے۔ پھر کچھ غور کرنے کے بعد مدعی سے دریافت کیا "تمہارا کوئی لڑکا ہے؟"

"ہاں ہے۔"

پھر مدعا علیہ سے پوچھا۔ "اور تمہاری کوئی لڑکی ہے؟"

"جی ہاں ہے۔" مدعا علیہ نے اثبات میں گردن بھی ہلا دی۔

"تو تم ان دونوں کی شادی کر کے خزانہ اُن کے حوالے کر دو۔"

اس فیصلے نے شہنشاہ کو حیران کر دیا۔ وہ فکرمند ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

سردار نے متردّد شہنشاہ سے دریافت کیا "کیوں کیا میرے فیصلے سے آپ مطمئن نہیں ہیں؟"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔" شہنشاہ نے جواب دیا۔ "لیکن تمہارا فیصلہ ہمارے نزدیک حیران کُن ضرور ہے"۔ سردار نے سوال کیا۔ "اگر یہ مقدمہ آپ کے رُوبرو پیش ہوتا تو آپ کیا فیصلہ سُناتے؟"

شہنشاہ نے اپنا سوچا سمجھا فیصلہ سُنا دیا "ہم فریقین کو حراست میں لے لیتے اور خزانہ یا دولت کی ملکیت قرار دے کر شاہی خزانے میں داخل کر دیا جاتا"

"بادشاہ کی ملکیت!" سردار نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا آپ کے مُلک میں سُورج دکھائی دیتا ہے؟" "جی ہاں کیوں نہیں۔"

"وہاں بارش بھی ہوتی ہے ——— "بالکل"

بہت خوب!" سردار حیران تھا "لیکن ایک بات اور بتائیں۔ کیا آپ کے ہاں جانور بھی پائے جاتے ہیں جو گھاس اور چارہ کھاتے ہیں؟"

"ہاں ایسے بیشمار جانور ہمارے ہاں پائے جاتے ہیں۔"

"اوہ خوب! میں اب سمجھا" سردار نے یُوں گردن ہلائی جیسے کوئی مشکل ترین بات اُس کی سمجھ میں آگئی ہو۔ "تو اس ناانصافی کی سرزمین میں شاید انہی معصوم جانوروں کے طفیل سورج روشنی دے رہا ہے اور بارش کھیتوں کو سیراب کر رہی ہے۔"






جابر بن یوسف الباقر

۲

گزشتہ قسطوں کے مکمل
خلاصے کے ساتھ :

یہ ایک عرب نوجوان جابر بن یوسف کی سرگزشت ہے۔ جابر کو اپنی زندگی میں ایسے غیر معمولی واقعات و حادثات سے سابقہ پڑا جنہیں عقل تسلیم کرنے سے گریزاں رہتی ہے۔ جابر بن یوسف ایک وجیہہ، جذباتی، ضدی اور شگفتہ مزاج نوجوان تھا۔ آکسفورڈ میں تعلیم کے دوران اُس کی ملاقات انگلستان کی حسین ترین لڑکی فلورا سے ہوئی۔ اُس کی اَن گنت دوشیزاؤں سے دوستی تھی اور وہ خود اُس کے اِردگرد منڈلاتی رہتی تھیں۔ لیکن فلورا ایک بے نیاز، محتاط، علیحدہ علیحدہ رہنے والی لڑکی تھی۔ جابر نے کئی بار اُسے اپنی جانب ملتفت کرنا چاہا مگر ہر بار نا اُمیدی ہوئی۔ اچانک فلورا نے درسگاہ آنا جانا بند کر دیا اور جابر اُس سے ملاقات کا اشتیاق دِل میں لیے بیروت واپس آ گیا۔ جہاں اُس کے باپ پولیس کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ یہاں آ کر وہ اپنی مصروفیات میں اُلجھ گیا لیکن فلورا کی یاد دِل سے نہ گئی۔ ایک دن غیر متوقع طور پر وہ اُسے بیروت میں نظر آ گئی۔ اُس نے اس کا تعاقب کیا اور اُس سے دوبارہ رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ فلورا نے اپنی سیاحت کا مقصد اُس سے پوشیدہ رکھا اور صرف اتنا بتایا کہ وہ ڈربن جا رہی ہے۔ وہ فلورا کو خود سے قریب لانے کے لیے سارا بیروت گھماتا رہا۔ اُنہوں نے تنہائیوں کے کئی خوبصورت دِن گزارے۔

سب رنگ کا ایک نیا تحیّر خیز اور پُراسرار سلسلہ



مگر فلورا کی محتاط روی اَنا اور کھنچے کھنچے رہنے کے انداز میں کوئی فرق نہ آیا۔ جب اُس کے جانے کے دن قریب آئے تو وہ کچھ متاسف سی ہوئی۔ جابر کو اسی لمحۂ خاص کا انتظار تھا۔ فلورا اُس سے متاثر ہو گئی تھی اور جابر کے لیے یہ زندگی کی سب سے بڑی خوش قسمتی تھی۔ فلورا نے اُسے ڈربن میں شریکِ سفر بنانے کا جھجکتے جھجکتے اظہار کیا تو اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے کچھ سوچے بغیر حامی بھر لی۔ فلورا کے ساتھ طویل بحری سفر، یہ اُس کی توقع سے زیادہ بات تھی۔ اب اُس کے سامنے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اپنے سخت دل باپ سے اس سفر کی اجازت کیسے حاصل کرے۔ اتفاق سے یہ مسئلہ خود بخود حل ہو گیا۔ اُس کے باپ نے اُسے ایک ضروری لفافہ دے کر فوراً ہانگ کانگ جانے کا حکم دیا۔ گویا اُسے اپنی عدم موجودگی کا ایک بہانا ہاتھ آ گیا۔ وہ گھر سے رخصت ہو کر فلورا کے ہوٹل پہنچا اور دُوسرے دن وہ بحری جہاز سے ڈربن کے لیے روانہ ہو گئے۔

جہاز میں اُسے فلورا کی قربت کے زیادہ مواقع میسر آئے لیکن فلورا اُس کے لیے ایک معمّہ تھی۔ وہ یہ سفر کیوں کر رہی تھی۔ یہ وہ نہ جان سکا۔ ایک دن شام کو جب وہ جہاز کے سیکنڈ افسر احمد بن طاہر کے کیبن سے واپس لوٹا تو اُسے فلورا اپنے کیبن میں نظر نہیں آئی۔ اُس نے اِدھر اُدھر تلاش کیا مگر اُسے مایوسی ہوئی۔ جب وہ تشویش ناک حالت میں اُسے مسافروں کے درمیان تلاش کر رہا تھا تو ریلنگ کے قریب اچانک ایک بد ہیئت افریقی بڑھیا سے ٹکرا گیا۔ بوڑھی عورت اس شدید ٹکر سے اپنا توازن کھو بیٹھی۔ وہ عجیب و غریب قسم کے ہار، زیورات اور مالائیں پہنے ہوئے تھی اور کوئی پُراسرار ساحرہ معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے گلے میں پڑی ہوئی ایک مالا ٹوٹ کر نیچے گر پڑی اور اُس میں لٹکی ہوئی کسی نیولے کی کھوپڑی پاش پاش ہو گئی۔ بڑھیا کی حالت ایکدم متغیر ہو گئی۔ وہ افریقی زبان میں مقدس جارا کا کے نام سے جابر کو بددُعائیں دینے لگی۔ جابر نے معذرت کی مگر اس معذرت کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بوڑھی عورت بددُعائیں دیتی ہوئی اچانک سمندر میں کُود گئی۔ اُس کے دماغ میں ہیجان برپا ہو گیا۔ جب وہ اس نازک حادثے سے گزر کر واپس آ رہا تھا تو دُوسرے درجے کے کیبن کے نصف دروازے سے اُسے فلورا نظر آئی۔ وہ ایک پستہ قد مرد سے رازدارانہ انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اُس کے دل کو دھچکا لگا۔ اُس کی دانست میں جہاز پر کوئی مسافر فلورا کا واقف نہیں تھا۔ آخر یہ اجنبی کون ہے؟ اس نے طے کیا کہ وہ عشق اور سوز و گداز کے سچے جذبوں کے بجائے فلورا سے عام لڑکیوں کی طرح معاشقہ کرے گا۔ پھر وہ جہاز کے بار رُوم میں غم غلط کرنے پہنچ گیا۔ وہاں احمد بن طاہر نے پیش آنے والے حادثے کے باعث اُسے یہ مشورہ دیا کہ وہ یہ سفر ترک کر کے بیروت واپس چلا جائے کیونکہ ڈربن تک کا سفر اُس کی زندگی کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ جابر توہمات پر یقین نہیں رکھتا تھا لیکن احمد بن طاہر نے جہاز پر گزرے ہوئے کچھ چشم دید واقعات سُنائے اور دوبارہ اصرار کیا کہ وہ سفر ترک کر دے۔ بوڑھی ساحرہ کی بددُعائیں اُسے کسی وقت بھی نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ جابر نے اُس کی بات ہنس کر ٹال دی۔ کیبن میں واپس پہنچا تو فلورا موجود تھی۔ اُس نے اُس سے کوئی باز پُرس نہیں کی اور جاتے ہی اُس کا خوبصورت بدن اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ فلورا نے اُس کی سرشاری کا جواب کسی قدر مثبت انداز میں دیا اور اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر وعدہ کیا کہ وہ ڈربن سے واپسی پر اُسے مایوس نہیں کرے گی۔ جابر شدتِ جذبات میں اُس کا لباس پھاڑنے لگا مگر فلورا آخر اُسے باز رکھنے میں کامیاب ہو گئی۔ جابر اُس کی دل نشیں گفتگو میں یہ بھول گیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اُس سے کس قدر برہم تھا۔ احمد بن طاہر نے ایک بار پھر جابر کو سمجھانے کی کوشش کی اور سحر طراز فلورا نے بھی اُسے افریقی جادوگروں کے واقعات سُنا کر اُسے خوف زدہ کر نا چاہا۔ پھر وُہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ ایک زبردست طوفان آیا اور جہاز ڈولنے لگا۔ چاروں طرف چیخ پکار مچ گئی۔ جہاز سخت طوفان میں گھر گیا تو احمد بن طاہر نے جابر کو مجبُور کیا کہ وہ سمندر میں کُود جائے تاکہ اُس کی قربانی سے جہاز بچ جائے۔ جابر نے انکار کر دیا۔ احمد بن طاہر نے پستول نکال کر اُسے سمندر میں چھلانگ لگانے پر مجبُور کیا لیکن جابر کی دست درازی پر وہ خود سمندر میں گر پڑا۔ جہاز پر قیامتِ صغریٰ مچی ہوئی تھی۔ لوگ بُری طرح لائف بوٹ کی طرف بھاگ رہے تھے۔ زندہ انسان بے جان اشیا کی طرح جہاز پر لڑھک رہے تھے۔ اُسی لمحے اُس نے دیکھا کہ فلورا اُس کی سمت آ رہی ہے۔ اُس نے اُسے کیبن میں جانے کا اشارہ کیا لیکن اُس کا ہاتھ اُٹھا کا اُٹھا رہ گیا۔ وہ لڑھکتا ہوا ریلنگ تک آ گیا۔ پھر اُس کے اعصاب جواب دے گئے۔

اب آگے پڑھیے :

سرد پانی کے تھپیڑے تھے جنھوں نے میرے منتشر اعصاب کو جھنجوڑ دیا۔ میری آنکھ یوں کھُل گئی جیسے کچی نیند سے ہڑبڑا کر اُٹھا ہوں۔ منہ کا مزہ کھارا ہو رہا تھا۔ میں نے خود کو نیچے کی سمت اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا ہوا محسوس کیا۔ میرا دم گھُٹ رہا تھا۔ صرف لمحوں کا معاملہ تھا۔ لمحوں میں اس تحریر کا راقم ایسی گہرائیوں میں دفن ہو جاتا کہ پھر دُنیا والے اس کا نام و نشان بھی نہ پا سکتے۔ مجھے یاد نہیں کہ لمحوں کے اس اُلٹ پھیر میں کیا ہوا۔ مجھے مطلق ہوش نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں، زندہ ہوں یا مر گیا۔ میری رُوح عالمِ بالا کی طرف کوچ کر رہی ہے یا ابھی جسم سے رشتہ جوڑے ہوئے ہے۔ لیکن جب پانی کی زد سے میرا سر آزاد ہوا تو پہلی بار مجھے اپنے زندہ ہونے کا ثبوت ملا اور ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ میں جلد ہی سمندر کی نذر ہو جاؤں گا۔ میں کھلے سمندر کے رحم و کرم پر تھا۔ تیز طوفانی لہریں مجھے اِدھر اُدھر پٹک رہی تھیں۔ اسی وقت لوگوں کی چیخ پکار کی آوازیں سُنائی دیں اور مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ اتنے بہت سے لوگوں کو ڈوبتا دیکھ کر میرے اندر زندگی بچانے کی شدید خواہش پیدا ہوئی اور میں نے جدوجہد شروع کر دی۔

بعض مشغلے جو یوں ہی تفریحِ طبع کے لیے اختیار کر لیے جاتے ہیں، کبھی کبھی بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ میں نے آکسفورڈ کے تعلیمی دَور میں حسین دوشیزاؤں کے بدن کا قریب سے مشاہدہ کرنے کے لیے پیراکی سیکھی تھی۔ پھر میں نے اس میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ پُرانے پیراکوں کو پیچھے چھوڑنے لگا۔ گھنٹوں متواتر تیرتے رہنا میرے لیے کوئی دُشوار بات نہیں تھی۔ ہر چند کہ نہانے کے کسی مصنوعی تالاب اور ایک سمندر میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے لیکن ریت کے ذرّات پر دھوپ میں چمکتے ہوئے جسموں نے مجھے سمندر میں اپنی پیراکی کے جوہر دکھانے پر بارہا اُکسایا تھا۔ میں تعطیلات کے دوران ساحلوں پر نکل جاتا اور چھتریوں کے سائے میں دوشیزگانِ افرنگ کے ساتھ زندگی کے

سب سے حسین لمحے گزارتا۔ جابر، جو ایک وجیہہ اور باوقار عرب تھا، ہمیشہ اپنے مقصد میں کامیاب رہتا۔ جب میں دیر تک پانیوں میں چُھپا رہنے کے بعد سر باہر نکالتا تو حسین دوشیزاؤں کے چہروں پر اطمینان کی لہریں آجاتیں اور وہ عزّت و عظمت کے احساس کے ساتھ میری جانب ملتفت ہوتیں، آج معاملہ دوسرا تھا۔ یہ موقع نہ تو کچھ کر دکھانے کا تھا نہ جلد بازی کا۔ حالات نے مجھے جس امتحان سے دوچار کر دیا تھا' اس میں صبر و تحمّل کی ضرورت تھی۔ میں نے چاروں طرف نظر [illegible] محسوس کر کے اپنے پاؤں کو آہستہ سے جنبش دی اور پانی کے اوپر آگیا۔ میرے بازوؤں میں شدید درد ہو رہا تھا۔ جہاز کا بوائلر اچانک پھٹنے کی وجہ سے ایک ہجوم مجھ پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اسی دوران میں میرا بازو رہ گیا۔ اب اس میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔

پانی کی سطح پر اُبھر کر میں نے تیرنے کی رفتار تیز کر دی۔ اپنے متعلق اتنا بتا دوں کہ میں زبردست قوتِ برداشت کا مالک ہوں۔ میں دیکھنے میں ایک جذباتی، مَن چلا اور بے پروا قسم کا شخص نظر آتا ہوں لیکن اپنی زندگی کی مشکل ترین ساعتوں میں، مَیں نے ہمیشہ زبردست قوتِ برداشت اور تحمّل کا ثبوت دیا ہے۔ جب میرے اَوسان کسی قدر بحال ہوئے اور ہاتھ پاؤں قابو میں آئے تو میں نے چیختی آوازوں کی سمت تیرنا شروع کر دیا۔ جارا کا کا کی مقدس روح نے احمد بن طاہر کے بیان کے مطابق اپنی ہولناک تاریخ بھیانک انداز میں پھر دُہرائی تھی۔ میرا دل اب بھی یہ باتیں تسلیم نہیں کرتا تھا۔ لیکن میرے ساتھ تباہیوں کا خوفناک تماشا ہوا تھا۔ میں جہاز کے ان تمام بدنصیب مسافروں کی تباہی و بربادی کا ذمّے دار تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ پہلے محض ان افراد پر بلائیں نازل ہوتی تھیں جنھوں نے پُراسرار افریقہ کے دیوتاؤں اور ان کے مذہبی عقائد کا مضحکہ اُڑایا تھا۔ اس بار میری ایک اتفاقی اور حادثاتی غلطی کی سزا پورے جہاز کی تباہی اور اُس کے معصوم مسافروں کی غرقابی کی صورت میں سامنے آئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میری زندگی بڑی مختصر رہ گئی ہے۔ تاحدِ نظر پھیلے ہوئے اس پُرشور سمندر میں دوبارہ خشکی کی شکل دیکھنے کی اُمید کون کر سکتا تھا' اس کے باوجود زندگی کی تمنا تھی کہ رہ رہ کر دل میں حوصلہ پیدا کر رہی تھی۔ میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا اور میری کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح ان مسافروں کے قریب پہنچ جاؤں جن کی آہ و زاری سے میرا کلیجا شق ہوا جا رہا تھا۔ وہ صرف میری وجہ سے اس طوفانِ بلاخیز کے شکار ہوئے تھے۔

میں کبھی سمندر کی سرکش اور بپھری ہوئی موجوں کے سامنے سر جُھکاتا اور کبھی ان کا سینہ چیرتا آگے بڑھتا رہا۔ آوازوں کا دِل خراش شور غُل اور زندگی اور موت کی دردانگیز صدائیں جوں جوں میرے قریب آ رہی تھیں، میری رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ دُور موجوں کے زیر و بم پر اُچھلتے کودتے ناچتے اور چکر لیتے ہوئے انسانی ہیولے نظر آئے۔ میں نے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نظریں دوڑائیں لیکن جہاز کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ یقیناً اُسے بے رحم سمندر نے نگل لیا تھا۔ میرے دل کو دھچکا لگا۔ نہ جانے کتنے معصوم بچے، عورتیں اور بوڑھے جہاز کے ساتھ تہہِ آب ہو گئے ہوں گے۔

وہ ہیولے بہت دُور تھے جنھیں مَیں قریب سمجھ رہا تھا' جب مَیں آگے بڑھنے کے لیے پر تولتا تو بگڑی ہوئی موجیں مجھے اُٹھا کر اِدھر اُدھر پھینک دیتیں۔ میں ایک بار پھر ہمت کرتا اور پھر میرے ساتھ موجوں کا یہ شیطانی رقص جاری ہو جاتا۔ خدا کسی کو سمندری طوفان سے دوچار نہ کرے۔ یہ موت بڑی بھیانک ہوتی ہے۔ ایک لمحہ زندگی کی اُمنگ بحال کرتا ہے تو دوسرا لمحہ موت سے قریب کر دیتا ہے۔ کوئی دو گھنٹے تک میں موجوں کے ساتھ ساتھ قلابازیاں کھاتا رہا۔ اعصاب شَل ہو چکے تھے۔ آہ وہ منحوس گھڑی — جب میں نے فلورا سے ایک بار جُدا ہونے کے بعد اُسے دُوسری بار بیروت کے ہوٹل میں دیکھا تھا' فلورا کے حُسن کی قربت میں موت پنہاں تھی' یہ مجھے کیا معلوم تھا اور کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں اُس سے اتنی دُور بھاگتا کہ اُس کا تصوّر بھی میرے قریب نہ پھٹک سکتا۔

فلورا کے سحر نے یہ وقت دکھایا تھا — وہ سیاہ زبان والی مکروہ صورت بڑھیا میری نظروں میں گھوم گئی جس نے جارا کا کا کی ٹوٹی ہوئی کھوپڑی دیکھ کر آسمان کی جانب ہاتھ بلند کیے تھے اور اپنے وحشی دیوتاؤں سے گریہ و زاری کی تھی اور بعد ازاں اپنی زندگی سمندر کی بھینٹ چڑھا دی تھی۔ کاش میں نے اپنے دوست احمد بن طاہر کی بات مان لی ہوتی جس نے بڑے درد اور خلوص سے مشورہ دیا تھا کہ مَیں اپنا سفر ترک کر کے بیروت واپس چلا جاؤں' مجھے اپنی لغزشیں بے وقت یاد آ رہی تھیں' اب ندامت اور پچھتاوے سے کیا ہوتا تھا۔ بلائیں میری منتظر تھیں۔ موت تیزی سے میرا تعاقب کر رہی تھی' انجام کار اس بُڑھیا کی سیاہ زبان نے کام تمام کر دیا — ممکن ہے یہ سرگزشت پڑھنے والے چند حضرات موت کے اتنے قریب گئے ہوں جتنا میں پہنچ گیا تھا' وہ میرا کرب سمجھ سکیں گے۔

کتنا وقت اور گزر گیا' پتہ نہیں کہ میں سمندر کی گود میں کہاں کہاں ہچکولے کھاتا رہا۔ اِن آخری لمحوں میں اپنا ماضی یاد کرنے سے مجھے کچھ سکون سا مِلا — منتشر خیالات تھے کہ اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ گزشتہ دنوں کی ان یادوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کچھ اور طویل ہو گئی ہے —

ذہن اسی پراگندہ خیالی میں مشغول تھا اور ہاتھ پاؤں مشینی انداز میں

موجوں سے جنگ کرنے میں مصروف تھے کہ موجوں کا ایک ریلا کسی دیو قامت عفریت کا روپ اختیار کرکے آیا اور مجھے جھنجھوڑ کر بکھر گیا۔ کوئی ٹھوس چیز پوری قوت سے میرے اوپر آکر گری اور میری آنکھیں دھندلانے لگیں۔ میں نے بدحواسی کی بنا پر تیرنے کے بجائے غیر اصولی طور پر اُلٹے سیدھے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ میں نے سر پر پڑنے والی اس ضرب کی شدید اذیت میں غیر شعوری طور پر اپنے ہاتھ کسی غیبی مدد کے لیے اوپر اٹھائے تو میں نیچے کی سمت جانے لگا پھر جلد سوچنے سمجھنے کی قوت ختم ہوگئی۔ جو کچھ یاد رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ مجھے کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ ہر احساس مُردہ ہوچکا تھا۔ جابر جیسے شخص کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔



میرا جسم کسی ٹھوس شے پر پڑا ہوا تھا۔ جب جسم میں کوئی حرکت پیدا ہوئی اور ذہن ان غنودگیوں سے بیدار ہونا شروع ہوا تو کچھ عجیب سا لگا۔ بدن کے اوپری حصے میں تپش تھی، زیریں حصہ نیم سرد محسوس ہورہا تھا۔ میں نے سوچا۔ غالباً یہ عرصۂ موت ہے۔ روح اور جسم میں شدید کشمکش جاری تھی۔ نسوں کا جال اور ہڈیوں کا پنجر روح کو مقید رکھنے پر بضد تھا اور روح تھی کہ ان خرافات سے آزاد ہوکر اپنے اصل مقام کی طرف گامزن ہوا چاہتی تھی، وہ ایک ایسا احساس تھا جہاں فرد شکست قبول کرلیتا ہے۔ معاً میرا جسم لڑھکتا ہوا کسی گداز شے سے ٹکرایا، پھر سیدھا ہوگیا۔ اسی لمحے کہیں دُور سے آتی ہوئی ایک آواز میرے کانوں میں صدائے بازگشت بن کر گونجی۔ "اسے سمندر میں پھینک دینا ہی مناسب ہوگا۔"

"ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔" دوسری خشک آواز اُبھری "اس کی لاش کا بوجھ کم ہوجانے سے ہمیں کچھ اور تحفظ ملے گا۔"

"وہ مرا نہیں ہے۔ خدا کے لیے رحم کرو۔ وہ زندہ ہوسکتا ہے۔" ایک نسوانی آواز نے التجا کی۔

"وہ اب زندہ نہیں ہوسکتا۔ اس پہ موت طاری ہے۔" کسی نے کہا۔

"بہرحال ہمیں کچھ انتظار کرنا چاہیئے۔"

"ہاں کچھ دیر اور صبر کرلو۔" کسی نے دردمندانہ انداز میں کہا "میں نے اس کی نبض دیکھی تھی۔ ابھی اس کے جسم میں زندگی کی حرارت باقی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ بچ جائے۔ کوئی معجزہ رونما ہوجائے۔"

"ڈاکٹر۔ یہ اسپتال نہیں ہے۔ اس کا ناخوشگوار بوجھ ہم سب کی موت کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے۔" اس آواز میں اُلجھن اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ سختی بھی نمایاں تھی۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اسے اُٹھا کر پھینک دینا چاہیئے۔" ایک اور آواز میرے ذہن میں نشتر بن کر اُترتی چلی گئی۔ "اس کا وجود ہمارے لیے خطرناک ہے۔"

"ٹھیرو۔ کوئی انسانیت سوز فیصلہ کرنے سے پہلے خدا کے لیے کچھ سوچ لو۔ اگر یہ مرگیا تو بھی ہمارے لیے کارآمد ثابت ہوگا۔ احمقو، اس کی لاش ہماری زندگیوں کی ضمانت بن سکتی ہے۔"

"ڈاکٹر ——" ایک نسوانی آواز نے احتجاج کیا مگر اُس کی آواز ڈاکٹر کے بھاری لہجے تلے دب گئی۔

"غور سے سُنو خاتون۔" ڈاکٹر نے رازدارانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ "ہمیں نہیں معلوم کہ ہمارا یہ خطرناک سفر کب تک جاری رہے۔ کون جانے کبھی خشکی کا منھ دیکھنا نصیب ہو یا نہیں۔ ایسی صورت میں زیادہ دنوں تک زندہ رہنے کے لیے خوراک کا مسئلہ ہمارے لیے بے حد اہم ہے۔ میرے بدنصیب ساتھیو! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ جو کچھ میں اس وقت کہہ رہا ہوں ہوسکتا ہے اس کا تصور بھی تمھارے لیے ناقابلِ برداشت ہو، لیکن کل کیا ہونے والا ہے — یہاں کون یقین سے کہہ سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک دن ہم فاقوں سے تنگ آکر درندے بن جائیں اور ایک دوسرے پر جھپٹ پڑیں۔ آنے والے لمحے ہمیں بدترین صورتِ حال سے دوچار کرسکتے ہیں۔ کیوں نہ ہم ابھی سے کل کی فکر کریں۔"

اقرار اور استرداد، حکم اور احتجاج کے یہ مایوس کُن لہجے میں بخوبی سُن رہا تھا۔ میں اپنی بکھری ہوئی قوت مجتمع کرکے ان انسانیت دُشمن لوگوں کے سامنے اپنے وجود کا اثبات ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کوششِ بسیار کے بعد کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔ اطراف میں سراسیمگی سے نظر دوڑائی تو آٹھ نو قصاب نما انسانی چہرے نظر آئے اور مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی کہ اس وقت میں کسی لائف بوٹ میں سوار ہوں۔ یہ کس طرح ممکن ہوگیا، مجھے کوئی ہوش نہیں تھا۔ عالمِ ضعف میں بے چارگی سے میں اپنے اوپر جُھکے ہوئے، سہمے سمٹے، سوچوں میں غرق انسانی چہرے دیکھتا گیا۔ ان میں سے دو اُس جہاز کے خلاصی تھے، جو جارا کاکا کی مقدس روح کی ساحرانہ قوت سے غرقِ آب ہوگیا تھا۔ تیسرا چہرہ ڈاکٹر جواد کا تھا جس سے میری ملاقات تباہ ہوجانے والے بدقسمت جہاز پر میرے دوست احمد بن طاہر نے کرائی تھی۔ ڈاکٹر جواد جہاز پر ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھا۔ باقی چہرے شناسا ضرور تھے لیکن میں اُن کے نام نہیں جانتا تھا۔ میں ابھی ان چہروں کو حیرانی و پریشانی سے تک رہا تھا کہ ڈاکٹر جواد میرے قریب آکر گھٹنوں کے بل بیٹھتا ہوا بولا "اللہ رب۔ اللہ

رب" (اللہ بلانے والا ہے)

ڈاکٹر کی زبان سے ہمدردی کے یہ دو لفظ سن کر میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ ڈاکٹر نے بدستور مجھے دلاسا دیتے ہوئے عربی زبان میں کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ ہو۔ مجھے یقین تھا کہ تم بچ جاؤ گے۔"

ادھر نقاہت اور پیاس کی شدت سے میری حالت دگرگوں تھی۔ حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے، میں نے ڈاکٹر کے ہمدردانہ رویے پر اظہارِ تشکر کرنا چاہا لیکن زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ ڈاکٹر نے میرے چہرے سے دلی کیفیت کا اندازہ لگایا تو جلدی سے بولا۔ "مایوسی کفر ہے میرے عزیز۔ خدا نے چاہا تو تم جلد روبہ صحت ہو جاؤ گے۔"

میں نے اُسے رحم طلب نظروں سے دیکھا۔ ڈاکٹر نے بڑی پھرتی دکھائی۔ اُس نے میری قمیص کے بٹن کھولے اور سینے پر مالش کرنے لگا۔ مجھے اس عمل سے تقویت ہوئی۔ وہ کچھ دیر تک سینے کی مالش کرتا رہا پھر اُس نے میرے ہاتھ اور پاؤں کی مالش کی جس سے میری نقاہت قدرے دور ہوگئی اور زیادہ صاف نظر آنے لگا۔ لیکن بھوک اور پیاس بدستور برقرار تھی، میں نے ایک بار پھر اپنے اردگرد کھڑے ہوئے انسانوں پر نظر ڈالی، پشت کی جانب دیکھا تو آنکھوں کی روشنی تیز ہوگئی۔ وہاں فلورا کھڑی تھی، اُس کا لباس تار تار تھا اور چہرہ دہشت زدہ تھا۔ فلورا کو اپنے قریب دیکھ کر مجھ پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اُس کے چہرے کی شوخی افسردگی میں تبدیل ہو چکی تھی اور غزالی آنکھوں میں شرارت کے بجائے مایوسی کا راج تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور رخساروں پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ اس کیفیت کے باوجود اُس کے حسن و جمال میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اُسے دیکھ کر میرا مضمحل جسم کروٹیں بدلنے لگا ۔۔۔ میں بدقت تمام اتنا ہی کہہ سکا۔ "فلورا ۔۔۔ تم۔"

"جابر ۔۔۔" اُس نے والہانہ انداز سے میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ "اس وقت کوئی بات نہ کرو، زندہ رہے تو بہت باتیں ہو جائیں گی ۔۔۔ تمھیں سکون کی ضرورت ہے۔ قسمت میں جو لکھا تھا پورا ہوا۔"

"فلورا ۔۔۔" میں نے کچھ اور کہنا چاہا تو ڈاکٹر نے انگلی کے اشارے سے روک دیا ۔۔۔

ڈاکٹر جواد ان پریشان کن حالات کے باوجود بڑی تن دہی سے اپنے فرائض کی بجا آوری میں مصروف تھا، اُس کی چارہ گری میں اعجاز تھا، مالش کرنے کے بعد ڈاکٹر نے اپنی قمیص اتار کر سمندر کے پانی سے بھگوئی پھر اُسے میرے منہ پر نچوڑ کر میرا چہرہ صاف کرنے لگا۔ پیاس کی شدت نے مجھے بے حال کر رکھا تھا، رخساروں پر پانی کے قطرے پڑے تو میں نے منہ کھول دیا۔ نمکین پانی نے حلق کے نیچے اُتر کر میرے سینے میں آگ لگا دی۔ مجھے اُبکائی آنے لگی۔ ڈاکٹر نے جلدی سے میری کنپٹیاں سہلانی شروع کر دیں۔ نہ معلوم یہ اُس کے ہاتھوں کے دباؤ کا کرشمہ تھا یا کمزوری کا اثر کہ مجھ پر ایک بار پھر غنودگی کا غلبہ ہونے لگا۔ سمندر کی پُرشور موجوں کی آواز میری سماعت میں بتدریج مدھم ہوتے ہوتے ختم ہوگئی، فلورا کی آغوش میں میری گردن ڈھلک گئی اور میں بے سدھ سو گیا۔

●



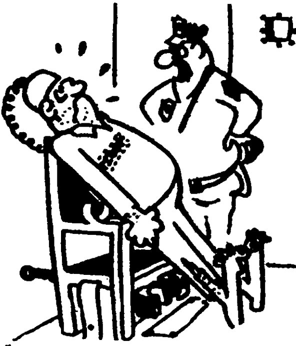
دو روز میں میری حالت معجزانہ طور پر سنبھل گئی۔ میں اب خود کو اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح چاق و چوبند محسوس کرنے لگا جو سمندر کی موجوں کے رحم و کرم پر کسی نامعلوم منزل کی طرف جا رہے تھے، اس میں بلاشبہ ڈاکٹر جواد اور فلورا کی حسین قربت کے علاوہ میری خود اعتمادی کو بھی بڑا دخل تھا۔ فلورا بھی میری صحت یابی سے بہت خوش تھی لیکن دوسرے افراد کو میری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم سب ایک دوسرے کی صورت دیکھا کرتے تھے۔ باہر کی دنیا کی کوئی بات اچھی نہیں لگتی تھی، ہماری نظریں سمندر پر جمی ہوئی تھیں، لائف بوٹ اب پُرسکون سمندر میں داخل ہو چکی تھی، ہماری نظریں ہمہ وقت موجوں کے اس پار کسی جزیرے کی تلاش میں بھٹکتی رہتی تھیں، اس کشتیِ حیات میں گیارہ افراد موت سے فرار کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ میں تفصیل سے ان کا تعارف کرانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر جواد، فلورا اور جہاز کے دو خلاصیوں کے بارے میں، مَیں پہلے ہی بتا چکا ہوں ۔۔۔ باقی چھ افراد میں ایک سیاہ فام حبشی تھا جو قد و قامت اور ڈیل ڈول میں ہم سب سے زیادہ طاقت ور نظر آتا تھا۔ وہ کوئی چالیس پینتالیس سال کا خوف زدہ کر دینے والا ایک شخص تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد میں نے اُسے کسی سے گفتگو کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی آنکھیں بے حد چمکیلی تھیں، نہ جانے کیوں دن میں متعدد بار وہ سورج کی طرف گھورنے لگتا تھا۔ اس وقت اُس کے موٹے اور بھدے ہونٹ پھڑپھڑاتے رہتے تھے۔ جب وہ سورج کی جانب سے نظریں ہٹا لیتا تھا تو ہونٹوں کی جنبش رک جاتی۔ دوسرا شخص کمال نامی ایک مصری تاجر تھا۔ وہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ اُس کے قویٰ خاصے مضبوط تھے اور اُس کی عمر بھی کوئی چالیس سال ہوگی۔ ایک دو بار میں نے اسے ڈاکٹر جواد سے گفتگو کرتے دیکھا تھا۔ وہ عام طور پر لائف بوٹ کے درمیان میں بیٹھنے کی کوشش کرتا۔ وہ فلورا پر گاہے گاہے ایک مایوس کن نظر ڈال کر ٹھنڈی آہیں بھرتا۔ تیسرا مسافر ایک یہودی تھا جو ہم سب سے زیادہ پریشان نظر آتا تھا۔ مجھے نہ جانے کیوں اس سے شدید نفرت تھی۔ بار بار یہ خیال آتا کہ اگر موت ہمارا مقدر ہے تو سب سے پہلے مرنے والا یہی شخص ہوگا۔ اُس کا بیشتر وقت نچلا ہونٹ چبانے

میں گزرتا تھا۔ فلورا نے مجھے بتایا کہ اُسی نے سب سے پہلے مجھے مُردہ سمجھ کر میری لاش سمندر میں پھینکنے کا مشورہ دیا تھا۔ چوتھا شخص ایک انگریز نوجوان طالب علم جم پارک تھا جو تعطیلات گزارنے کے ارادے سے اپنی والدہ کے پاس ڈربن جا رہا تھا۔ اُس کی والدہ کو کیا معلوم تھا کہ اب وہ بیٹے کا چہرہ مشکل ہی سے دیکھ سکیں گی۔ یہودی کی طرح یہ بھی موت کے تصور سے بے حد ہراساں نظر آتا تھا۔ یہ فلورا سے بہت زیادہ دلچسپی لیتا اور بعض اوقات اُس سے ایسے سوالات شروع کر دیتا جیسے اُسے یہ معلوم ہو کہ ہماری لائف بوٹ کب کنارے لگے گی اور کب ہمیں خشکی کا منہ دیکھنا نصیب ہو گا۔ وہ لانبے قد اور اکہرے جسم کا جاذبِ نظر نوجوان تھا۔ باقی دونوں اشخاص ہندی تھے۔ ان میں ایک بوڑھا شخص سرنگا داس تھا جو ہندوستان کے مشرقی علاقے بنگال سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ شخص مجھے حبشی کی طرح پُراسرار نظر آتا تھا۔ سرنگا داس بارعب شخصیت کا مالک تھا اور بہت کم گو تھا۔ اُس کی زیرِ لب مسکراہٹ میں بڑا دبدبہ تھا۔ وہ دِن بھر خلا میں گھورتا رہتا اور کسی عورت کی چھوٹی مورتی سامنے رکھ کر مالا پڑھتا رہتا۔ اُسے چومتا اور اوپر کی جیب میں رکھ لیتا۔ اُس کے ساتھ ایک بہت ہی حسین لڑکی سریتا بھی موجود تھی۔ شرمیلی، نازک، تیکھے خدوخال، لانبے سیاہ بال اور کھلتا ہوا گندمی رنگ۔ وہ بہت سہمی ہوئی خاموش خاموش اپنے بابا کے پہلو میں بیٹھی رہتی تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس سے بات کرنے کو خود بخود دِل چاہے۔ اس کے چہرے پر حزن، تقدس اور پاکیزگی تھی۔ وہ ایک ایسا شاداب پھول تھی جو ڈال پر لٹکا ہوا ہو اور کسی ہاتھ نے اُسے مس نہ کیا ہو۔

خلاصیوں میں ایک کا نام جعفر اور دوسرے کا شیخ طاہر تھا۔ یہ دونوں ہی پستہ قد اور گٹھے ہوئے جسموں کے مالک تھے۔ سمندری سفر میں چونکہ ایک عمر گزر گئی تھی اس لیے وہ دونوں ہم لوگوں کے مقابلے میں نسبتاً کم پریشان تھے۔ میں نے ان دونوں کو ہمیشہ قریب قریب اور محتاط دیکھا تھا۔ البتہ ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی۔ وہ یہ کہ دونوں خلاصی سیاہ فام حبشی کو کینہ توز نظروں سے دیکھتے تھے جیسے جہاز کی تباہی کا اس سیاہ فام حبشی سے کوئی گہرا تعلق رہا ہو۔

سمندر سات روز تک ہماری لائف بوٹ سے آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ اس عرصے میں ہماری حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ دھوپ کی تمازت اور رات کی خنکی نے ہماری جلد کے رنگ بدل دیے تھے، لباسوں میں ایک عجیب سی بو بس گئی تھی۔ بھوک اور پیاس کی شدت نے ہوش و حواس معطل کر رکھے تھے۔ ہر شخص نڈھال تھا۔ بے رحم آسمان سر پر تھا۔ بے رحم سمندر تا حدِ نظر خرمستیاں کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ ہمارے پاس جو تھوڑی بہت غذا تھی وہ ختم ہو چکی تھی حلیہ جنگلیوں جیسا ہو گیا تھا۔ فلورا کا حسین اور شاداب چہرہ کمھلا گیا تھا۔ میں اس سے دل جوئی کی باتیں کرتا تو وہ ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ سمندر پر نظریں جما دیتی۔ میں اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر اُسے برداشت اور تحمل کی تلقین کرتا تو وہ گھٹنوں میں سر رکھ کر ہچکیاں لینے لگتی۔ پاس ہی بیٹھی ہوئی ہندی دوشیزہ فلورا سے زیادہ پریشان تھی۔ ہر شخص بھوک سے تڑپ رہا تھا۔ اپنے اپنے خشک حلق تر کرنے کے لیے مضطرب تھا۔ ہر شخص اُونگھ رہا تھا سوائے اس پُراسرار قسم کے سیاہ حبشی کے۔ اس کی آنکھیں کھلی رہتیں۔ شروع کی راتیں جاگتے گزر گئیں، لیکن آٹھویں رات کا ذکر ہے کہ ہم سب اونگھنے لگے، ایک کو سوتا دیکھ کر دوسرے کو ترغیب ملی، اُس رات میری آنکھ بھی لگ گئی، میں فلورا کے قریب اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سو گیا۔ ہندی دوشیزہ بھی فلورا سے لپٹی ہوئی تھی۔ ہوا اس کی سبز ساڑھی بار بار اُڑا دیتی تھی۔ اب اُس نے کچھ اس طرح اُسے باندھ لیا تھا کہ سوتے میں تیز ہوائیں اُس سے چھیڑ خانی سے باز رہنے لگیں۔ کچھ کھٹکھٹاہٹ ہوئی تو میری آنکھ کھل گئی۔ میری چھٹی حس نے کوئی خطرہ سونگھ لیا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو سیاہ فام حبشی کو بدستور جاگتا پایا۔ تاریکی میں اُس کا ہیبت ناک چہرہ کچھ زیادہ ہی بھیانک لگ رہا تھا۔ اس وقت اُس کی بڑی بڑی خوفناک نظریں یہودی پر جمی ہوئی تھیں جو اُس کے قریب ہی لائف بوٹ میں پڑا ہوا تھا۔ یہ کوئی ایسی خطرے کی بات نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں نہ جانے کیوں پلکوں کی جھری سے سیاہ فام حبشی کی حرکات و سکنات گھورتا رہا۔ کسی اندیشے کے پیشِ نظر میرے دل کی حالت غیر ہو گئی۔ میں حبشی کو دیکھتا رہا، وہ کچھ دیر تک یہودی کو نفرت سے گھورتا رہا۔ پھر اُس نے احتیاط سے دوسرے مسافروں پر نظر ڈالی۔ پھر آہستہ سے اُٹھ کر ایک خلاصی کے قریب گیا اور جھک کر کچھ ٹٹولتا رہا۔ وہ جب دوبارہ کھڑا ہوا تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ کہیں میری طرف تو نہیں آ رہا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں کھلا ہوا خنجر تھا۔ میں پوری طرح مستعد ہو گیا۔

حبشی نے وہ خنجر خلاصی کی پیٹی سے نکالا تھا۔ خوف سے میرا بُرا حال تھا مگر وہ میری طرف آنے کے بجائے یہودی کے قریب گیا اور اُسے غور سے گھورنے لگا، میں چپ چاپ دم سادھے پڑا رہا۔ حبشی نے ایک بار پھر سرسری نظروں سے سوتے ہوئے باقی افراد کو دیکھا پھر ایک گھٹنا ٹیک کر یہودی کے سیدھے ہاتھ کی جانب بیٹھ گیا۔ حبشی اب ہر طرف سے بے نیاز تھا۔ اُس نے خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور اُلٹے ہاتھ کو پوری قوت کے ساتھ یہودی کے منہ پر رکھ دیا اور آنِ واحد میں خنجر اس کے سینے میں پیوست کر دیا۔ میری آنکھیں دہشت سے بند ہونے لگیں، حبشی یکے بعد دیگرے یہودی پر خنجر کے وار کر رہا تھا۔ اُس کا اُلٹا ہاتھ پوری قوت سے یہودی کے منہ پر جما ہوا تھا۔ یہودی کا جسم کسی ماہیِ بے آب کی



"تمھیں مر کے بھی چین نہیں، سیدھے بیٹھو گے یا لگاؤں ایک تھپیڑ"

طرح تڑپ تڑپ کر ساکت ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے جو منظر دیکھا اُس پر شاید ہی یہ سرگزشت پڑھنے والے یقین کریں، مگر اُس کا تصور آج بھی میرے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ سیاہ فام حبشی نے یہودی کی ران سے گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا کاٹا اور اس طرح کھانے لگا جیسے لذیذ روسٹ کھا رہا ہو۔ گوشت کھانے کے ساتھ ساتھ وہ بار بار یہودی کے جسم پر منہ مارتا تھا۔ ایک بار ہلکی سپڑ سپڑ کی آواز اُبھری تو میرا جی اُلٹنے لگا۔ آہ وہ درندہ صفت حبشی، یہودی کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہا تھا۔

آدھ گھنٹے تک میں بے حس و حرکت پڑا رہا۔ حبشی جب پیٹ بھر کر یہودی کا گوشت کھا چکا تو اُس نے ایک لمبی اور کراہت آمیز ڈکار لی۔ خنجر دوبارہ خلاصی کی پیٹی میں اڑسنے کے بعد اُس نے سمندر کے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ پھر ایک طرف سمٹ کر لیٹ گیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی اور آسانی سے ہوگیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ایک میں ہی بدنصیب تھا جو درندگی کا یہ انسانیت سوز کھیل دیکھنے کے لیے جاگ رہا تھا۔ اُس رات مجھے نیند نہیں آئی۔ میری زندگی کی وہ طویل ترین رات تھی۔ کبھی آنکھ لگ جاتی تو تصور میں یہودی کا پھڑ پھڑاتا جسم اُبھرتا۔ آنکھیں کھلی رکھتا تو اُس کی خون آلود لاش نظر آتی۔

میرا خیال تھا کہ جب دوسرے بدقسمت مسافر بیدار ہوں گے اور لائف بوٹ پر اپنے ایک ساتھی کی لاش دیکھیں گے تو باز پرس کریں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ علی الصباح جب وہ بیدار ہوئے تو ایک ثانیے کے لیے میں ہکا بکا رہ گیا۔ انھوں نے کچھ دیر توقف کیا۔ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے پھر خلاصی شیخ طاہر ندیدوں کی طرح لاش پر ٹوٹ پڑا۔ اُس کی تقلید دوسرے خلاصی نے کی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندی سرنگا اور سریتا کے سوا سب لوگ لاش پر ٹوٹ پڑے۔ وہ اُس کے جسم کا گوشت نوچ نوچ کر اور کاٹ کاٹ کر جانوروں کی طرح کھانے میں مصروف تھے۔ فلورا بھی وہاں تھی۔ میں نے خود پر جبر کیا لیکن جب اشتہا حد سے بڑھی تو میں انسان سے درندہ بن گیا اور جھپٹ کر یہودی کی لاش پر ٹوٹ پڑا۔ اکڑے ہوئے کچھ گوشت کا ٹکڑا جب میں نے پہلی بار دانتوں تلے دبایا تو میرا جی متلا گیا۔ مجھے کراہت کا شدید احساس ہوا۔ لیکن یہ سب وقتی باتیں تھیں۔ پیٹ بھرنے اور زندگی برقرار رکھنے کی خاطر انسان بڑے سے بڑا گناہ کر گزرتا ہے، انسانی گوشت بھی حقیقت رکھتا تھا۔ یہودی کا گوشت کھاتے وقت میں نے ایک بار کنکھیوں سے حبشی کی طرف دیکھا جو ایک بوٹی لیے بڑی دیر سے چبا رہا تھا، صرف سرنگا اور سریتا دونوں منہ پھیرے علیحدہ بیٹھے ہوئے تھے، وہ اس درندگی میں شریک نہیں تھے۔ مجھے اس بوڑھے اور لڑکی کے ضبط اور تحمل پر حیرت ہوئی۔ خلاصی شیخ طاہر نے اُسے آواز دی۔ "سرنگا۔ مجبوری ہے۔ آؤ۔ اپنے پیٹ کا جہنم بھر لو۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔"

بوڑھے سرنگا نے جواب میں نفرت سے منہ پھیر لیا۔

"ہاں ہاں آجاؤ۔ پھر یہ گوشت بے کار ہو جائے گا۔ نہ جانے کب تک ہمیں بھوکا رہنا پڑے۔ تم نہیں آتے تو لڑکی کو بھیج دو۔" جم نے بوڑھے سے کہا۔

"تم کتے ہو —" سرنگا نے حقارت سے کہا۔ "میں ایک ماہ اسی طرح رہ سکتا ہوں۔ سریتا میں بھی تم سب سے زیادہ قوتِ برداشت ہے۔"

"تم پچھتاؤ گے۔" ڈاکٹر جواد نے کہا۔

"میں مر جانا بہتر سمجھتا ہوں۔"

شیخ طاہر نے سرگوشی میں مسکراتے ہوئے ہم سے کہا۔ "تو پھر ہم کچھ دن اور زندہ رہ لیں گے۔" بوڑھے نے یہ بات نہیں سُنی۔ اُس نے گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا۔ سریتا آمادہ نظر آتی تھی مگر وہ بوڑھے سرنگا سے کچھ زیادہ ہی خوف زدہ معلوم ہوتی تھی۔

مجھے احساس ہے کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کو پھاڑ کھانا سنگین ترین گناہ ہے۔ لیکن ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہماری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ مسلسل فاقوں نے ہمیں درندہ بنا دیا تھا۔ اگر سیاہ فام حبشی پہل نہ کرتا تو عین ممکن تھا کہ یہ لرزہ خیز کام ہم میں سے کسی اور کو بالآخر انجام دینا پڑتا۔

غرضیکہ جب ہم میں سے ہر شخص یہودی کے جسم کا گوشت حلق تک ٹھونس چکا تو طے ہوا کہ اُس کی لاش کا باقی ماندہ حصہ جو اب ہڈیوں کے پنجر پر مشتمل رہ گیا تھا۔ سمندری جانوروں کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ مشورہ سب سے پہلے فلورا

نے دیا تھا جو شکم سیری کے بعد اب لاش دیکھ کر خوف زدہ ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے فلورا کے مشورے کی تائید کی۔ اُس کا خیال تھا اگر لاش لائف بوٹ پر رہنے دی گئی تو اس کا تعفن دوسروں کی بیماری یا کسی وبا کا باعث بن سکتا ہے ہم میں سے ہر شخص اس بات پر متفق ہو گیا لیکن پُراسرار قاتل اور سیاہ فام حبشی نے اس وقت بھی خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ اُس کی نظریں اب بھی یہودی کے بھیانک چہرے اور اُدھڑے ہوئے جسم پر مرکوز تھیں ۔ ڈاکٹر نے جب ایک خلاصی کی مدد سے یہودی کی لاش اٹھانا چاہی تو وہ پُراسرار حبشی جو آٹھ روز تک اپنی زبان کو تالو سے چپکائے رہنے پر قادر رہا تھا، چُپ نہ رہ سکا اُس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔ "ڈاکٹر۔ لاش کو سمندر میں مت پھینکو۔ یہ ہمارے لیے کارآمد ثابت ہوگی ۔"

ہر شخص کو حبشی کے بولنے پر تعجب ہوا اور سب کی نگاہیں اُس کے چہرے کی جانب اُٹھ گئیں۔ ڈاکٹر نے وجہ دریافت کی تو حبشی نے آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں پھر کچھ بدبدانے کے بعد خوفناک انداز میں ڈاکٹر سے بولا۔ "ابھی وجہ مت پوچھو۔ سُورج کو سر پر آنے دو۔ پھر تمھیں معلوم ہوگا کہ اُس بدبخت کی لاش ہمارے لیے کتنی قیمتی ہے۔ مجھے ایک موقع دو جو میں کہتا ہوں اس پر عمل کرو۔ خاموش رہو۔"

ڈاکٹر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنے شانے اُچکائے اور لاش کو دوبارہ لائف بوٹ میں چھوڑ دیا۔ حبشی سے کسی نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ میری طرح شاید سبھی اُس سے خائف تھے۔ فلورا مجھ سے چپکی ہوئی تھی۔ حبشی نے نظریں سمندر کی طرف گھمائیں تو اس نے بہت آہستہ سے سرگوشی کی۔ "جابر مجھے یہ حبشی کوئی بہت خطرناک شخص لگتا ہے، مگر اس کا وجود ہمارے لیے اعتماد کا باعث ہے شاید یہ ہماری کوئی مدد کر سکے۔"

"مدد۔ وہ کیسے؟" میں نے آہستگی سے مُسکرا کر پوچھا۔

"اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھو۔ ان میں ساحرانہ چمک ہے، ساری دوپہر کو سُورج سے آنکھیں لڑاتا ہے۔ میں نے ڈربن کا سفر کئی بار کیا ہے افریقی جادوگروں کے بارے میں، میں نے بہت کچھ معلوم کیا۔ تم نہیں جانتے وہ بڑی پُراسرار قوتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں یہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں لیکن افریقہ میں جگہ جگہ اس کا چرچا ہے۔ یہ حبشی بھی کوئی جادوگر معلوم ہوتا ہے ایسے لوگوں کیلیے کوئی بات ناممکن نہیں ہوتی۔ کیا تم نے غور کیا کہ وہ گزشتہ سخت دنوں میں ایک لمحے بھی فکرمند نظر نہیں آیا؟" فلورا نے کہا۔

فلورا کی باتوں نے میرے خدشات کو ہوا دی۔ افریقہ کی گھنی اور تاریک بستیوں کے اسرار کے متعلق سُنا ہی سُنا تھا کہ ان لوگوں کی دُنیا ہی عجیب ہے، وہ ساری دنیا کے لوگوں سے مختلف ہیں، ان کے عقیدوں، رسم و رواج کی بنیاد توہمات پر ہے۔ سُنا تھا کہ ان کے کاٹے کا کوئی منتر نہیں ہوتا۔ جہاز کے اندوہناک حادثے اور فلورا کی زبانی تاریک افریقہ کے پُراسرار واقعات سن کر میں ڈانواڈول ہو گیا اور توہم کے ریلے میں بہہ گیا۔ ہم دونوں اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ گرانڈیل حبشی نے ایک دم پلٹ کر خونخوار انداز میں فلورا کی جانب نگاہیں اُٹھائیں۔ فلورا نے وہ تمام باتیں اتنی آہستہ کی تھیں کہ ان کا حبشی کے کانوں تک پہنچنا محال تھا لیکن اُس کی وحشت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اُس نے ہماری ساری باتیں سُن لی ہیں۔ فلورا میری طرف متوجہ تھی اس لیے وہ حبشی کی خوفناک نظریں نہ دیکھ سکی۔ چند لمحوں تک وہ اسی طرح آنکھیں نکالے بیٹھا رہا، پھر اُس کی نگاہوں کی دہشت کسی قدر کم ہوئی۔ اُس نے نفرت بھرے انداز میں مجھے مخاطب کیا۔ "سیکا جوجی میکو آنا لاما۔ مسی راہو غوغا۔ سیکا۔ ابیش را اپنی عورت کو سمجھاؤ میں شہرت پسند نہیں کرتا۔ مقدس دیوتا کی نظریں دل کا حال بھی پڑھ لیتی ہیں اپنی عورت کو خاموش رہنے کی ہدایت کرو۔"

حبشی کی بات سُن کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ میں ہر اعتبار سے ایک مکمل عرب نظر آتا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ جہاز پر میری اُس سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر اُسے کیسے علم ہو گیا کہ میں ٹوٹی پھوٹی زبان بول سکتا ہوں یقیناً فلورا کا خیال درست تھا۔ میں نے اُسے ادب سے جواب دیا۔ "سیکا آبی گاما۔ سوبار ولینا سے ون" (میں اپنی عورت کو سمجھا دوں گا۔ تم مطمئن رہو)۔"

"جابر" فلورا نے سہمتے ہوئے پوچھا "یہ تم سے کیا کہہ رہا تھا؟"

"تم اس کے بارے میں کچھ مت پوچھو، زبان بند رکھو۔ جو کچھ تم کہتی ہو اُسے معلوم ہو جاتا ہے۔ اس کے کان بہت بڑے ہیں۔ کوئی اور بات کرو ۔۔۔" میں نے اُسے سمجھایا۔

فلورا نے گھگھیا کر حبشی کی سمت دیکھا پھر کسی ڈر سے نظریں جھکا لیں۔ میں نے اُسے دوسری باتوں میں لگا لیا۔ ہم سب کو اس بات کا انتظار تھا کہ سورج سر پر آئے تو حبشی کو ٹٹولا جائے، چنانچہ جیسے جیسے سورج بلند ہوتا جاتا تھا، ہمارا اضطراب بڑھتا جاتا تھا۔ جب سُورج چہار سمت چھا گیا اور اُس کی کرنیں جسم میں چُبھنے لگیں تو ڈاکٹر نے حبشی کو مخاطب کیا۔ اُس کا لہجہ بڑا نرم تھا۔ "میرے دوست اب لاش کے بارے میں تمھارا کیا ارادہ ہے؟"

حبشی نے ایک نظر آگ اگلتے ہوئے سورج پر ڈالی پھر اپنی جگہ سے اُٹھا۔ جہاز کے ایک خلاصی کی جانب اشارہ کر کے اس نے خنجر مانگا پھر یہودی کی لاش کے نزدیک بیٹھ کر بڑی چابکدستی سے اُس کی آنکھیں نکالنے لگا۔ اس کا یہ عمل بڑا جارحانہ تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے اس کام میں مہارت تامہ حاصل ہو، ہم سب کی نظریں اُس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ہڈیوں کے حلقے کے اندر دھنسی ہوئی بے جان آنکھیں آہستہ آہستہ باہر آ رہی تھیں، ڈاکٹر جواد بڑی توجہ سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا یکلخت وُہ وحشت ناک انداز میں چلّایا۔ "یہ ظلم ہے، درندگی ہے۔ تم سب وحشی اور پاگل ہو گئے ہو۔"

پھر اس سے قبل کہ ہم دخل دیتے کہ ڈاکٹر جواد کو نہ جانے کیا ہوا اُس نے چیتے کی سی پھرتی سے وحشی پر چھلانگ لگا دی حبشی لڑکھڑایا مگر دوسرے ہی لمحے اُس کی بھرپور لات ڈاکٹر کے پیٹ پر پڑی تو وہ تلملا کر لائف بوٹ کے درمیان میں گرا۔ دوبارہ سنبھل کر کھڑا ہوا لیکن حملہ کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اُس کے قدم رک گئے جیسے کسی نادیدہ قوت نے اسے جکڑ لیا ہو۔ وہ آگے بڑھنے کے لیے پاؤں چلاتا رہا۔ پھر تیورا کر بے ہوش ہو گیا۔ حبشی نے لاپروائی سے اپنا عمل جاری رکھا۔ میں نے ڈاکٹر کو دیکھ کر حبشی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"یلوسی پراتو سا۔" (کیا یہ مر گیا)

"شابو۔ دم بالوہ کو سنیں دن۔" (نہیں۔ البتہ یہ ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے) حبشی نے اکھڑ لہجے میں جواب دیا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ حبشی سے کچھ اور پوچھوں یا اٹھ کر ڈاکٹر کی نبض دیکھوں۔ کسی میں جرأت نہیں تھی۔ سب دم بخود تھے۔

حبشی نے یہودی کی دونوں آنکھیں نکال کر خنجر خلاصی کی طرف پھینک دیا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں بے جان آنکھوں کو اُس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں پر رکھا۔ ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے اپنی زبان میں بدبدانے لگا۔ اُس کی آواز لمحہ بہ لمحہ بھیانک ہوتی جا رہی تھی، نظریں سورج پر جمی ہوئی تھیں، وحشت کے آثار جب اُس کے چہرے پر گہرے ہو گئے تو اُس نے اچانک دونوں آنکھوں کو سمندر میں پھینکا اور گھٹنے ٹیک کر اپنا سر لائف بوٹ سے ٹکرانے لگا۔ وہ کسی عبادت میں مصروف تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے طوفانی ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے اور کشتی بُری طرح ڈولنے لگی۔ پھر یہ ہوا کہ لائف بوٹ کا رُخ ہوا نے موڑ دیا۔ لمحوں میں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ہم کسی جوار بھاٹا کی زد میں آ گئے ہوں۔ فلورا مجھ سے اور سر یتا فلورا سے لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے ان دونوں کو پناہ دی تھی بوڑھا سرنگا بڑی دلچسپی اور انہماک سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ طوفانی ہواؤں نے خس و خاشاک کے مانند لائف بوٹ کو اُڑانا شروع کر دیا تھا۔ حبشی کی عبادت کا عجیب و غریب عمل جاری تھا۔ لائف بوٹ کے تمام مسافر ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک سیاہ فام حبشی نے اپنی عبادت ختم کی۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں اُس نے شعلہ بار نظروں سے سُورج کو دیکھا اور پھر پُرسکون ہو کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ پھر میں نے ہمت کر کے اُس سے پوچھا۔ "دوست ان سب باتوں کا کیا مطلب ہے۔ طوفانی ہوائیں لائف بوٹ کو غرق کر دیں گی۔"

"نہیں" حبشی بڑے اعتماد سے بولا۔ "میں نے اُسے یہودی کی آنکھیں بھینٹ کر دی ہیں۔ دیوتا ہماری رہبری کریں گے۔ ہم جلد ہی کسی قریبی جزیرے تک پہنچ جائیں گے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن میں نے دیکھا ہندی بوڑھا سرنگا مسکرا رہا تھا اور افریقی کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

●

دو روز تک سوائے اس کے اور کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا کہ ڈاکٹر جواد حقیقتہً ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔ طوفانی ہواؤں کا زور بدستور قائم تھا۔ ہماری لائف بوٹ حیرت انگیز طور پر ہوا کے رُخ پر ہچکولے کھاتی آگے بڑھ رہی تھی، ہم میں سے ہر شخص

ایک شرابی نشے میں مست، جھومتا جھامتا شراب خانے میں داخل ہوا اور بارمین سے بولا: "ایک پیگ ہمارے لیے، اور ہماری طرف سے ان سب گاہکوں کو ایک ایک پیگ دیا جائے اور ہاں...... تم بھی ایک پیگ پی لو۔"

بارمین نے تعمیل کر دی لیکن جب بل دیا گیا تو شرابی کی جیب خالی نکلی۔ بارمین نے بیروں کو اشارہ کیا اور انہوں نے اسے مارپیٹ کر باہر نکال دیا۔

چند روز بعد وہی مردِ مست پھر شراب خانے میں آیا اور بولا۔ "ایک پیگ ہمارے لیے۔"

بارمین بولا۔ "ہر گاہک کیلیے ایک ایک پیگ اور ایک میرے لیے؟"

شرابی نے بات کاٹ کر کہا۔ "نہیں...... تم نہ پینا۔ ایک پیگ پیتے ہی تم بدمست ہو جاتے ہو۔"

نے اپنے طور پر یہ سمجھ لیا کہ سیاہ فام حبشی یقیناً کوئی جادوگر ہے چنانچہ ہر شخص اس سے خائف تھا، ڈاکٹر کی ذہنی حالت تشویشناک حد تک خراب ہوچکی تھی، متعدد بار اس نے سمندر میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی لیکن حبشی اُس کی طرف سے غافل نہیں تھا جب وہ تنگ آگیا تو ڈاکٹر کو لائف بوٹ کی رسّیوں کے ساتھ اس طرح جکڑ دیا گیا کہ وہ بیٹھے بیٹھے محض پاؤں کو حرکت دے سکتا تھا نہ کھڑا ہوسکتا نہ اپنے ہاتھوں کو کسی کام میں لاسکتا تھا، میرے دریافت کرنے پر کہ حبشی ڈاکٹر کے سلسلے میں اس قدر محتاط کیوں ہے اُس نے مجھے بتایا کہ وہ اور اُس کے قبیلے کے لوگ ڈاکٹروں کو قابلِ پرستش سمجھتے ہیں اور ہر قیمت پر ان کی جان و مال کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

تیسرے روز علی الصباح ایک اور ہولناک حادثے نے حبشی کی شخصیت ہمارے لیے خوفناک حد تک پُراسرار بنادی، بات گو اتنی خاص نہیں تھی لیکن بس اچانک ہی حالات نے بدترین صُورت اختیار کرلی، حبشی حسبِ دستور ڈاکٹر کے قریب بیٹھا ہوا اُسے عقیدت مندانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ ڈاکٹر نے ہذیانی انداز میں ہانک لگائی۔ ”ہالٹ — کون ہے، جواب دو ورنہ گولی ماردوں گا —“

ہم سب ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوگئے، سیاہ فام حبشی زبان کے بجائے ہاتھ کے اُلٹے سیدھے اشارے کرکے ڈاکٹر کو نہ جانے کیا سمجھانے کی کوشش کررہا تھا، ڈاکٹر حبشی کی الٹی سیدھی حرکتوں کو آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا، پھر دیوانہ وار قہقہے لگانے لگا۔ اُس نے کچھ جنگی احکام صادر کرنے شروع کردیئے۔

”بے وقوف مت بنو ڈاکٹر — ہم اس وقت میدانِ جنگ میں نہیں ہیں،“ جم پارک نے ناگوار لہجے میں ڈاکٹر کو مخاطب کیا، اُس کے لہجے میں بیزاری کا عنصر شامل تھا، جم پارک ایک جذباتی ضدی اور مغرور نوجوان تھا۔ اپنی حرکتوں سے وہ ناپسندیدہ سمجھا جانے لگا تھا، کئی بار اُس نے فلورا اور سریتا سے بے ہودگی کی کوشش کی مگر ہر بار اُسے تنبیہ کرکے خاموش کردیا گیا، جب ڈاکٹر کی حماقتیں بڑھ گئیں تو جم پارک جو خاصا چڑچڑا ہوگیا تھا، بھڑک اٹھا اور اُس نے ڈاکٹر کو بُرا بھلا کہنا شروع کردیا۔

حبشی ڈاکٹر کے بارے میں یہ الفاظ سن کر آگ بگولا ہوگیا، اُس کی آنکھیں بتدریج سُرخ ہونے لگیں، یہیں مجھے احساس ہوگیا کہ جم پارک کے دن پُورے ہوچکے ہیں — اُس نے خاموش رہ کر معاملہ رفع دفع کرنے کے بجائے آستینیں چڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم — سیاہ کتّے، اپنی زبان بند کرو، تم نے ان معصوم لوگوں کو بہت متاثر کرلیا۔ اپنی اوقات سے نہ بڑھو، تمھارے جیسے کتنے آدمی ہماری غلامی کرتے ہیں۔“

جواب میں حبشی اُچھل کر گھٹنوں کے بل کھڑا ہوگیا، لائف بوٹ پر موت کا بھیانک سکوت طاری تھا، مجھے یقین تھا کہ اب حبشی کا سحر جم پارک کو برباد کردے گا، تمام نظریں حبشی پر مرکوز تھیں، کچھ دیر تک وہ جم کو خوں خوار نظروں سے تولتا رہا پھر اس نے جُھک کر سمندر سے تھوڑا پانی چلّو میں لیا، ایک نظر آسمان پر ڈالی — اس کے بھدّے ہونٹ ہلے، کچھ پڑھ کر اس نے چلّو کے پانی پر پھونکا اور پھر جم کی طرف اُچھال دیا۔ پانی کا جم کے جسم پر گرنا تھا کہ وہ کربناک انداز میں چلاتا ہوا لوٹ لگانے لگا۔ حبشی نے ایک بار پھر یہی عمل کیا۔ جم کے جسم پر بڑے بڑے آبلے اُبھر آئے، وہ ہیبت ناک انداز میں چیخنے چلانے لگا۔ بمشکل پانچ منٹ کے اندر اندر جم کا جسم آبلوں سے بھر گیا۔ حبشی نے حقارت سے نظریں دوسری جانب کرلیں اور جب جم کا جسم ساکت ہوگیا تو وہ اٹھا، جم کی آبلہ زدہ خوفناک اور اکڑی ہوئی لاش اٹھا کر سر سے بلند کیا اور سمندر میں پھینک دیا، جس جگہ جم کی لاش گری وہاں سمندر کے اندر یوں بڑے بڑے بلبلے اُٹھنے لگے جیسے پانی میں چونے کے سیکڑوں ڈھیلے ڈال دیئے گئے ہوں۔

ہمارے چہرے خوف سے زرد پڑچکے تھے لیکن حبشی پُرسکون تھا، اُس نے الٹے سیدھے اشاروں میں ڈاکٹر سے دوبارہ کچھ گفتگو شروع کردی تھی، مجھے اس وقت سخت تعجب ہوا جب ڈاکٹر جواد نے بھی ہاتھ کے اشاروں سے جواب دینا شروع کردیا، اس وقت ڈاکٹر کے چہرے پر گہری سنجیدگی کا تسلط تھا۔ اسی شام ہمیں اپنے ایک اور ساتھی سے ہاتھ دھونا پڑا۔

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر قبل جعفر کی حالت غیر ہونے لگی، پہلے اسے ایک لمبی قے ہوئی پھر وہ لمبا لمبا لیٹ گیا، حبشی نے اٹھ کر نبض ٹٹولی اور مایوس ہوکر گردن جھکالی جس کا مطلب یہی تھا کہ خلاصی کی رُوح اس کے جسم سے پرواز کرچکی ہے، جعفر کی لاش کو بھی سمندر کی لہروں کے حوالے کردیا گیا۔ اس صورتِ حال نے ہم سب کے چہرے فق کردیئے لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی، ہمارا مصری ساتھی جو ابھی تک خاموش تھا اچانک کچھ دیکھ کر خوشی سے چلایا۔ وہ غروبِ آفتاب کا وقت تھا۔

”وہ دیکھو۔ وہ دیکھو — وہ دیکھو سامنے خشکی کے نشان نظر آرہے ہیں، کیا میری نظریں دھوکا کھا رہی ہیں۔“

مصری تاجر نے جس سمت اشارہ کیا تھا ہم سب کی نظریں اس جانب

اُٹھ گئیں اور ہمارے چہرے خوشی سے دمک اٹھے۔ دُور ایک چٹان سر اُٹھائے ہمیں زندگی کا پیغام دے رہی تھی، اتنی مایوسیوں کے بعد زندگی کی اُمید نے ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز کر دیں، کیا واقعی وہ کوئی چٹان ہے یا محض ہمارا گمان ــ مگر لائف بوٹ بڑی تیزی سے نظر آنے والی چٹان کی طرف بڑھ رہی تھی، مجھے یقین تھا کہ رات میں کسی وقت ہم خشکی تک پہنچ جائیں گے، سیاہ فام حبشی نے جو پیش گوئی کی تھی وہ درست ثابت ہو رہی تھی، فلورا میرے اور قریب ہو گئی اور لرزتے ہوئے کہنے لگی "جابر ــ مجھے ہول اُٹھ رہا ہے، نہ جانے یہ کون سا جزیرہ ہو اور ہمارے اوپر کیا بیتے؟"

"ہمت سے کام لو فلورا۔ اس کے سوا کیا چارہ ہے۔ خوش قسمتی سے زمین نظر آئی ہے۔ یہاں کی موت لائف بوٹ کی موت سے زیادہ دردناک نہ ہوگی۔ خشکی پر پہنچنے کے بعد ممکن ہے کوئی بہتر صورت نکل آئے۔"

"خدا کرے تمھاری زبان مبارک ہو مگر جابر! افریقہ میں بے شمار ایسے جزیرے ہیں جہاں باہر کی دنیا کا کوئی فرد نہیں پہنچا۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہاں اسرار ہی اسرار ہیں، وہ لوگ ہماری مہذب دنیا سے بالکل مختلف ہیں مجھے ڈر ہے کہیں ہم ایسے کسی گمنام جزیرے پر نہ پہنچ جائیں۔ پھر ہم ان وحشیوں کی خوراک بن جائیں گے۔ ان کی عبرتناک سزائیں سُن کر ہی کلیجا دہل جاتا ہے، ان سے کسی رحم و کرم کی امید رکھنا فضول ہے، یہ بات عام ہے کہ یہ درندے اپنے علاقے میں قدم رکھنے والوں کے ساتھ بدترین سلوک کرتے ہیں، خاص طور پر عورتوں کے ساتھ ان کا رویہ بڑا ہی انسانیت سوز ہوتا ہے۔ یہاں ہر آدمی جادوگر ہے۔ خدا ہمیں ان کے عذاب سے دُور کرے۔"

"مگر فلورا ــ لائف بوٹ میں غذا اور پانی نہیں ہے۔ اس جزیرے پر اُترنے کے سوا کوئی اور راستہ بھی تو نہیں، حوصلے سے کام لو۔ مقابلہ کریں گے ــ لڑ کر مر جائیں گے۔"

میری بات سُن کر فلورا کے چہرے پر پھیکی پھیکی مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"پتہ نہیں، اب کیا ہو جابر۔ تم مجھے اپنے ساتھ ہی رکھنا اور اگر یہ لوگ میرے ساتھ زیادتی کریں تو میرا گلا گھونٹ دینا۔"

"تمھیں مجھ سے کوئی چھین سکتا ہے میری جان؟" میں نے اس کا بازو دبا کر کہا "بس حوصلے اور جرات کی ضرورت ہے۔"

افریقہ کے گمنام جزیروں اور وہاں کے جنگلی وحشی قبائل کے بارے میں آئے دن اخبارات و رسائل میں سنسنی خیز واقعات اور مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ میرا خود بُرا حال تھا لیکن فلورا کو مطمئن کرنے کے لیے اسے جھوٹی تسلیاں



دے رہا تھا۔ ہمارے دوسرے ساتھی جب تک اُجالا رہا آنکھیں پھاڑے اسی چٹان کی سمت دیکھتے رہے جس کی شکل آہستہ آہستہ واضح ہو رہی تھی، اس وقت ہمارے دِل بُری طرح دھڑک رہے تھے۔ خشکی پر قدم رکھنے کے خوش گوار تصور سے میرے اور فلورا کے سوا سبھی شادان و فرحاں تھے۔ مقدس جارا کا کے بارے میں، صرف میں جانتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سر نگا بھی بے چینی سے پہلو بدل رہا ہے۔

توقع کے خلاف ہم جلد ہی چٹان کے قریب پہنچ گئے، سمندری چٹان اب ہم سے بمشکل ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھی۔ جوں جوں یہ فاصلہ کم ہو رہا تھا، ہمارا اضطراب بڑھتا جاتا تھا۔ ہر شخص سب سے پہلے اُترنے کیلیے بے چین نظر آتا تھا۔ گیارہ بارہ روز کے اذیت ناک سمندری سفر کے بعد زمین قریب آ رہی تھی، لیکن یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی کہ زمین انھیں کیا دینے والی ہے ــ موت، مصائب، اذیتیں یا مسرت۔ نجات، زندگی ــ کون سی تباہی ان کی منتظر ہے اور کون سا مژدہ ان کی سماعت میں رس گھولنے والا ہے۔ سمندری چٹان ہر لمحے اپنا دائرہ وسیع کر رہی تھی، درختوں کے جھنڈ بھی اب سیاہی کی شکل میں نظر آنے لگے تھے۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا اور چاند کسی دوسری دُنیا کی سیر کر رہا تھا۔ میں نے سیاہ فام حبشی کی طرف دیکھا۔ میں دراصل اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنا چاہتا تھا، میرا خیال تھا کہ وہ اپنی ساحرانہ قوتوں کی کامیابی دیکھ کر

پھولا نہ سمارہا ہوگا لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ حبشی کے چہرے پر جہاز کے ڈوبنے کے بعد آج پہلی بار فکر مندی کے تاثرات نمایاں تھے، وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ بہت ہی سنجیدگی اور استغراق سے۔ وحشت اور پریشانی میں وہ اچانک خوفناک انداز میں چیخا۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پھر وہ پاگلوں کی طرح بال نوچنے لگا۔ ڈاکٹر نے اُسے اس عالم میں دیکھ کر ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا لیکن جلد ہی لوگ قریب نظر آنے والی چٹان کے ہیولے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"اب ہم چند لمحوں میں خشکی پر پہنچنے والے ہیں۔" میں نے حبشی کے قریب جا کر اپنی شکستہ افریقی زبان میں اسے مخاطب کیا۔ "تم نے جو کہا تھا وہ ٹھیک ثابت ہوا۔ یہودی کی آنکھوں اور دیوتاؤں کی مہربانی نے ہمیں زندگی سے قریب تر کر دیا ہے۔"

حبشی میری آواز سن کر یوں چونکا جیسے سو رہا تھا۔ اُسے میری دخل اندازی پر غصہ آگیا۔ اس کی بڑی آنکھوں سے شدید بیزاری اور مایوسی جھلک رہی تھی — "تم اندھے ہو۔" وہ جھنجلا کر بولا۔ "کل پیش آنے والے واقعات تمھاری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں، تم اس دنیا سے تعلق رکھتے ہو جہاں آدمی کے اندر کی آنکھیں بینائی سے محروم ہوتی ہیں، تم لوگ لافانی دُنیا اور لافانی قوتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کیوں کہ تم مادّے کی باتیں کرتے ہو۔ مادہ روح کے بغیر بے کار ہے۔ لیکن روح مادّے کے بغیر بھی محترم رہتی ہے۔ تمھارے یہاں روحانی بالیدگی کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ تمھارے پاس جو سب سے قیمتی شے ہے تم اس سے کام لینا نہیں جانتے — کل کیا ہونے والا ہے، تم نہیں جان سکتے — مگر تومَغا جانتا ہے۔ تومَغا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ تومَغا کے پاس اندر کی آنکھیں ہیں جاہلو۔!"

اس پُراسرار افریقی شخص کی باتوں نے میری وحشت میں اور اضافہ کر دیا، میں تو اس کے پاس اطمینانِ قلب کے لیے گیا تھا، اس نے میرے قلب کو اور پریشان کر دیا، پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نام تومَغا ہے لیکن اس وقت مجھے اس کے نام سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ کل کیا ہونے والا ہے، چنانچہ میں نے اس کے جملوں کی تلخی نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تومَغا میرے دوست۔ تم ہمارے محسن ہو۔ مجھے بتاؤ کہ خشکی پر کیا گزرنے والی ہے تم اپنی آنکھوں سے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"ہاں میں تمھیں بتاؤں گا کہ کل کیا ہونے والا ہے تم سب اندھیرے کی طرف جا رہے ہو، وہاں آتش فشاں ہے، وہاں کانٹے ہیں، وہاں خون ہی خون ہے — احمقو! تم وہاں نہ جاؤ۔ لائف بوٹ کا رُخ موڑ دو —" تومَغا نے جھلّاتے ہوئے کہا۔

"معزز تومَغا۔" میں نے جھرجھری لیتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "مجھے تمھاری ساحرانہ قوتوں پر پورا یقین ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ تم لائف بوٹ کا رُخ کسی اور قریبی جزیرے کی طرف پھیر دو۔"

تومَغا نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر اپنے موٹے بھدّے ہونٹوں کو تیزی سے حرکت دینے لگا۔ غالباً وہ کوئی ساحرانہ عمل شروع کر چکا تھا۔ اس اثنا میں میں نے بوٹ کے جملہ افراد کو ہموار کرنے کے لیے انھیں متوجہ کیا۔ "دوستو۔" میں نے زور زور سے کہا۔ "تومَغا کا خیال ہے کہ اس جزیرے پر ہمارا جانا ٹھیک نہیں۔ وہاں ہم اور مصائب میں گھر سکتے ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم راستہ بدل دیں۔"

"ہمارے پاس کھانے کو نہیں، پانی نہیں۔ دوسرا جزیرہ نہ جانے کب نظر آئے۔ کون کہہ سکتا ہے۔" ان لوگوں کی دلیل معقول تھی میں خاموش ہو گیا۔ میری ایک نہ چلی — اُدھر تومَغا اپنے عمل میں مصروف تھا۔ میں پوری توجہ سے اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا اور ہر قیمت پر تومَغا کو اس امر پر راضی کر لینا چاہتا تھا کہ وہ اپنی قوتوں کے کسی کرشمے سے لائف بوٹ کا رُخ موڑ دے لیکن افسوس قدرت ہمارے اطراف اپنا جال بُن چکی تھی، تومَغا کا عمل ادھورا رہ گیا۔ طوفانی ہواؤں کا زور اچانک بڑھ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہم سیاہی مائل دھندلکوں کی طرف تیزی سے بڑھنے لگے۔

میرے ذہن میں میرے دوست احمد بن طاہر کا وہ واقعہ اُبھر آیا جو اُس نے جہاز کا سفر ترک کرنے کی خاطر مجھے سنایا تھا۔ خوف کی لہر میری رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ میں اُٹھ کر جلدی سے فلورا کے پاس آگیا۔ میرے دُوسرے ساتھی بھی اس گھور اندھیرے میں کچھ دیکھنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔ تومَغا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اُسے آواز دی تو اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اچانک تومَغا کی ایک کریہہ چیخ سُنائی دی اور گرد کا طوفان تیز ہو گیا۔ ڈاکٹر جواد نے کربناک انداز میں چلّانا شروع کر دیا تھا۔ لائف بوٹ کے تمام مسافر ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے تھے۔ سیاہ دُھول کے بھنور نے لائف بوٹ کو ان گنت چکّر کھلائے مگر لمحوں میں قیامت خیز بھنور ختم ہو گیا اور کہیں آگے بڑھ گیا۔ مطلع جلد ہی صاف ہو چکا تھا۔ اندھیرا کم ہو گیا تھا۔ اس لیے ہم ایک دُوسرے کی شکلیں کسی قدر دیکھ سکتے تھے۔ ہم نے تومَغا کی طرف توجّہ کی تو ششدر رہ گئے۔ تومَغا لائف بوٹ پر موجود نہیں تھا۔ خدا جانے وہ سمندر میں غرق ہو گیا یا پھر سیاہ دُھول کے ذرّات اُسے اڑا لے گئے یا وہ کہیں

روپوش ہوگیا تھا۔ کوئی بات بھی ممکن تھی۔ ان پُراسرار حالات نے ہم سب کو گنگ کر دیا تھا۔ ہمارے اوپر سکتے کا عالم طاری تھا۔ فلورا مجھ سے لپٹی بُری طرح کپکپا رہی تھی۔ ہر شخص مایوس نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہا تھا۔ بوڑھے سرنگا نے سرتیا کو اپنے بازوؤں میں چھپا رکھا تھا۔ اب لائف بوٹ ہوا کے دوش اور لہروں کے زیروبم پر اُچھلتی تیزی سے جزیرے میں داخل ہو رہی تھی۔

خشکی کا وہ حصہ قریب آرہا تھا تو وہاں کا منظر واضح ہوتا جا رہا تھا۔ ہرچند کہ رات کا وقت تھا لیکن دُور بکھرے ہوئے درختوں کی قطار کو پہچاننا کچھ مشکل نہ تھا۔ تومغا کی حیرت انگیز گمشدگی نے زمین پر اُترنے کی جستجو کو دہشت میں تبدیل کر دیا تھا۔ ہمارے چہرے زرد، عقلیں گم اور آنکھیں حیرت سے واہ تھیں۔

" جابر۔ اب کیا ہونے والا ہے" فلورا کی گھٹی گھٹی آواز سنّاٹے میں ارتعاش پیدا کر گئی۔ میں نے جواب میں اُس کی پُشت تھپتھپائی میری اپنی عقل بھی خبط تھی۔ طرح طرح کے توہمات نے ذہنوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مقدس جارا کا نے تومغا کے خیالات پڑھ لیے ہوں۔ تومغا جو میری درخواست پر لائف بوٹ کا رُخ موڑنے کے لیے کوئی ساحرانہ عمل شروع کر چکا تھا۔ وہ لاعلمی میں جارا کا کے عتاب کا شکار ہو گیا۔ پھر کیا ہوا؟ تومغا کہاں گیا؟ وہ کن خطروں کی پیشگوئی کر رہا تھا۔ وہ کون سے اندھیروں کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔

لائف بوٹ کو اچانک جھٹکا لگا اور مصری تاجر خوشی سے دیوانہ وار چلّایا۔" ہم زمین پر پہنچ گئے۔ یہ خشکی ہے۔ خُدا کی قسم کتنی فرحت بخش جگہ ہے۔"

لائف بوٹ زمین پر جا کر ہچکولے کھا رہی تھی۔ فلورا میرے بازوؤں میں سمٹی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے مصری تاجر لائف بوٹ سے چھلانگ لگا کر خشکی پر کُودا۔ پھر شیخ طاہر نے پیروی کی۔ وہ دونوں گزشتہ واقعات بھُول کر خوشی سے دیوانہ وار چلّا رہے تھے اور زندگی پالینے کی خوشی میں اُچھل کود کر رہے تھے۔ میں نے فلورا کو آہستہ سے خشکی پر اُتارا۔ سرتیا نے سرنگا کو سہارا دیا۔ جب سب اُتر گئے تو میں نے لائف بوٹ کھینچ کر ساحل پر کی اور ڈاکٹر جواد کو رسّیوں کی قید سے آزاد کرنے لگا۔ رسّیاں چونکہ بھیگی ہوئی تھیں۔ اس لیے انہیں کھولنے میں بڑی دُشواری پیش آرہی تھی۔ رسّی کھُلتے ہی ڈاکٹر جواد ایک طرف بھاگنے لگا۔ میں نے اُسے بڑی مشکل سے پکڑا۔

پاگل خانے

کے ڈاکٹر کے پاس یہ شکایت پہنچی کہ پاگل مریضوں کے زیرِ اثر خود عملے کے بعض ارکان پر بھی پاگل پن کا اثر ہو چلا ہے۔ وہ حالات کا جائزہ لیتا ہوا جب ایک وارڈ میں داخل ہوا تو اُس نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ ایک پاگل کمرے کی چھت میں چھپکلی کی طرح چپکا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے لوہے کے آنکڑے پکڑ رکھے تھے اور دونوں پیر بھی آنکڑوں میں پھنسا رکھے تھے۔ نیچے نرس حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔

ڈاکٹر نے ڈانٹتے ہوئے نرس سے پوچھا۔ "یہ کیا قصّہ ہے؟ یہ چھت سے کیوں چمٹا ہوا ہے؟"

نرس نے پریشانی سے جواب دیا۔ "ڈاکٹر! یہ خود کو بجلی کا بلب سمجھتا ہے۔"

"احمق کہیں کا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اسے فوراً نیچے اُتارو۔"

نرس نے گھبرا کر جواب دیا۔ "ڈاکٹر! اسے اُتار لینے میں تو کوئی ہرج نہیں لیکن اس کے اُترتے ہی اندھیرا ہو جائے گا، پھر؟"

" خاموشی کے ساتھ آگے بڑھو۔" میں نے تحکمیہ انداز میں کہا۔ سب سے آگے میں میرے ساتھ فلورا اور اُس کے پیچھے باقی لوگ تھے۔ ڈاکٹر جواد کو خلاصی نے سنبھال رکھا تھا۔ آگے گھُپ اندھیرا تھا۔ ریتیلی زمین پر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے درختوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دُور دُور تک روشنی کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس خاموشی اور تاریکی سے اور وحشت ہونے لگی۔ اتنے دنوں بعد زمین پر قدم رکھنے کی وجہ سے ٹانگیں ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ ڈگمگاتے ہوئے جیسے ہم بہت ساری شراب پی لی ہو ہم چلتے رہے۔ درختوں کا سلسلہ قریب ہی تھا۔ اور یہ بات طے تھی کہ یہ کوئی گھنا جنگل ہے۔ جنگل میں ایسے خانماں برباد افراد کی شب بسری کا تصور ہی ہولناک تھا۔ میں نے ان سب کو متنبہ کیا کہ وہ بے حد محتاط ہو کر قدم بڑھائیں اور ہر ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے رہیں۔ جنگل کے پار ہی کسی آبادی کے ملنے کا امکان ہے اور کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ جنگل کتنی دُور تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کیڑے مکوڑوں اور درندوں کے بکثرت پائے جانے کا اندیشہ تھا۔ میرے ذہن نے اس مشکل رات اور سیاہ جنگل سے نمٹنے کے لیے

ایک رحم دل خاتون چلتے چلتے، فالج زدہ فقیر کے پاس رُک گئیں۔ اُنہیں مفلوج فقیر کی حالتِ زار پر بڑا رحم آیا پرس سے اٹھنی نکالی اور فقیر کو دیتے ہوئے بولیں۔

"تمہیں بہرحال اس بات کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ تم اندھے نہیں ہو۔ صرف اپاہج ہو اور اندھا ہونے کے مقابلے میں معذوری کی مصیبت معمولی ہے۔" فقیر نے خوش ہو کر خاتون کی رائے سے اتفاق کیا۔ کہنے لگا۔ "آپ نے بالکل بجا فرمایا۔ میرا ذاتی تجربہ بھی یہی ہے کیونکہ جب میں اندھا ہوا کرتا تھا تو لوگ مجھے کھوٹے سکے دے کر آگے بڑھ جایا کرتے تھے۔"

منصوبے بنانے شروع کر دیے۔ سکیمیں مرتب کرنے کا کام مجھے خاصا آتا ہے۔ میں نے انہیں تمام خطرات سُونگھ کر بتایا کہ رات چھوٹے درختوں کے قریب زمین پر گزاری جائے۔ اور ہم میں سے دو آدمی جاگتے رہیں۔ غذا کی تلاش صبح سویرے ہی کی جا سکتی ہے۔ وہ سب میری بات پر صاد کرتے جاتے تھے۔ مجھے اس کا شدید احساس تھا کہ سرنگا بہت دنوں سے بھوکا ہے مگر اس وقت درختوں کو چھیڑنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔

درختوں کی پہلی قطار کو ہم نے عبور کیا۔ آگے بڑھتے ہوئے ہمارے سر درختوں سے ٹکرانے لگے۔ میں نے آہستگی سے چند شاخیں توڑ کر اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں میں تھما دیں اور اُنہیں ہدایت کی کہ وہ راستہ ٹٹولتے ہوئے بہت احتیاط سے آگے بڑھیں۔ ایک دُوسرے سے بات کرنے کی کوشش نہ کریں۔ سرگوشی میں ہی کچھ پوچھیں۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی ہم سب کو اندازہ ہو گیا کہ ہمیں درختوں کے اُوپر رات بھر بیٹھے رہنا ہو گا مگر وہاں جنگلی چیونٹیوں اور چھوٹے موٹے زہریلے کیڑوں کا اور نیچے زمین پر سانپ بچھو اور درندوں کا امکان تھا۔ اس امکان کی سرتیا کی چیخ نے تائید کی۔ وہ اچانک چیخنے لگی۔ اُسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا تھا۔ میں نے فلورا کا ہاتھ چھوڑ کر سرتیا کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اُن سب کو حکم دیا۔ "دوستو! اس خطرناک جنگل میں رات گزارنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ لائف بوٹ کے قریب ہم زیادہ محفوظ طریقے سے رات گزار سکتے ہیں جہاں آتنا انتظار کیا گیا ہے وہاں اندھیرا دُور ہونے تک اور انتظار کر لیا جائے۔"

وہ سب بغیر کچھ کہے واپس ہونے لگے، اس لیے کہ یہ بہترین مشورہ تھا۔ ہم دوبارہ تھک ہار کر لائف بوٹ تک واپس آ گئے۔

میں نے ڈاکٹر کے ایک پیر سے رسّی باندھ کر اُس کا دُوسرا سِرا اپنے پیر سے باندھ لیا۔ ریتیلی زمین پر ہم نیم مُردہ حالت میں دراز ہو گئے۔ سرتیا سسک رہی تھی۔ میں نے اُس کے بازو پر اپنی قمیص باندھ دی لیکن وہ دیر تک تڑپتی اور سسکتی رہی۔ سرنگا بار بار اُسے تسلیاں دیتا رہا۔ ہمارے پاس اُس غریب کا دُکھ دُور کرنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں تھا۔ علی الصباح پو پھٹنے سے قبل سب سے پہلے میں بیدار ہُوا اور مجھ سے کچھ دیر بعد سرنگا۔ سرنگا جاگتے ہی سمندر کی طرف گیا۔ نہانے کے بعد اُس نے اپنی جیبی مُورتی نکالی اور اُس کے سامنے عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگا۔



علی الصباح ہی باقی تمام افراد بیدار ہو گئے۔ سرتیا کا ہاتھ سوج چکا تھا۔ میں نے اُسے ضبط کرنے کی تلقین کی۔ سمندر پر منہ ہاتھ دھونے کے بعد ہم پھر جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔ پرندوں کے شور غل اور جنگلی جانوروں کی آوازیں ساحل تک آ رہی تھیں۔ ہم نہتّے تھے اور بہرصورت ہمیں جنگل میں داخل ہونا تھا۔ ۷ آدمیوں کا یہ قافلہ دل میں دہشت اور نگاہوں میں خوف لیے پھر زندگی کی امید میں جنگل کی طرف بڑھنے لگا۔ مگر ابھی ہم کچھ ہی آگے بڑھے تھے کہ مصری تاجر کمال بھیانک چیخ مار کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی فلورا کی ہذیانی چیخ بھی سنائی دی۔ ہم نے کمال کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک دوسرا نیزا میرے قریب زمین پر آ کر لگا۔ میں نے فوراً ہی ہاتھ اُوپر اُٹھا دیئے۔ مصری تاجر ساحل پر چت پڑا تھا اور اُس کے سینے میں اندر تک نیزا پیوست ہو گیا تھا۔ خطرہ محسوس کر کے باقی پانچ افراد نے بھی اپنے ہاتھ اوپر اُٹھا دیئے۔ ہمارا مصری ساتھی کسی وحشی کے نیزے سے ہلاک ہو چکا تھا۔ یہ اس جزیرے کی منحوس صبح کا آغاز تھا۔

ہماری نگاہیں درختوں کی طرف تھیں۔ سامنے درختوں کے جھنڈ کی طرف کھلبلی سی ہوئی اور ہمیں اپنا خون شریانوں میں منجمد ہوتا محسوس ہوا۔ چھ سات ننگ دھڑنگ سیاہ فام وحشی ہاتھوں میں لمبے لمبے نیزے تھامے ہماری طرف نپے تلے قدم اُٹھاتے بڑھ رہے تھے۔

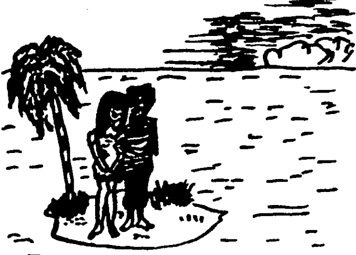
میری کیفیت اُس مسافر سے مختلف نہ تھی جس نے منزل کے قریب پہنچ کر دم توڑ دیا ہو۔ شیخ طاہر میرے پہلو میں کھڑا سر تا پا لرز رہا تھا۔ فلورا میرے قدموں کے قریب بے ہوش پڑی تھی۔ ڈاکٹر طوجا دی کی ذہنی حالت چونکہ دُرست نہ تھی اس لیے وہ موت کے پیغامبر اِن

ننگ دھڑنگ وحشیوں کا منہ چڑا رہا اور کڑوی کسیلی شکلیں بنا رہا تھا سرنگا کے تحمل میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ سرتیا کے ساتھ ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ میری اپنی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ گنگ کھڑا ان بدہیئت وحشیوں کو دیکھ رہا تھا' وہ نیزہ سنبھالے محتاط قدموں سے ہماری سمت آ رہے تھے۔ ان کے جسم پر کوئی ایسی شے نہیں تھی جس سے جسم کا کوئی حصّہ بھی چھپ سکتے۔ سیاہ جسموں پر سفید رنگوں سے آڑے ترچھے نقوش بنے ہوتے تھے۔ کانوں اور نتھنوں میں ہاتھی دانت کے بڑے بڑے بالے نظر آ رہے تھے۔ خونخوار نگاہوں سے جھلکنے والی بے رحمی میری ہر امید ختم کر رہی تھی۔

زندگی اور موت کا فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ شیخ جس انداز میں سرتاپا کانپ رہا تھا اُس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ حد درجے خائف ہے اور کسی بھی لمحے بے ہوش ہو کر گر پڑے گا۔ معاً وہ میرے پہلو سے جُدا ہو گیا اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اُس کی یہ بچکانہ حرکت ہم سب کی رہی سہی امیدوں کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ میں نے جلد ہی دبی زبان میں اُس سے کہا۔ "شیخ طاھر اپنی جگہ جمے کھڑے رہو۔ بھاگنے کی حماقت مت کرنا ورنہ ہوا میں پھینکے ہوئے نیزے ہمارے جسموں کو بھی چھید کر رکھ دیں گے۔ عقلمندی سے کام لو۔"

میری بات پر شیخ طاہر اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ جنگلیوں نے قریب پہنچ کر طاہر کو بازوؤں سے جکڑ لیا۔ پھر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے سرنگا اور سرتیا کو علیحدہ ہو جانے کا حکم دیا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ دو جنگلیوں نے جھپٹ کر مجھے بھی جکڑ لیا۔ پھر ایک نے فلورا کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر جواد کو گھسیٹا گیا۔ میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ تمام جنگلی فلورا کو دیکھ کر نظروں نظروں میں مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ البتہ جب ڈاکٹر جواد پر ان کی نظر پڑی تو ان کے چہرے نفرت سے کھنچ سے گئے۔ ڈاکٹر دیوانگی کے عالم میں خود کو ان کے شکنجے سے چھڑانے کی خاطر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور ہذیان بک رہا تھا۔ "پکڑو۔ پکڑو۔ جانے نہ پائے' لپک جھپک ہائے ابراہول۔ ٹھائیں ٹھائیں ٹھش ...."

ڈاکٹر دیوانگی کی حالت میں اناپ شناپ بکے جا رہا تھا۔ اُس کی مزاحمت نے جنگلیوں کو بھڑکا دیا۔ ایک چوڑے چکلے سینے والے جنگلی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "دم بوگا۔ ماشی لارا" (اسے مار ڈالو یہ بھاگنے



"یقین کرو، میں تمہارے سوا کسی سے محبت نہیں کرتا"

****

کی کوشش کر رہا ہے) میں نے اُس کے جملے کے اختتام کے ساتھ ہی دوسرے جنگلی کو اچھل کر نیزا سنبھالتے دیکھا۔ اُس کے ارادے خطرناک تھے نیزے کی انی سے اُس نے گھٹنوں کے بل ہلکا سا دباؤ ڈال کر عجیب انداز میں ڈاکٹر کے پیٹ کا نشانہ لیا اور آگے بڑھنے لگا۔ میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ موت بڑی تیزی کے ساتھ ڈاکٹر کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہی تھی۔ مجھے سینے میں اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا اتفاقاً میرے ذہن میں تومغا کا کہا ہوا جملہ ابھرا۔ اُس نے کہا تھا، کہ افریقی جنگلی قبائل ڈاکٹروں کو قابلِ پرستش سمجھتے ہیں اور ہر حال میں ان کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اندھیرے میں امید کی کرن نظر آتے ہی میں نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں چوڑے چکلے سینے والے جنگلی کو مخاطب کر کے کہا:

"ابی روگالا ۔ ابی روگالا" (یہ ڈاکٹر ہے۔ یہ ڈاکٹر ہے)

روگالا (ڈاکٹر) کا لفظ سنتے ہی اُس جنگلی نے اپنا نیزہ جلدی سے نیچے کر لیا جو پہلے اُسے ڈاکٹر کے پیٹ میں اُتار دینے کیلیے پر تول رہا تھا۔ چوڑے چکلے سینے والا مجھے اپنی زبان بولتا دیکھ کر چونکا۔ پھر سینہ تانے میرے نزدیک آیا اور خشک لہجے میں بولا

"تماکو چینا (تم لوگ کون ہو؟)۔

میں نے اکھڑی ہوئی سانس اور ڈوبتے دل پر قابو پا کر اسے مختصراً اپنی روداد سنا دی۔ ان لوگوں کی زبان قدرے مختلف تھی۔ تاہم میری ٹوٹی پھوٹی زبان کسی کام تو آئی۔ جارا کاکا' کا تذکرہ میں دیدہ و دانستہ نظر انداز کر گیا تھا۔ میں نے اُس کو یہ بتایا کہ ہمارا جہاز طوفان میں پھنس کر تباہ ہوا تھا جنگلی کی آنکھیں بدستور میرے چہرے پر مرکوز تھیں' یوں جیسے وہ میری

کہانی کی تصدیق کر رہا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتا، اُس کا ایک دراز قد ساتھی قریب آکر حقارت سے بولا:

"لالو آما ــــ لابوشی بورا ــــ آگورا غوغا ـ" (یہ جھوٹ بولتا ہے، یہ ہمارا دشمن ہے۔ ہم اسے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھائیں گے)

"ابیشس ـــــ" چوڑے چکلے سینے والے جنگلی نے اپنے ساتھی سے کہا پھر مجھے اور شیخ طاہر کو دیکھ کر کہا: "می گورانی لاہو آقابلا لاباپونار" (ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ آقابلا محترم و مقدس ہے)

پھر وہ دوبارہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا: "ردگالاسا بوگارا؟" (ڈاکٹر تم بھاگنے کی کوشش کیوں کی تھی؟)

"ردگالابیگا ــــ لابوشی کالی" (ڈاکٹر پاگل ہے، یہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے) میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

کچھ دیر تک میں جنگلیوں کے الٹے سیدھے سوالات کا الٹے سیدھے انداز میں جواب دیتا رہا۔ شیخ طاہر اس تمام عرصے میں مہر بلب رہا البتہ مجھے جنگلیوں سے گفتگو کرتا دیکھ کر اُس کے چہرے سے مردنی کے اثرات کسی قدر چھٹ چکے تھے۔ ڈاکٹر جواد کبھی بڑی سنجیدگی سے ہماری گفتگو سننے لگتا اور کبھی ہذیان بکنا شروع کر دیتا۔ فلورا بدستور ریت پر بیہوش پڑی تھی اور ننگ دھڑنگ جنگلی اُسے دلچسپ نظروں سے گھور رہے تھے۔

میں نے اس بات کو خاص طور پر نوٹ کیا کہ فلورا کے سلسلے میں ان کا رویہ جارحانہ نہیں تھا۔ سرنگا نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ اس لیے وہ بھی محفوظ تھا۔ ہاں سرتیا اب جنگلیوں کے نرغے میں تھی۔

مجھ سے کچھ مطمئن ہو جانے کے بعد ہمیں نیزوں کی نوک سے آگے بڑھنے کا حکم دیا گیا۔ فلورا کو چوڑے چکلے سینے والے جنگلی نے اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ فلورا، سرتیا اور ڈاکٹر جواد کی زندگیاں محفوظ ہیں۔ دورانِ گفتگو مجھے صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ ہمیں دو روز تک قید میں رکھا جائے گا۔ اس کے بعد جنگلیوں کے سردار شوالا کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ جو ہفتے میں صرف دو بار قبیلے والوں کے سامنے آتا ہے اور ضروری مسئلوں کا حل پیش کرتا ہے اور دوسرے مسائل کا فیصلہ کراتا ہے۔ مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ ان جنگلیوں کا طریقۂ زندگی کسی قدر مہذب ہے۔ میرے ذہن میں شوالا کے مختلف خاکے بنتے اور بگڑتے رہے، مگر یہ آقابلا کون ہے جس کا نام جنگلیوں نے بڑے احترام کے ساتھ لیا تھا۔

آقابلا یقیناً اُن کی کوئی پُراسرار لائقِ پرستش ہستی ہے۔ میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کے لیے اپنے ذہن میں منصوبے بناتا رہا۔ شیخ طاہر نے راستے میں ایک بار مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی لیکن پشت سے ایک جنگلی نے اُس کے شانے پر اس زور سے نیزے کا الٹا حصہ مارا کہ وہ بلبلا اُٹھا۔

کھلے میدانی حصے میں اُبھرتے سورج کی روشنی موجود تھی، درختوں کے جھنڈ سے گزرتے وقت ہمارے لیے راستہ چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ کوئی دو گھنٹے تک ہم گھنے جنگل کے درمیان سے گزرتے رہے پھر دوبارہ کھلے آسمان کے نیچے آ گئے۔ مجھے تعجب تھا کہ راستے میں ہماری ملاقات کسی دوسرے جنگلی سے نہیں ہوتی۔ اس جنگل سے گزر کر ہمیں احساس ہوا کہ گزشتہ رات یہاں سے واپس ہو کر اور ساحل پر سونے کا فیصلہ کر کے ہم نے اپنی زندگیاں بچا لی تھیں۔ اگر ہم رات یہاں گزار رہے ہوتے تو جنگلی جانور صبح تک ہمارا کام تمام کر چکے ہوتے۔ عجیب بات یہ تھی کہ جنگلیوں کی موجودگی میں کسی درندے نے اِدھر کا رُخ نہیں کیا۔ جنگلی ان مشکل راستوں پر بڑی تیزی سے چل رہے تھے۔ سرتیا کے ہاتھ کی تکلیف خاصی بڑھ چکی تھی مگر وہ باحوصلہ لڑکی آنسو چھپائے سر جھکائے خاموش خاموش چل رہی تھی۔ ایک جنگلی نے جب اُس کا سوجا ہوا ہاتھ دیکھا تو مجھ سے اس کا سبب معلوم کیا۔ میں نے رات کا سارا واقعہ اُسے بتا دیا۔ اُس نے میری بات سن کر ایک قہقہہ لگایا۔ اس قہقہے کی کوئی تک نہیں تھی۔ میں نے بھی چہرے پر مسکراہٹ لا کر اُس کا ساتھ دیا جس پر اس کی آنکھوں سے غصہ مترشح ہونے لگا پھر مجھے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے ہی بنی اور یہی بات سمجھ میں آئی کہ کسی ردعمل کا اظہار کیے بغیر چپ چاپ ان کے ساتھ چلتے رہنا بہتر ہے۔ جنگلی ہمیں ساتھ لیے ایک بڑے درخت کی طرف بڑھے۔ اس درخت کے تنے میں ایک بہت بدصورت بوڑھا جنگلی آرام کر رہا تھا۔ اُس کے پاس جڑی بوٹیاں اور عجیب و غریب قسم کے پتھر کے اوزار تھے۔ جنگلیوں نے اُس سے سرتیا کا احوال کہا پہلے تو وہ ہمیں حیران کن نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر اُس نے سرتیا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر خود ایک پھونک ماری اور زمین سے اپنا عصا اُٹھا کر ہاتھ کے متاثرہ حصے پر تیزی سے پھیر دیا۔ چشم زدن میں اُس کی سوجن کم ہو گئی۔ سرتیا کی آنکھیں پھٹ گئیں، اُس کی ساری تکلیف رفع ہو چکی تھی، بوڑھے سرنگا نے اس عمل پر کسی تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ یہ ابتدا تھی میں یہ معجزانہ علاج دیکھ کر اس جزیرے سے اور خوفزدہ ہو گیا۔

کھلے میدان کو عبور کرنے کے بعد ہمیں ایک مختصر مگر دشوار گزار چٹان سے گزرنا پڑا۔ اس کے بعد ہمیں ایک جھونپڑی میں لے جا کر بند کر دیا گیا، جو بانسوں اور سرکیوں سے بنائی گئی تھی، اس جگہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دس بارہ جھونپڑیاں اور بنی ہوئی تھیں، جھونپڑی میں دھکیل کر باہر سے دروازہ بند کر دیا گیا۔ چوڑے چکلے سینے والے جنگلی نے مجھے سختی سے تاکید کی کہ اگر تم نے بلا اجازت باہر نکلنے یا فرار ہونے کی کوشش کی تو نتائج کی ذمہ داری تمہارے اوپر ہوگی، ڈاکٹر کو وہ اپنے ساتھ دوسری جھونپڑی میں لے گئے۔ البتہ فلورا کو ہمارے ساتھ ہی چھوڑ دیا گیا۔ مجھے اس فراخدلی کی مطلق توقع نہیں تھی، جھونپڑی کے دروازے کو باہر سے بند کرنے کے بعد چوڑے چکلے سینے والے کی آواز پھر مجھے سنائی دی اُس نے اپنے تین ساتھیوں سے ہماری نگرانی کرنے کی سختی سے تاکید کی تھی۔

جھونپڑی میں پہنچ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ فلورا ابھی تک بے ہوش تھی میرے دل میں ہلچل مچی ہوئی تھی ہم بُری طرح گھر چکے تھے جنگلیوں کے باہر چلے جانے کے بعد میں نے دروازے کے قریب جا کر جھری سے باہر جھانکا۔ دروازے پر تین جنگلی نگراں تعینات تھے، میں نے جھونپڑی کا جائزہ لیا۔ اس کی پیمائش بمشکل دس مربع فٹ رہی ہوگی، نکاسی کے لیے محض وہی راستہ تھا جس کے باہر تین بدصورت جنگلی پہرا دے رہے تھے فرش پر خشک گھاس بچھی ہوئی تھی جس پر فلورا بے سُدھ پڑی تھی، شیخ طاہر سہما ہوا ایک طرف نڈھال بیٹھا تھا، سر نگا اور سرتیا بھی ایک کونے میں گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے تھے، میں نے سب سے پہلے فلورا کی خبر لی، نبض کی رفتار تسلی بخش تھی، میں اسے ہوش میں لانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا کہ سر نگا میرے پاس آیا اور پہلی بار مخاطب ہوا۔ اُس کے لہجے میں بڑا دبدبہ تھا وہ کہنے لگا۔ "جابر۔ تم دروازے پر جا کر ان جنگلیوں سے کہو کہ وہ ہمیں کچھ کھانے کو دیں، میں لڑکی کو ہوش میں لاتا ہوں۔"

بھوک سے ہم سب کا بُرا حال تھا۔ میں ہمت کر کے دروازے کے پاس گیا اور زوردار آواز میں ایک جنگلی کو مخاطب کیا۔ میں نے جھری سے دیکھا کہ وہ میری آواز کی طرف لپکا ہے، جب وہ برق رفتاری کے ساتھ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو میں نے اُس سے ادب کے ساتھ کچھ غذا لانے کو کہا۔ وہ کوئی جواب دیئے بغیر میری بات سُن کر چلا گیا اور میں نورا کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

سر نگا نے اُس کے جسم کے چند ایسے حصّوں پر مالش شروع کر دی



جب تک کوئی بستر خالی نہ ہو جائے از راہ کرم یہیں انتظار کیجیے۔

تھی کہ وہ کسمسانے لگی آنکھیں کھول کر اُس نے جھونپڑی کو حیرت سے دیکھا اور کچھ سمجھتے کچھ نہ سمجھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "ہم کہاں ہیں؟"

میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ہم خیریت سے ہیں۔ یہ جنگلی لوگ تو بڑے مہذب ہیں فلورا۔"

"جابر! کیا وہ درندے چلے گئے؟" فلورا کی گھٹی گھٹی آواز ابھری۔

"ہاں۔ وہ تو کبھی کے چلے گئے، اب ہم دوسری جگہ ہیں تم تو بہت باحوصلہ لڑکی تھیں، یہ دیکھو سر نگا ہمارے پاس ہیں، وہ سامنے سرتیا بیٹھی ہے، سر نگا تمہیں ہوش میں لائے ہیں" میں نے بچوں کی طرح اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں جابر نہیں۔" فلورا بے اختیار میرے سینے سے لپٹ کر سسکتی ہوئی بولی۔ "ہم مصیبت میں گھر گئے ہیں۔"

میں اُسے اپنے طور پر سمجھاتا رہا لیکن خوف اُس کے دل میں بیٹھ گیا تھا، تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا اور جنگلیوں نے وحشیانہ انداز میں پھل اور نیم پکا گوشت ہماری طرف پھینک دیا۔ ہم سب اُس پر کتّوں کی طرح جھپٹ پڑے، پھلوں اور گوشت کی مقدار کم نہیں تھی لیکن ہم میں سے ہر شخص اپنے لیے زیادہ حصہ وقف کرنا چاہتا تھا۔ فلورا بھی تمام خطروں سے بے نیاز ہو کر کھانے پر جھپٹ پڑی۔

جب ہم خوب سیر ہو کر کھا چکے تو جنگلیوں نے ہمیں پانی فراہم کیا۔ اتنے دنوں بعد یہ مقوی غذا کھا کر نشہ طاری ہونے لگا تھا۔ نرم گھاس کا فرش نرم و لطیف ہوا۔ جلد ہی غنودگی ہم پر غالب آ گئی سر نگا سب سے پہلے سویا پھر شیخ طاہر اور سرتیا۔ میں اور فلورا جاگتے رہے۔ فلوران

سب کی موجودگی کے باوجود میرے بہت قریب آ کر دراز ہو گئی اور میں نے اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اتنے دنوں کی اذیت کے بعد طبیعت میں کچھ ترنگ سی محسوس ہوتی تھی فلورا میرے سینے سے لگ کر اُس میں گم ہوتی جاتی تھی، ایک بار پھر اُسے اختلاج ہوا۔ وہ سسک سسک کر کہنے لگی "جابر تم ان جنگلیوں کے رسم و رواج سے واقف نہیں ہو سفید فام عورت کے معاملے میں یہ بڑے ندیدے اور درندے ہوتے ہیں ایسی زندگی سے موت بہتر ہے، تم مجھے اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ کر مار ڈالو، میں تمہاری شکر گزار رہوں گی۔"

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو فلورا!" میں نے اُسے چمکارتے ہوئے کہا۔

"نہیں جابر، ہر لمحہ جو گزر رہا ہے مجھے خطرے کا احساس دلا رہا ہے تم میری بڑی تمنا رکھتے تھے، قسمت نے ہمیں کس قدر قریب کر دیا ہے کاش میں تمہیں بیروت میں ملتی۔ اب آؤ۔ مجھے خوب جی بھر کے پیار کر لو پتہ نہیں پھر میں تمہیں مل سکوں یا نہیں، مجھے اپنی بانہوں میں خوب زور سے سمیٹ لو۔"

فلورا بڑی دل شکن باتیں کر رہی تھی، اُس کا جسمانی لمس میرے خون کو حدت بخش رہا تھا، پہلی بار وہ خوف کے تحت سہی لیکن بڑے بھرپور انداز میں مجھ سے ہم آغوش تھی۔ میں نے ایک نظر جھونپڑی پر ڈالی وہ سب سو رہے تھے خطرات کو بالائے طاق رکھ کر میں نے اسے اپنے اور قریب کر لیا، میں نے اُس کے لبوں پر اپنی محبت اور دیوانگی کی مہر ثبت کی، اُس کے شیریں، نرم ہونٹ مجھے ایک نئی توانائی کا احساس دلا رہے تھے، میں محبت سے اُس کے رخسار سہلانے لگا۔ "پگلی" میں نے کہا۔ "ہم یہاں سے ضرور آزاد ہو جائیں گے۔ میں اب بھی مایوس نہیں ہوں، میں تمہارے ساتھ ہوں پھر تم اتنی ہراساں کیوں ہو۔"

فلورا کا خوف کم نہیں ہوا۔ وہ مایوس کن باتیں کرتی رہی محبت کی سرگرمی اور میرے اظہار کی گرمجوشی بھی اُس کی دہشت کم نہ کر سکی، اس وقت فلورا۔ وہ فلورا جس کے سبب مجھے یہ دن نصیب ہوا تھا اور جس کی مجھے بڑی طلب تھی، میری آغوش میں پڑی تھی، میں چاہتا تو دل کی تمام حسرتیں آج نکال لیتا، لیکن عشق مصلحت میں نہیں ہوتا۔ اُس میں حلاوت، رحم، ایثار اور نرمی ہوتی ہے، ایسے عالم میں فلورا سے شدید قربت کے عمل کا مطلب تھا کہ میں کل سے مایوس ہو گیا ہوں، میں نے اُسے خود سے علیحدہ کیا۔ آخری بار اُس کے رخسار اور پیشانی کو بوسہ دیا اور اسے آرام کی تلقین کی۔

ہم دونوں جلد سو گئے۔ کب سوئے، اس کا علم نہیں، بس باتیں کرتے کرتے سو گئے۔

ڈاکٹر جواد کے ہذیانی قہقہوں کی آواز نے مجھے جگا دیا جو کسی قریبی جھونپڑے میں مقید تھا۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی، اس وقت دن کے تین کا عمل تھا، میری کمر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ کروٹ بدل کر میں دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی غنودگی کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا تھا کہ باہر سے کسی جنگلی کی آواز ابھری وہ اپنے کسی ساتھی سے مخاطب تھا۔

"شوالا اسے لے گیا۔ اس نے کالاری کی بات مان کر اچھا نہیں کیا، مقدس آقا بلا سے مشورہ کئے بغیر شوالا اسے لے گیا۔"

"اگر مقدس آقا بلا ناراض ہو گئی تو اُس کا سحر اسے تباہ کر دے گا۔ اور اگر کالاری نے شوالا کو روکنے کی کوشش کی تو شوالا اُسے ختم کر دے گا۔"

"مقدس آقا بلا محترم ہے، وہ عظیم ہے، وہ شوالا کو معاف نہیں کرے گی۔ وہ موت کو اشارہ کر کے اُسے ختم کر دے گی۔"

"مگر اس سے پہلے شوالا اس خوبصورت لڑکی کی نرم ہڈیوں کا سارا گودا چوس چکا ہو گا۔" دوسرے نے کہا۔ "تم نے دیکھا شوالا کس خاموشی سے اُسے اٹھا لے گیا ہے، کالاری تو کیا۔ لڑکی کے ساتھیوں تک کو خبر نہ ہو سکی۔"

"آہستہ بولو۔ ہمیں خود زبان نہیں کھولنی چاہیئے، آقا بلا کے کان بڑے ہیں، شوالا بھی دور بیٹھا ہماری باتیں سننے پر قادر ہے۔ لڑکی کا ساتھی بھی ہماری زبان سمجھ سکتا ہے، ہو سکتا ہے وہ جاگ رہا ہو۔"

اب نیند کا کیا سوال تھا۔ میں نے تیزی سے پلٹ کر گھاس پھوس کو ٹٹولا۔ سب وہاں موجود تھے۔ لیکن فلورا۔ ؟

●

جابر بن یوسف الباقر پر آگے کیا گزری؟ تجسس، تحیر، ہولناک اور پُراسرار واقعات پر مشتمل اس آپ بیتی کا سلسلہ جاری ہے۔ باقی سرگزشت آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمایئے۔

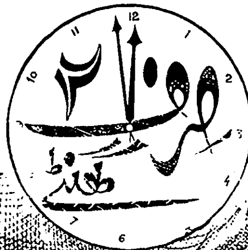
ایک دلچسپ اور خوبصورت کہانی

جسے دُنیا کے مشہور ادیب رابرٹ لوئی اسٹیونسن نے لکھا ہے

مینو یاسمن قتبا

پورے شہر میں انگریز اور فرانسیسی فوجی پھیلے ہوئے تھے۔ دو مختلف کمانڈروں کی موجودگی نے کچھ بدنظمی پیدا کر دی تھی۔ اس لیے رات کے وقت اس طرح تنہا نکلنا خطرناک تھا۔ مگر ڈینس کوئی پروا کیے بغیر ٹہلنے کے لیے نکل کھڑا ہُوا۔

موسم بہت سرد تھا۔ اکثر مکانوں کی کھڑکیاں بند مگر روشن تھیں، فوج کے لوگ کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں آگ کے گرد بیٹھے ہوئے ہاتھ تاپ رہے تھے اور دلچسپ باتیں کرتے ہوئے زوردار قہقہے لگا رہے تھے۔ ڈینس بچتا بچاتا اپنے دوست کے مکان تک پہنچ گیا۔ وہ یہاں صرف کچھ دیر بیٹھنے کے ارادے سے آیا تھا۔ مگر دوست کے بے حد اصرار پر وہ کچھ اور رُک گیا اور جب اُسے جانے کا ہوش آیا تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ باہر ہوا کچھ اور تیز ہو گئی تھی، ڈینس نے کوٹ کے کالر کھڑے کیے اور تیز تیز قدموں سے سرائے کی طرف بڑھنے لگا۔ آسمان سیاہ ہو رہا تھا۔ ہر طرف گھُپ اندھیرا تھا۔ بہت جلد ڈینس نے محسوس کیا کہ وہ راستے سے بھٹک گیا ہے اُسے صرف ایک ہی چیز کا اندازہ تھا کہ اُسے اُوپر کی طرف جانا ہے



رابرٹ لوئی اسٹیونسن ۱۳ نومبر ۱۸۵۰ء میں بمقام اسکاٹ لینڈ پیدا ہوئے۔ ۲۳ سال کی عمر میں دِق کا شکار ہوئے۔ اس بیماری نے اُنہیں کہیں چین نہ لینے دیا اور وہ صحّت افزا جگہوں کی تلاش میں اِدھر سے اُدھر سرگرداں رہے۔ اُسی زمانے میں اُنہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ اُن کے ناول 'ٹریژر آئی لینڈ' کو عالمی ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔
اُن کی تحریروں میں ایسا تجسّس ہوتا ہے جو اپنے قاری کو 'انجام کی جستجو' میں کہانی یا ناول کے انجام تک لیے چلتا جاتا ہے اور یہ تحریریں ہر عمر کے لوگوں میں یکساں مقبول رہی ہیں

کیونکہ اُس کے دوست کا مکان ڈھلان کی طرف تھا۔
بہت دیر تک وہ ایک تنگ و تاریک گلی میں چلتا رہا آگے بڑھ کر گلی کچھ کشادہ ہوگئی تھی مگر راستہ نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ ڈینس کو یقین ہوگیا کہ وہ بھٹک گیا ہے اور سرائے سے دُور ہوتا جا رہا ہے۔ اندھیرے کے باوجود اچانک ایک بڑی سی دیوہیکل عمارت پر اُس کی نظر پڑی۔ بادل کچھ کچھ چھٹ گئے تھے۔ تاروں کی مدھم روشنی میں اُس نے دیکھا کہ یہ عمارت کسی کلیسا کے مانند ہے۔ اُسے راستہ کچھ نامانوس سا محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ وہ وہاں سے لوٹ کر دوبارہ اُوپر کی طرف جانے لگا۔ مگر ابھی مشکل سے سو قدم گیا ہوگا کہ اسی تنگ گلی میں مخالف سمت سے چند لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ لوگ اسی کی طرف آرہے تھے۔ ڈینس نے دم سادھ لیا اور کمال پھرتی سے پلٹا ہی تھا کہ اُس کا پیر پھسلا اور پکّی اینٹوں سے بنی ہوئی سڑک پر گرنے کی وجہ سے اُس کی تلوار نے آواز پیدا کی۔
کون ہے؟
دو تین آوازوں نے بیک وقت انگریزی اور فرانسیسی زبان میں پوچھا۔ ڈینس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اُٹھ کر دیوانہ وار مخالف سمت میں بھاگنے لگا۔ لوگ اُس کے پیچھے دوڑنے لگے۔ بڑی کوٹھی کے قریب پہنچتے ہی ڈینس کو خیال آیا کہ کیوں نہ اس میں چھپ جائے۔ وہ ایک تاریک گوشے میں جا کر کھڑا ہوگیا۔ وہ لوگ بھی ادھر آنکلے۔ ڈینس نے تلوار تو ہاتھ میں لے لی۔ پھر بھی وہ کسی لڑائی میں اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کچھ اور پیچھے ہٹا۔ اس کی پیٹھ کسی دروازے سے لگی اور بوجھ پڑتے ہی دروازہ کھُل گیا۔ اندر بہت اندھیرا تھا۔ ڈینس نے کسی جھجھک کے بغیر اندر قدم رکھ کر دروازہ بند کر لیا۔ باہر کچھ دیر تک جوتوں کی آہٹیں سُنائی دیتی رہیں۔ آخر وہ لوگ تھک ہار کر لوٹ گئے۔
ڈینس نے اطمینان کا سانس لیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے جانے کے ارادے سے دروازہ کھولنا چاہا لیکن ٹٹولنے پر اُسے کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے دروازہ کھل سکتا۔ اس نے بہت کوشش کی مگر دروازہ ہِلا تک نہیں۔ ڈینس کو اچانک ایک انجانے خوف نے گھیر لیا۔
دروازہ پہلے کس طرح کھُل گیا تھا؟ کھُلا تو نہیں چھوڑ دیا گیا تھا؟ مگر ان حالات میں کون دروازہ کھُلا چھوڑ سکتا ہے؟ ڈینس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اُس نے کان لگا کر کوئی آہٹ یا آواز سننے کی کوشش کی۔ پُورے مکان پر سنّاٹا طاری تھا مگر نہ جانے کیوں ڈینس کو اپنے اردگرد سانسوں کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ جیسے کچھ لوگ اندھیرے میں اُس کے بہت قریب کھڑے ہوئے ہوں۔ غیر شعوری طور پر اُس نے خود کو مدافعت کے لیے تیار کر لیا۔ جب اُس کی آنکھیں اس اجنبی مقام سے کچھ مانوس ہوگئیں تو اُسے مکان کے اندرونی حصّے میں مدھم سی روشنی دکھائی دی۔
ڈینس کی جان میں جان آئی۔ اُس نے قدم آگے بڑھایا تو محسوس ہوا کہ وہاں سیڑھیاں تھیں۔ اُس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی اس نے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ یہ خیال آتے ہی کہ وہ وہاں تنہا نہیں ہے اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز تر ہوگئیں۔ سیڑھیاں ختم ہوئیں تو اس نے خود کو ایک بہت بڑے کمرے میں پایا جس کے تینوں

طرف بڑے بڑے دروازوں پر دبیز مخمل کے سُرخ پردے پڑے ہوئے
تھے۔ کمرے کی آرائش و زیبائش سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی رئیس آدمی
کی قیام گاہ ہے۔ چوتھی دیوار پر دو بڑی بڑی کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔
کمرے میں ایک بڑی سی میز اور دو کرسیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا
آتشدان کے قریب بڑی کرسی پر ایک بوڑھا کسی گہری
سوچ میں مستغرق بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے اپنی ٹھوڑی ہاتھوں پر ٹکا
رکھی تھی اور ٹکٹکی باندھے ڈینس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ڈینس نے اُس
کے چہرے مہرے سے اندازہ لگایا کہ یہ بوڑھا ایک سخت دل اور بےرحم
شخص ہے۔ اُس کا اُوپری ہونٹ اس طرح سُوجا ہوا تھا جیسے اُس
کے دانتوں میں تکلیف ہو۔ اُس کے بال چاندی کی طرح سفید ہو
رہے تھے۔ وہ کوئی پُراسرار شخص نظر آ رہا تھا۔ چند لمحوں تک وہ ایک
دوسرے کو اسی طرح دیکھتے رہے۔

"آؤ، آؤ۔ میں تو بہت دیر سے تمھارا منتظر ہُوں!" بوڑھے نے
وہیں بیٹھے بیٹھے مسکراتے ہوئے اُسے خوش آمدید کہا۔ بوڑھے کی معنی خیز
مسکراہٹ دیکھ کر ڈینس کے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اُس نے
اپنے جھنپے کی حالت میں بمشکل تمام یہ کہا۔ "مجھے اندیشہ ہے کہ یہ صورتحال
محض دُہرے حادثے کی وجہ سے ممکن ہُوئی ہے۔" ——— "جناب
والا میں وہ شخص نہیں ہُوں جس کے آپ منتظر ہیں وہ کوئی اور شخص ہوگا
جہاں تک میرا تعلق ہے میں اپنی مرضی اور خواہش سے یہاں نہیں آیا ہُوں
مگر اس دخل اندازی پر معذرت خواہ ہُوں۔"

"خیر، خیر۔" بوڑھے نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"پہلے بیٹھ تو جاؤ، یہی بات تو اصل نکتہ ہے میرے عزیز۔ بعد میں دوسرے
معاملات بھی دیکھ لیے جائیں گے۔"

ڈینس کو صورتحال کے اُلجھنے کا احساس ہُوا۔ اُس نے بُوڑھے
کی غلط فہمی دُور کرنے کے لیے مختلف تجویزیں سوچیں۔ "وہ آپ کا دروازہ"
اُس نے کہنا چاہا۔

"ہمارا دروازہ؟" بوڑھے نے قطع کلام کیا۔ "وہ تو کسی ذہین
کاریگر کی مہارت کا نمونہ ہے۔ اسی بات سے اندازہ کر لو تم یہاں کسی
سے ملنے کے لیے نہیں آئے تھے ہم جیسے بوڑھوں کو اکثر اس طرح
کی ہچکچاہٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مگر سوال جب ہماری عزّت اور وقار
کا ہوتا ہے تو پھر ہم اس سے نمٹنے کے لیے کوئی ممکن ذریعہ استعمال کرنے
سے گریز نہیں کرتے، تم بلاشبہ بے بُلائے آ گئے ہو مگر بہرحال تمھاری آمد
ہمارے لیے خوشی کا باعث ہے۔"

"جناب آپ اب بھی غلطی پر ہیں۔" ڈینس نے وضاحت کی
"مَیں اس علاقے میں اجنبی ہُوں میرا نام ڈینس ہے۔ اس وقت اتفاق
سے آپ مجھے اپنے گھر پر دیکھ رہے ہیں اور اس کی وجہ محض یہ ہے کہ"

"میرے نوجوان دوست۔" بوڑھے نے دوبارہ اس کی بات کاٹ
دی "تو تم مجھے اس بات کی اجازت دو کہ میں اس معاملے میں اپنی رائے خود
قائم کروں ممکن ہے اس وقت میری اور تمھاری رائے میں اختلاف ہو
مگر بہرحال وقت ثابت کر دے گا کہ کون غلطی پر تھا۔"

ڈینس کو یقین ہونے لگا کہ کسی پاگل سے اُس کا واسطہ پڑ گیا ہے
اُس نے لاچاری سے شانے اُچکائے اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس دوران
بوڑھے نے ڈینس کا سر سے لے کر پاؤں تک جائزہ لیا۔ ڈینس نے بڑی
بےچینی محسوس کی اور خاموشی توڑنے کے لیے خواہ مخواہ بولا "ہوا کچھ
تھم چکی ہے۔"

بوڑھے نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ڈینس سے برداشت نہ
ہو سکا اور وہ غصّے سے اٹھ کھڑا ہُوا۔ "جناب اگر آپ اس وقت مذاق
کے موڈ میں ہیں تو میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ اور اگر آپ
واقعی سنجیدہ ہیں تو خدارا مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس پاگل خانے سے
چلا جاؤں۔ میرا ضمیر صاف ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہُوئی ہے۔ اور سُنیے
آپ مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ آپ میری وضاحت سننے پر تیار ہی
نہیں ہیں۔ میں اب یہاں مزید نہیں رک سکتا اور نہ ہی کوئی طاقت مجھے
روک سکتی ہے۔ اگر مجھے یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی بہتر اور مہذب
ذریعہ نہیں بتایا گیا تو پھر میں اپنی تلوار سے دروازے کے پُرزے پُرزے
کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

"پیارے بھتیجے، بیٹھ جاؤ!" بوڑھے نے کہا۔

"بھتیجا؟" ڈینس چلایا "واقعی آپ سنگدلی کی حد تک
مذاق کرنے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔ اس ماحول میں میرا دم گھٹ
رہا ہے۔"

"کیا مصیبت ہے، بیٹھ جاؤ... مصیبت!" بوڑھے نے بھی
لہجہ بدلا "کیا تمھارے خیال سے اس عُمر میں اور طویل تجربے کے بعد بھی
میں ادھورے انتظامات کرنے کی حماقت کروں گا۔ اگر تم یہ چاہتے ہو
کہ تمھارے ہاتھ اور پاؤں رسّیوں سے جکڑ دیے جائیں تو پھر بے شک
تم جانے کی کوشش کر کے دیکھ لو۔ ورنہ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک

آزاد نوجوان کی طرح بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرو۔"

"گویا میں یہاں قیدی ہوں؟"

"میں سچ بولنے کا عادی ہوں،" بوڑھے نے لاتعلقی سے کہا۔ "ویسے تم جو رائے چاہو، قائم کر سکتے ہو۔"

ڈینس دوبارہ بیٹھ گیا۔ رفتہ رفتہ اس عجیب بوڑھے کے ذہنی توازن کے بارے میں اُس کے شکوک رفع ہوتے جا رہے تھے... لیکن اگر بوڑھا صحیح الدماغ تھا تو پھر اُس نے مجھے کیوں روک رکھا ہے؟ ڈینس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

ڈینس انھی خیالات میں گم تھا کہ کمرے کا ایک پردہ ہلا اور وہاں سے کوئی پادری اندر داخل ہوا۔ اُس نے ترچھی نظروں سے ڈینس کی طرف دیکھا اور پھر بوڑھے کے قریب جا کر اُس کے کان میں کچھ سرگوشی کی۔

"اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"کل کی نسبت بہتر ہے جناب!" پادری نے مہذب لہجے میں جواب دیا۔

"خدا اُس کی مدد کرے، پتہ نہیں اُس کے دماغ میں یہ کیا سما گیا ہے!" بوڑھے نے حسرت سے کہا۔

"ایک نوجوان لڑکی کے لیے یہ حالات بڑی پیچیدگی کا سبب بن جاتے ہیں۔"

"اُس نے یہ کھیل شروع کرنے سے پہلے سوچا ہوتا تو بہتر تھا۔ اب اسے اپنے انجام تک پہنچنا ہی پڑے گا۔" یہ کہہ کر بوڑھا اپنی جگہ سے اٹھا اور ڈینس کی طرف متوجہ ہوا۔ "آؤ میں تمھارا تعارف اپنی عزیز بھتیجی سے کراؤں۔ وہ غالباً مجھ سے بھی زیادہ شدت سے تمھاری منتظر ہے۔"

ڈینس نے کوئی احتجاج نہیں کیا کیونکہ وہ خود بھی جلد از جلد یہ معمّہ سمجھ لینا چاہتا تھا۔ پادری نے بڑھ کر پردہ ہٹایا اور بوڑھا اندر کی طرف جانے لگا۔ ڈینس بھی اُس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ وہ تینوں ایک ہال میں داخل ہوئے جو سجاوٹ میں اپنی مثال آپ تھا۔ ہال کے ایک کونے میں صلیب اور قربان گاہ بنی ہوئی تھی۔ ڈینس سمجھ گیا کہ یہ کلیسا کی مرکزی عبادت گاہ ہے... صلیب کے آگے ایک نوجوان لڑکی ہاتھ باندھے ادب سے سر جھکائے کھڑی تھی۔ اُس کا لباس دیکھتے ہی ڈینس پر بجلی سی گر پڑی۔ وہ بار بار ایک خیال اپنے ذہن سے جھٹک دینے کی کوشش کرنے لگا جو لڑکی کا لباس دیکھ کر اُس کے ذہن میں پیدا ہو گیا تھا۔

"بلانکے، میری بچی!" بوڑھے نے کہا۔ "دیکھو میں ایک دوست کو تم سے ملانے کے لیے لایا ہوں۔ مُڑ کر ان سے مصافحہ کرو، ایسے موقعوں پر شرم و حیا ضروری ہے، مگر ہاتھ نہ ملانا بدتہذیبی میں شمار کیا جاتا ہے۔"

لڑکی اٹھی اور نظریں نیچی کیے ہوئے نووارد کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کی ہر ادا سے شرم و حیا ٹپک رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ان لوگوں تک پہنچی اور بمشکل تمام نظریں اوپر اٹھائیں پھر دفعتہً ٹھٹھک کر رہ گئی۔ نووارد سے نظریں چار ہوتے ہی اُس کے چہرے پر شرم کے بجائے خوف کے آثار نمایاں ہو گئے۔ رخساروں کی سُرخی اچانک زردی میں بدل گئی۔ وہ اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ منہ تک لے گئی اور زور سے چیخ مارتی ہوئی دھڑام سے فرش پر گر پڑی "یہ وہ آدمی نہیں ہے۔"

"بالکل نہیں ہے، مجھے تو پہلے ہی اس بات کی توقع تھی۔" بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ کتنی بڑی بدقسمتی ہے کہ تمھیں اس کا نام بھی یاد نہیں رہا۔"

"واقعی!" لڑکی نے احتجاج کیا۔ "میں نے اس سے پہلے کبھی اس شخص کو نہیں دیکھا، میں اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔"

بوڑھا مشکوک نظروں سے دونوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔

"اگر تم ایک مہذب انسان ہو تو خدا کے لیے میری بات کی تصدیق کرو۔" لڑکی ڈینس سے مخاطب ہوئی۔ "کیا میں آج سے پہلے کبھی تم سے ملی ہوں؟"

"نہیں، مجھے اس سے قبل کبھی یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا۔" ڈینس

نے جواب دیا۔ پھر بوڑھے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "جناب یقین کیجیے، میں آپ کی بھتیجی سے آج پہلی بار مل رہا ہوں۔"

"مجھے یہ سُن کر بہت افسوس ہُوا۔" بوڑھے نے شانے اُچکائے، "بہرحال اب مل لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، خود میں بھی شادی سے پہلے اپنی مرحومہ بیگم کے متعلق بہت کم جانتا تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس طرح کی شادیوں کے نتائج بھی بعض اوقات بہت اچھے نکلتے ہیں۔" پھر وہ رُک گیا اور کچھ سوچ کر بولا "چونکہ اس معاملے میں دُولھا کو بھی بولنے اور سوچنے کا مکمل اختیار ہونا چاہیے۔ اس لیے میں نوجوان کو ضروری رسوم سے قبل پُورے دو گھنٹے کی مُہلت دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مُڑا۔ لڑکی نے بڑھ کر اُس کے پاؤں پکڑ لیے اور اسے روکنے کی کوشش کی۔

"محترم چچا، یقیناً آپ مذاق کر رہے ہیں؟" اُس نے منّت کی "میں قسم کھاتی ہوں کہ اگر میرے ساتھ کوئی زبردستی کی گئی تو میں خودکشی کرنے سے بھی نہیں ہچکچاؤں گی۔ خدا نے اس قسم کی شادیوں کی ممانعت کی ہے، آپ اپنے سفید بالوں کا تو کچھ خیال کریں، خدا کے لیے کچھ رحم کیجیے۔ کیا آپ اب بھی یہی سمجھ رہے ہیں کہ یہ نوجوان ..... وہی ..... وہی شخص ہے!"

"بے شک! میں یہی سمجھ رہا ہوں۔" بوڑھے نے رُک کر کہا "لیکن بلانکے بہتر ہے کہ اس پورے معاملے میں تم میری رائے سُن لو۔ جب تمھارے سر میں اس گھر کی عزّت کو داؤ پر لگانے کا سودا سما گیا ہے تو پھر تم کسی رعایت کی توقع کیوں کرتی ہو۔ اب تم سے ہر رعایت کا حق چھن گیا ہے۔ تمھیں تو یہ حق بھی نہیں پہنچتا کہ تم مجھ سے آنکھیں ملا کر بات کرو یا کوئی استفسار کرو۔ اگر تمھارا باپ زندہ ہوتا تو منہ پر تھوک کر تمھیں گھر سے نکال دیتا۔ تمھیں تو خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے تمھارا معاملہ کسی آہنی ہاتھ کے بجائے میرے مخملی ہاتھ میں دے دیا ہے، اب تمھیں کسی تاخیر کے بغیر شادی کے بندھنوں میں جکڑ دینا میرے فرائض میں شامل ہے یقین کرو کہ میں نے خود نیک نیتی اور خلوص سے تمھارے لیے کسی اچھے رشتے کی تلاش شروع کر رکھی تھی اور شاید اب میں اس میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اور اگر خدانخواستہ یہ رشتہ ٹھیک نہیں ہے تو بھی مجھے کوئی پروا نہیں بہتر یہی ہے کہ تم اس نوجوان مہمان کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آؤ، ورنہ کوئی بعید نہیں کہ اس کا متبادل شخص اس سے بھی گیا گزرا نکلے۔"

اپنی پُراثر تقریر ختم کر کے وہ سیدھا باہر نکل گیا۔ پادری بھی اُس کے پیچھے چل دیا۔

"اب کیا ہوگا؟" لڑکی نے شعلہ بار نظروں سے ڈینس کی طرف دیکھا "آخر اس کا مطلب کیا ہے؟"

"خدا جانے۔" ڈینس نے افسردگی سے کہا "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں کسی پاگل خانے میں مقید ہوں میری تو سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا ہے۔"

"آپ بھلا یہاں کس طرح پہنچ گئے؟"

ڈینس نے مختصراً اُسے سارا واقعہ سناتے ہوئے کہا "اب آپ ہی اتنی مہربانی کریں کہ مجھے یہ معمّہ سمجھا دیں..... اور یہ کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟"

وہ کچھ دیر چُپ چاپ کھڑی رہی۔ ڈینس نے اُس کے ہونٹ کپکپاتے ہوئے محسوس کیے اور پھر اچانک لڑکی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"اُف میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ دل بھی گھبرا رہا ہے۔" پھر کچھ توقف کے بعد اُس نے کہا "جیسا کہ آپ نے سُن لیا ہے میرا نام بلانکے ہے... نہ جانے کب سے... جب سے میں نے آنکھ کھولی ہے خود کو بے ماں باپ کی لڑکی پایا ہے۔ میں ساری زندگی بہت اداس رہی ہوں تقریباً تین ماہ کے عرصے سے ایک نوجوان کیپٹن ہر روز چرچ میں میرے برابر آ کر کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ میں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ وہ مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ مجھے اس احساس نے ایک نئی خوشی سے دوچار کر دیا پھر ایک روز جب اُس نے چوری چھپے ایک خط میرے حوالے کیا تو میں نے گھر لے جا کر اُسے بڑی دلچسپی اور گرمجوشی سے پڑھا۔ اس کے بعد اُس نے کئی اور خطوط بھی لکھے..... وہ مجھ سے بات کرنے کے لیے بے چین تھا۔ اور ہر خط میں مجھ سے یہ درخواست کرتا تھا کہ میں رات کو اپنے گھر کا کوئی دروازہ کھُلا چھوڑ دُوں تاکہ سیڑھیوں پر ہماری ملاقات ہو سکے، وہ جانتا تھا کہ میرے چچا کو مجھ پر کس قدر اعتماد ہے۔"

ڈینس خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

"میرے چچا بہت سخت آدمی ہیں۔" وہ بولی "انہوں نے مختلف جنگوں میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ملکہ ازابیلا کے دربار میں انھیں بہت بلند مقام حاصل ہے... نہ جانے کس طرح انھیں مجھ پر شبہ ہو گیا۔ کوئی بھی چیز ان سے چھپانا بہت مشکل ہے۔ آج جب میں عبادت کے بعد لوٹ رہی تھی تو انھوں نے موقع پا کر زبردستی میری مُٹھی کھلوا کر

میرا خط پڑھ لیا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

"وہ پورا خط پڑھ لینے کے بعد انھوں نے خندہ پیشانی سے وہ کاغذ مجھے لوٹا دیا۔ اس خط میں بھی دروازہ کھلا چھوڑ دینے کی درخواست لکھی ہوئی تھی۔ یہی ہماری تباہی کی ابتدا تھی۔ میرے چچا نے مجھے سختی سے تاکید کی کہ میں اپنے کمرے ہی میں رہوں اور خود کو اس لباس میں ملبوس کروں جس میں تم مجھے اس وقت دیکھ رہے ہو۔ جب وہ مجھ سے اس کیپٹن کا نام معلوم کرنے میں ناکام ہو گئے تو پھر انہوں نے شاید یہ جال بچھایا جس میں بدقسمتی سے آپ پھنس گئے ہیں۔ نہ جانے وہ کیپٹن مجھے ان شرائط پر اور موجودہ حالات میں بیوی بنانے پر تیار ہوتا یا نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مجھ سے محض دل لگی کر رہا ہو۔ یا میں نے اس کی نظروں میں خود کو بہت گرا لیا ہو لیکن بخدا میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میں ایک اجنبی نوجوان کے سامنے اس طرح ذلیل کی جاؤں گی۔ اب جبکہ میں آپ کو سب کچھ بتا چکی ہوں تو مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے نفرت کرنے لگے ہوں گے۔"

"مادام" ڈینس نے کھنکھارتے ہوئے کہا "آپ نے مجھ پر اعتماد کر کے مجھے اعزاز بخشا ہے یقین کیجیے کہ میں آپ کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ کیا آپ کے چچا قریب ہی کسی کمرے میں موجود ہیں؟"

"میرا خیال ہے، وہ لائبریری میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہوں گے"

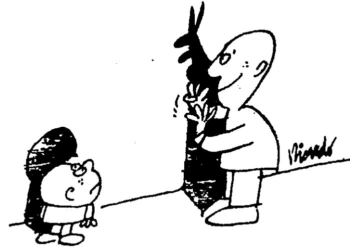
"کیا آپ میرے ساتھ وہاں تک چلنا پسند کریں گی؟"

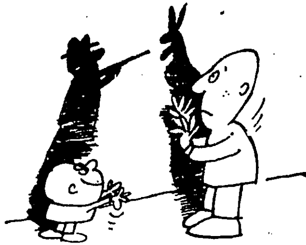
جب وہ دونوں لائبریری میں داخل ہوئے تو بوڑھے نے مسکرا کر ان کا خیر مقدم کیا۔

"جناب والا" ڈینس نے اپنی آواز قابو میں رکھتے ہوئے کہا "غالباً مجھے اس معاملے میں کچھ بولنے کا اختیار دیا گیا ہے تو آپ اسی وقت سن لیں کہ میں اس نوجوان خاتون پر توڑے جانے والے کسی بھی ظلم میں آپ کا شریک نہیں بن سکتا۔ اگر مجھے یہ پیش کش آزادانہ ماحول میں کی گئی ہوتی تو میں فخر سے اس خاتون کا ہاتھ تھام لیتا کیونکہ میرے خیال میں یہ ایک حسین ترین خاتون ہیں مگر موجودہ حالات میں ناچیز انکار کی جسارت کر رہا ہے۔"

بلانکے اُسے تشکر آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مگر بوڑھا محض مسکراتا رہا۔ یہاں تک کہ اُس کی مسکراہٹ ڈینس کے لیے برداشت سے باہر ہو گئی۔

"مجھے افسوس ہے عزیزم" بوڑھے نے کہا "میری تجویزیں





تمھاری سمجھ میں نہیں آئیں۔ یہاں آؤ اور اس کھڑکی سے نیچے جھانک کر دیکھو۔ یقین کرو کہ اگر تم نے میری بھتیجی کا ہاتھ تھامنے سے انکار کر دیا تو سورج طلوع ہونے سے پہلے تمھاری لاش یہاں لٹکی ہوئی ہو گی۔ مجھے یہ قدم اٹھاتے ہوئے بے حد رنج ہو گا کیونکہ میرا مقصد تمھیں موت کے منہ میں دھکیلنا نہیں ہے بلکہ اپنی بھتیجی کی زندگی سنوارنا ہے اس وقت میرے گھر اور خاندان کی عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے اور اس کا ذمے دار میں تمھیں قرار دیتا ہوں یا کم از کم اب تم اس راز کے شریک تو ضرور ہو اور اگر میں تم سے مدد کی درخواست کروں تو تمھیں حیران نہیں ہونا چاہیے۔ میں تمھاری لاش یہاں لٹکانا نہیں چاہتا۔ مگر کوئی اور چارۂ کار بھی نہیں ہے۔"

کچھ دیر کمرے میں سناٹا رہا۔

"میرے خیال میں یہ معاملہ سلجھانے کے کچھ اور طریقے بھی ہو سکتے ہیں" ڈینس نے کچھ توقف کے بعد کہا "میں نے سنا ہے کہ آپ ایک اچھے شمشیر زن بھی ہیں۔"

بوڑھے نے قریب ہی بیٹھے ہوئے پادری کو کچھ اشارہ کیا۔ پادری نے اُٹھ کر ایک دروازے پر پڑا ہوا پردہ ہٹایا تو ڈینس نے دیکھا کہ وہاں بے شمار

مسلح سپاہی چوکس کھڑے ہیں۔

بوڑھے نے کہا۔ "اگر میں تمھاری طرح نوجوان ہوتا تو بڑی خوشی سے تمھاری دعوت پر لبیک کہتا لیکن اب میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں، خیر میرا خیال ہے تم اور تمھاری ساتھی خاتون یہ آخری دو گھنٹے اسی لائبریری میں گزارنے کے خواہش مند ہیں اور میں تم لوگوں کی اس خواہش میں رکاوٹ بننا نہیں چاہتا۔ اس لیے بڑی خوشی کے ساتھ یہاں سے جا رہا ہوں۔ کسی عجلت کی ضرورت نہیں ہے۔" پھر اس نے آگے بڑھ کر ڈینس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اگر تمھیں پھانسی پر لٹکنا پسند نہیں تو یہ دو گھنٹے کوئی فیصلہ کرنے کے لیے بے شک کافی ہیں۔ تم خوب سوچ لو کہ چھلانگ لگا کر مرجانا بہتر ہے یا کوئی اور راہ اختیار کرنا مناسب رہے گا۔ بہرحال تمھیں صرف اور صرف دو گھنٹے ملیں گے، ان دو گھنٹوں کے دوران دنیا میں کیا سے کیا واقعات رونما ہو جائیں گے میری بھتیجی کے چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اب میں مزید رکاوٹ نہیں بنوں گا۔"

ڈینس نے بلانکے کی طرف دیکھا تو اس نے منت بھری نظروں سے اسے حامی بھر لینے کا اشارہ کیا۔ بوڑھا اپنی دوراندیشی پر بہت خوش ہوا اور جاتے جاتے ڈینس سے پھر رجوع ہوا۔ "نوجوان! اگر تم یہ وعدہ کرو کہ دو گھنٹے بعد میری واپسی سے پہلے تم کوئی غیر دانش مندانہ قدم اٹھانے سے گریز کرو گے تو میں مسلح محافظوں کو بھی یہاں سے ہٹانے کے لیے تیار ہوں تاکہ تم زیادہ اطمینان سے گفتگو کر سکو۔"

ڈینس نے جواب دینے کے لیے پھر بلانکے کی طرف دیکھا۔ بلانکے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں!" ڈینس نے کہا۔

بوڑھے نے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات اکٹھا کیے پھر پردے کے قریب جا کر محافظوں کو کچھ ہدایات دینے لگا اور پھر اسی دروازے سے باہر نکل گیا جہاں سے ڈینس اندر داخل ہوا تھا تنہائی کا یقین ہوتے ہی بلانکے ڈینس کی طرف بڑھی۔ اس کی پلکوں پر چمکدار آنسو جھلملا رہے تھے "آپ ہرگز نہیں مریں گے!" وہ چلائی "یقیناً اب آپ مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہو جائیں گے۔"

"مادام، غالباً آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ میں موت سے ڈر گیا ہوں۔"

"نہیں، نہیں" بلانکے بولی "مجھے احساس ہے کہ آپ بزدل نہیں ہیں.... مگر میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ آپ نے مشکلات کا مکمل طور پر اندازہ نہیں کیا۔" ڈینس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "میرے لیے اتنے اچھے اور لطیف جذبات رکھنے کے باوجود آپ یہ بھول رہی ہیں کہ آپ پر کسی اور کا بھی حق ہے۔"

یہ جملہ کہہ کر ڈینس نے نظریں جھکا لیں کیونکہ وہ بلانکے کے چہرے کے متوقع گڈمڈ تاثرات دیکھ کر اسے شرمندہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کچھ دیر تک یونہی کھڑی رہی اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کھڑکی کی طرف چل دی اور پھر وہاں سے ہٹ کر اپنے چچا کی آرام کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ ڈینس کو ندامت کے احساس نے گھیر لیا اور پھر تذبذب کے عالم میں اس نے اپنے اطراف نظر ڈالی اور قریب ہی پڑے ہوئے ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ بلانکے آہستہ آہستہ سسکیاں لینے لگی تھی اور ڈینس کو یہ سسکیاں کسی گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح وقت گزرنے کا احساس دلا رہی تھیں۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ وہ دونوں کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ڈینس چپکے چپکے کنکھیوں سے بلانکے کے سراپا کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔

— بلانکے کا سر تقریباً سینے پر لٹکا ہوا تھا اور وہ اپنے دونوں ہاتھ عجیب انداز سے رگڑ رہی تھی.... اس کی سسکیوں کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا اور اب اس کا چہرہ کسی اندرونی گھٹن کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس حالت میں بھی وہ بے حد حسین دکھائی دے رہی تھی۔ ڈینس نے دل ہی دل میں سوچا کہ اس نے اتنی حسین عورت بہت کم دیکھی ہے جیسے جیسے وہ بلانکے کے حسین خدوخال میں کھوتا جا رہا تھا۔ اسے موت اتنی ہی بدصورت اور ہیبت ناک محسوس ہو رہی تھی۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ جس دنیا میں اتنی حسین دوشیزہ رہتی ہو اسے چھوڑ دینے کی وہ کیونکر ہمت کر سکتا ہے۔ اس نے کلاک پر نظریں جما کر وقت دیکھا فیصلہ کن لمحے کی آمد میں ابھی چالیس منٹ باقی تھے، ڈینس نے ارادہ کیا کہ وہ بلانکے کا دل جیتنے کی کوشش کرے گا۔

باہر وادی میں اچانک کسی مرغ نے بانگ دی اور وہ دونوں جیسے چونک پڑے۔

"کیا میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی؟" بلانکے نے پوچھا

"مادام اگر میری کسی بات سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہے، تو یقین کیجیے میں نے وہ بات آپ ہی کی بھلائی کے لیے کہی ہو گی۔"

بلانکے نے آنسو بھری آنکھوں سے اُس کا شکریہ ادا کیا۔

"دُنیا نے آپ پر بہت ظلم کیے ہیں"۔ ڈینس نے کہا "آپ کے چچا انسانیت سے مبرّا ہیں۔ یقین کیجیے پورے فرانس میں ایک بھی نوجوان ایسا نہ ہوگا جو آپ کا ہاتھ تھامنے میں فخر محسوس نہ کرے لیکن کوئی مجھ جیسا نوجوان آپ کی خوشنودی کا تصوّر ذہن میں رکھ کر مرنے سے بھی نہیں ہچکچائے گا"۔

"مجھے پہلے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ آپ بہت فیّاض اور بہادر ہیں" بلانکے نے کہا "مگر میں یہ جاننا چاہتی ہُوں کہ بذاتِ خود میں اپنے محسن کے کسی کام آسکتی ہُوں یا نہیں؟ اب یا بعد میں؟" آخری الفاظ اُس نے کچھ ہچکچاہٹ سے ادا کیے۔

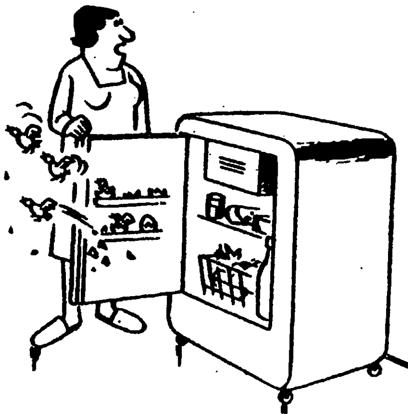
"ضرور، ضرور!" ڈینس نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے اس بات کی اجازت دیں کہ میں ایک دوست کی حیثیت سے آپ کے برابر بیٹھوں اور کچھ دیر کے لیے ہم یہ بھُول جائیں کہ قدرت نے ہمیں کسی خطرناک دوراہے پر لاکھڑا کیا ہے۔ میرے یہ آخری لمحات خوشگوار بنا کر آپ میری سب سے بڑی خدمت کرسکتی ہیں"۔

"آپ بہت عظیم ہیں"! بلانکے کی اُداسی میں کچھ اور اضافہ ہوگیا "واقعی بہت عظیم۔ یہی سوچ سوچ کر میرا دل کُڑھ رہا ہے۔ آپ چاہیں تو میرے قریب آسکتے ہیں، اور اگر آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں تو میں آپ کے لیے ایک اچھی دوست اور بہترین سامع ثابت ہوں گی مگر... میں کیونکر آپ سے نظریں ملاسکتی ہوں"۔ وہ دوبارہ رونے لگی۔

"مادام!" ڈینس نے بڑھ کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "خدا کے لیے یہ قیمتی آنسو بہا کر مجھے اپنی زندگی کے گراں ہونے کا بے جا احساس نہ دلائیے۔ کہیں میں یہ نہ سوچنے لگوں کہ جو آنسو پونچھنے کے لیے میں اپنی جان دے رہا ہوں وہ بعد میں بھی اسی طرح بہتے رہیں گے"۔

"میں کتنی خود غرض ہُوں"! بلانکے نے کہا "مجھے کچھ اور ہمّت کرنی چاہیے۔ آپ کی خاطر۔ ذرا سوچ کر بتائیے کہ میں مستقبل میں آپ کے لیے کیا کرسکتی ہُوں۔ آپ کا کوئی دوست یا ساتھی، جسے کوئی پیغام پہنچانا ہو؟ مجھ سے زیادہ سے زیادہ کام لیجیے۔ آپ کے کاموں کی انجام دہی شاید میرے دل سے اُس عظیم احسان کا بوجھ کچھ کم کرسکے جو آپ نے مجھ پر کیا ہے....."

"میری ماں نے دوسری شادی کی ہے اور اُس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میرا بھائی گیوچارڈ میری تمام ملکیت کا وارث ہوگا اور یہ بات



بیوی: "سُنیئے! آج آئیٹ کے بجائے کباب کھا لیجیے گا۔"

اُس کے دل سے میری موت کا غم بھلادے گی.... زندگی تو ایک ایسا بلبلا ہے جو ذرا سی دیر کے لیے اُبھر کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتا ہے۔ انسان بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دے۔ وقتی طور پر تو اُس کی خوب پذیرائی ہوتی ہے۔ ہر شخص اس کی راہوں میں آنکھیں بچھاتا ہے.... مگر نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ساری دنیا اُسے بھُول جاتی ہے۔ ابھی دس سال پہلے ہی میرے والد نے بادشاہ کی خاطر لڑتے ہوئے بڑی بہادری سے جان دے دی تھی۔ مگر کون ہے جسے ان کا نام تک یاد ہو"۔

بلانکے ہمہ تن گوش تھی اور ٹکٹکی باندھے اس کا چہرہ تک رہی تھی۔

"نہیں مادام، موت کے جتنا قریب جائیے وہ اتنی ہی بھیانک دکھائی دیتی ہے... اس وقت میرے چند دوست ہیں اور مجھے اُن پر فخر ہے... مگر افسوس ہے کہ میرے مرتے ہی وہ سب اپنے ہنگاموں میں گم ہو جائیں گے"۔

"آپ بھول رہے ہیں"۔ بلانکے نے احتجاج کیا "آپ اپنی دوست بلانکے کو بھُول رہے ہیں"۔

"مادام آپ واقعی بہت خوش اخلاق ہیں! اور آپ میرے ایک ذرا سے کام کے عوض مجھ پر آتنی بڑھ چڑھ کر عنایتیں کر رہی ہیں۔ یقیناً آپ کے رویّے سے میری رُوح مطمئن رہے گی"۔

"نہیں، آپ بہت عظیم انسان ہیں۔ میں آپ کے اندر وہ انسان دیکھ رہی ہُوں جس کے سامنے میرا وجود حقیر ہے۔ آپ اس جنگل میں پھنس کر کس طرح اپنی جان قربان کر رہے ہیں"۔ بلانکے کے چہرے پر کرب

کے تاثرات ابھرے اور وہ گھڑی بھر کے لیے خاموش ہوگئی۔ پھر جیسے اچانک اس کی آنکھوں میں کوئی چمک عود کر آئی اور اُس نے مسکراتے ہوئے کہا" میں سمجھتی ہُوں میں اپنے محبُوب کو اس کی ذاتی خودغرضی کی بنا پر حاصل نہیں کر سکی ہوں' جو لوگ دوسروں کی خاطر جان دینا جانتے ہیں' جنّت میں اُن کا سر فخر سے بلند ہوگا۔ مگر آپ بھلا کیوں کسی کی خاطر جان دیں' کسی خودغرض کی خاطر۔ سچ سچ بتائیے کہ واقعی آپ مجھے بہت حسین سمجھتے ہیں؟" اُس کے چہرے پر حیا کی سُرخی دوڑ گئی۔

"بے شک' مادام!"

"مجھے یہ سُن کر بہت خوشی ہُوئی۔ کیا آپ کے نزدیک فرانس میں ایسے نوجوانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن سے کسی حسین عورت نے خود اپنی زبان سے شادی کی درخواست کی ہو اور جواب انکار کی صورت میں پایا ہو؟" بلانکے کے ہونٹ کپکپا رہے تھے مگر اُس نے اپنی بات جاری رکھی "مجھے احساس ہے کہ آپ جیسے مرد ایسی فتح پر فخر نہیں کر سکتے مگر یقین جانیے کہ ہم عورتیں زیادہ بہتر طریقے پر جانتی ہیں کہ محبت میں کونسی چیز بہتر اور قیمتی ہے! دنیا میں اس کام سے بہتر کوئی کام نہیں جسے انجام دے کر ایک شخص خود اپنی نظروں میں اعلا اور بلند ہو جائے۔"

"مادام آپ بے شک بہت اچھی ہیں۔ مگر آپ مجھے یہ بات بھولنے پر مجبور نہیں کر سکیں گی کہ یہ پیش کش محبت کے بجائے رحم کی صورت میں کی جا رہی ہے۔"

"پہلے میری پُوری بات سُن لیجیے!" بلانکے نے نظریں جُھکائے ہوئے کہا "مجھے اندازہ ہے کہ آپ مجھ سے کس قدر نفرت کریں گے اور شاید آپ کو اس کا حق پہنچتا ہے ...... میں آپ کے دل میں ذرا بھی گھر نہ کر سکی حالانکہ آپ صبح تک میری خاطر جان دینے والے ہیں .... مگر یقین جانیے میں نے آپ کو شادی کی پیش کش صرف اس لیے کی ہے کہ میرے دل میں آپ کے لیے عزت اور پسندیدگی کے جذبات ہیں ... اور .... اسی لمحے سے جب آپ نے میرے چچا کی مخالفت مول لی تھی' میں نے اپنے دل کی گہرائیوں میں آپ کے لیے محبت کی رمق محسوس کی تھی' اس وقت اگر آپ خود کو دیکھ لیتے ...... یہ دیکھ لیتے کہ آپ کس قدر عظیم دکھائی دے رہے ہیں تو اب آپ مجھے نفرت اور حقارت کے بجائے رحم کی نظروں سے دیکھتے .... اور اب جبکہ میں نے شرم و حیا بالائے طاق رکھ کر آپ سے یہ تمام باتیں کہہ ڈالی ہیں' یہ نہ بھولیے کہ مجھے آپ کے جذبات کا بھی بخوبی علم ہو گیا ہے' میں یقیناً آپ سے محبت کی بھیک نہیں مانگوں گی مگر میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اگر آپ اپنا فیصلہ بدل دیں تو میں اپنے چچا کی پسند کے دولھا کی نسبت آپ سے شادی کرنا زیادہ پسند کروں گی۔"

ڈینس کچھ دیر تک اُس کی پیش کش پر غور کرتا رہا اور پھر اُس کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "یہاں کھڑکی کے پاس آئیے" ڈینس نے کہا "اُجالا ہونے والا ہے۔"

وہ دونوں فضا میں ہلکی ہلکی سفیدی دیکھ رہے تھے' ڈینس نے بے خیالی میں اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"کیا واقعی سحر طلوع ہونے والی ہے؟" بلانکے نے سرگوشی کی "رات کتنی طویل تھی .... چچا جان لوٹیں گے تو ہم اُن سے کیا کہیں گے؟"

"آپ کیا کہیں گی؟" ڈینس نے گرمجوشی سے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

وہ چُپ رہی۔

"بلانکے!" اُس نے بہت آہستہ سے کہا "تم دیکھ چکی ہو کہ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ تمھیں اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ میں خوشی کے ساتھ اس کھڑکی سے چھلانگ لگا دیتا مگر تمھاری مرضی کے خلاف تمھیں انگلی سے بھی نہ چھوتا لیکن اگر تم واقعی میرے لیے فکرمند ہو تو پھر مجھے اپنی زندگی اس طرح بیکار نہیں گنوانی چاہیے .... کیونکہ مجھے اس دُنیا میں تم سے بڑھ کر کسی اور شے سے محبت محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ گو میں تمھاری خاطر مرنے کے لیے تیار ہوں مگر زندہ رہ کر تمھاری خدمت کرنا جنّت میں زندگی گزارنے سے کم نہ ہوگا۔"

عمارت کے اندرونی حصّے سے گھنٹے کی آواز سُنائی دی ... اور ساتھ ہی پردے کے پیچھے بوٹوں کی آہٹیں اور اسلحہ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ دو گھنٹے کی مدّت ختم ہونے والی تھی۔

"کیا یہ سب کچھ معلوم ہو جانے کے باوجود تم مجھ سے ..." بلانکے نے سرگوشی کی۔ مگر ڈینس کے پُرجوش لبوں نے اُس کی بات پوری نہ ہونے دی اور وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دُوسرے میں گم ہو کر رہ گئے۔

دروازہ کھُلا اور چچا نے ہنستے ہُوئے اپنے نئے داماد کو صبح بخیر کہا۔

♥♥



سنگدل حضرات
کے لیے
ہمارے گروہ کی
ایک جذباتی اور خواب
دیکھنے والی
لڑکی کی کہانی
الیاس سیتاپوری

بات

یہ نہیں تھی کہ علی شاہد کسی پست خاندان سے تعلق رکھتا تھا یا اُس کے پاس مال و دولت کی کمی تھی

بس چڑ اس بات کی تھی کہ مہ جبیں نے اُس سے محبت کرنے کی جرأت کیوں کی جبکہ پُروقار شخصیت کے مالک نعمانی صاحب نے اپنی حسین اکلوتی بیٹی کے لیے کسی اور کا انتخاب کر رکھا تھا جب گھر میں مہ جبیں کی شادی کا چرچا ہونے لگا اور اسے یہ معلوم ہوا کہ اسے ایک ایسے شخص سے منسوب کیا جا رہا ہے جسے اُس نے کبھی دیکھا تک نہیں تو اس کی کیفیت عجیب ہو گئی، وہ کئی دن تک غم و غصے میں مبتلا رہی، وہ ایک تعلیم یافتہ مگر جذباتی لڑکی تھی، اُس نے بی ایس سی کیا تھا اور اپنی زندگی کا سودا کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی تھی، پہلے تو اُس کے جی میں آئی کہ وہ باپ کو صاف صاف بتا دے کہ وہ شاہد کے سوا کسی اور کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی لیکن اعلانِ بغاوت سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ ایک بار پھر اس معاملے میں علی شاہد سے مشورہ کر لیا جائے۔

جب یہ ہوش رُبا خبر علی شاہد نے سُنی تو اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اُس نے پُراعتماد لہجے میں مہ جبیں سے کہا "تم گھبراتی کیوں ہو میں پیغام دیتا ہوں، میرا خیال ہے کہ ہمیں ناکامی نہیں ہو گی!"

لیکن علی شاہد نے جب پیغام دیا تو نعمانی صاحب کے تیور بدل گئے اور کچھ کہے سُنے بغیر ہی وہ سارا معاملہ سمجھ گئے۔ انہوں نے کہا "کیا تمہارا کوئی بزرگ نہیں ہے جو تمہاری طرف سے بات کرے!"

علی شاہد نے جواب دیا "بزرگ ہیں کیوں نہیں لیکن وہ لوگ دور رہتے ہیں، یوں بھی میں نے اپنی زندگی خود بنائی ہے میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ مہ جبیں کو کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا!"

نعمانی صاحب نے کھوئے کھوئے انداز میں دریافت کیا "تم کام کیا کرتے ہو؟"

علی شاہد نے فخریہ جواب دیا "کئی صابن فیکٹریوں کی ایجنسی لے رکھی ہے!"

نعمانی صاحب نے استہزائیہ انداز میں آہستہ سے کہا "تو گویا تم صابن والے ہو" پھر تذبذب کے انداز میں کہنے لگے "دیکھو بھئی یہ معاملے ایسے نہیں کہ جلدی میں طے ہو جائیں۔ تم انتظار کرو میں گھر میں بات کر لوں، مشورہ کر کے ہی کوئی جواب دے سکوں گا۔"

اس کے بعد گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مہ جبیں نکو بن گئی دبے دبے لہجوں اور اشاروں میں اُس کی داستانِ عشق کا چرچا ہونے لگا اُس پر پابندیاں عائد کر دی گئیں، اور اُس کا گھر سے نکلنا جرم قرار دے دیا گیا نعمانی صاحب کو مہ جبیں سے بڑی محبت تھی لیکن اپنے خاندانی جاہ و حشم کا بھی بڑا پاس تھا، انہوں نے ساری زندگی عزت کمانے میں صرف کی تھی، اور وہ بس ایک بات جانتے تھے کہ "سرپرست وہ ہیں، مہ جبیں کی قسمت کا فیصلہ وہ کریں گے۔"

ان پابندیوں سے مہ جبیں کا دم گھٹنے لگا اسے کچھ پتا نہ تھا کہ علی شاہد نے اس کے باپ سے کیا بات کی؟ دوسری طرف علی شاہد ہر روز نعمانی صاحب سے ملتا اور ان سے جواب مانگتا، کئی دن تک تو نعمانی صاحب یہ کہہ کر ٹالتے رہے کہ "ابھی بات نہیں ہو سکی" لیکن ایک دن یہ کہہ کر اس موضوع کا دروازہ بند کر دیا کہ "مجھے افسوس ہے میاں یہ کام نہیں ہو سکتا مجھے شرمندہ نہ کرو اور خواہ مخواہ وقت ضائع نہ کرو۔"

مہ جبیں کی جتنی کڑی نگرانی کی گئی اُس میں اسی شدت سے جذبۂ بغاوت پرورش پانے لگا جب وہ بالکل بے بس اور مجبور ہو گئی تو اُس نے یہ طے کر لیا کہ کچھ بھی ہو وہ گھر سے فرار ہو کر اپنے محبوب کے پاس چلی جائے گی، وہ بالغ تھی اور قانون اُسے یہ حق دیتا تھا کہ وہ جس کے ساتھ چاہے زندگی گزارے لیکن پھر وہ یہ بھی سوچتی کہ کہیں علی شاہد کے عشق میں کمی تو نہیں آ گئی، اس خاموشی اور کنارہ کشی کا آخر کیا نتیجہ اخذ کیا جائے؟ اگر گھر سے فرار ہونے کے بعد اس نے بھی معاملے کی نزاکت اور سنگینی کے پیشِ نظر مہ جبیں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اس وقت وہ کیا کرے گی؟ وہ کہیں کی بھی تو نہ رہ جائے گی۔

وہ جتنا سوچتی، شدت اتنی ہی بڑھ جاتی، مایوسیوں کے سیاہ بادل مستقبل کی لامتناہی فضاؤں میں پھیلے ہوئے تھے اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ عشق میں جرأت و ہمت کے بغیر کامیابی نہیں ہوتی اب صرف یہ ہے کہ عزت و آبرو کا خطرہ مول لیا جائے۔ اُس نے سوچا اگر شاہد کے رویّے میں کوئی فرق محسوس ہوا تو وہ چپ چاپ واپس آ کر خود کو والدین کے حوالے کر دے گی۔

رفتہ رفتہ وہ تکیہ تر کر لیتی، بھوک پیاس اُڑ گئی، چہرہ پھیکا پڑنے لگا ماں سے اس کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی تھی انہیں ڈر لگنے لگا کہ کہیں یہ جذباتی اور ضدی لڑکی کچھ کر نہ بیٹھے، وہ اپنی مشتعل بیٹی کو اکثر سمجھاتی رہتیں "کہ تمہارے باپ تمہارے دشمن نہیں ہیں، تمہارے لیے جو کچھ کریں گے بہتر ہی کریں گے۔"

مہ جبیں غصّے میں کہتی "امّی میں بھی اپنی دشمن نہیں ہوں اپنے لیے جو کروں گی بہتر ہی کروں گی!"

"آخر تم چاہتی کیا ہو؟" ماں نے زچ ہو کر دریافت کیا

"امّی! میں علی شاہد سے ملنا چاہتی ہوں" مہ جبیں نے گردن جھکا کر کہا "امّی آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ وعدے کیے ہیں میں چاہتی ہوں کہ اس سے مل کر اپنی لاچاری اور بے بسی سے مطلع کر دوں۔ تاکہ وہ میرے متعلق کوئی غلط رائے قائم نہ کرے کہ کہیں میں نے اس سے کوئی دھوکا

کیا ہے لیکن اگر مجھے اس کا موقع نہ ملا تو میں خودکشی کر لوں گی لیکن وہاں شادی نہ کروں گی جہاں ابا جان چاہتے ہیں!"

ماں کے ہاتھ پیر سنسنانے لگے "تم بہت بڑی بات کہہ رہی ہو، میں تمہیں کس طرح اجازت دے سکتی ہوں اور اگر میں تمہیں یہ اجازت دے دوں کہ تم چوری سے گھنٹے دو گھنٹے کے لیے علی شاہد سے جا کر مل لو تو میں کس طرح یقین کر لوں کہ تم کوئی غلط قدم نہ اٹھاؤ گی۔"

مہ جبیں نے وثوق سے کہا "امی یہ پابندی تو مجھ پر آج لگی ہے اگر میں واقعی غیر محتاط ہوتی اور کوئی غلط قدم اٹھانا چاہتی تو کب کا اٹھا چکی ہوتی لیکن میں نے علم حاصل کیا ہے، میں خوب جانتی ہوں کہ حدِ اعتدال اور انتہا پسندی میں کون سی راہ میرے لیے مفید ہے!"

ماں نے اس پر جلد اعتماد کر لیا۔ کہنے لگیں "سنو مہ جبیں میرے بڑھاپے میں کالک نہیں لگنی چاہیے! جی نہیں چاہتا کہ تمہاری بات مان لوں" پھر کچھ سوچتی ہوئی بولیں "کل جب تمہارے ابا چلے جائیں تو تمہیں اس کی اجازت ہوگی کہ علی شاہد سے جا کر مل لو اور اس سے معذرت کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دو کہ تم والدین کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتیں!"

انہوں نے اجازت تو دے دی لیکن دل میں دھڑکا بیٹھا ہوا تھا کہ کہیں ان کی یہ شفقت کوئی قیامت نہ لے آئے وہ اپنی لڑکی سے خوب واقف تھیں اور وہ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھیں کہ اب بات اتنی دور پہنچ چکی ہے کہ مہ جبیں شاہد کو نہیں چھوڑ سکتی اگر گھر والوں نے زیادہ دباؤ ڈالا تو مہ جبیں اپنی مرضی سے اس کے پاس چلی جائے گی اب کوئی بات بھی ممکن تھی،

بہرحال دوسرے دن مہ جبیں کو علی شاہد سے ملنے کی اجازت مل گئی ماں نے یہ تین گھنٹے بڑے کرب اور اضطراب میں گزارے بعض لمحوں میں تو ان پر اتنی مایوسی طاری ہوتی کہ اختلاج کے دورے پڑنے لگے انہیں اس کا رنج تھا کہ انہوں نے عشق زدہ نوجوان لڑکی کے عہد و پیمان کا اعتبار ہی کیوں کیا لیکن جب مہ جبیں واپس آ گئی تو انہیں نہ صرف خوشی ہوئی بلکہ اپنے اندیشوں اور وسوسوں پر شرمندگی بھی محسوس کی، انہوں نے مہ جبیں کے چہرے کو غور سے دیکھا تو وہاں بلا کی مایوسی اور فکرمندی کے آثار پائے جاتے تھے، انہوں نے سوچا کہ شاید مہ جبیں علی شاہد سے فیصلہ کن باتیں کر آئی ہے اور اسے ترکِ تعلق کے ملال نے سوگوار کر دیا ہے، اس نے علی شاہد سے کیا باتیں کیں، ماں کو کچھ پتا نہ چل سکا اس بات کو کئی دن گزر گئے مہ جبیں میں بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔

وہ بستر پر پڑی کچھ سوچتی رہتی کبھی کبھی اکتا کر کوئی کتاب پڑھنے لگتی، اور سطروں پر نظریں جمائے سوچتی رہتی۔ نعمانی صاحب بھی نفرت اور غصے سے مہ جبیں کی کیفیت دیکھ رہے تھے بیوی سے یہ گول مول بات انہیں معلوم ہو چکی تھی کہ مہ جبیں نے علی شاہد کو دل سے نکال دیا ہے اور وہ والدین کی مرضی کے خلاف نہیں جائے گی۔ نعمانی صاحب جلد از جلد بات پکی کر کے اسے اپنے گھر سے رخصت کر دینا چاہتے تھے، ایک ہفتہ بعد چاند کی دس تاریخ کو مہ جبیں کی نسبت طے پانے والی تھی، ماں نے سوچا کہ ناپختہ کار اور جذباتی لڑکی جب یہ سنے گی کہ ہفتہ بھر بعد اس کی نسبت طے پا رہی ہے تو ضرور خوش ہوگی لیکن جب ماں نے یہ خوش خبری سنائی اور اسے حکم دیا کہ اب وہ اپنی سوگواری کو دور کر دے اور بشاش رہنے کی کوشش کرے تو وہ بگڑ گئی کہنے لگی "امی! میں شادی نہیں کروں گی، آپ لوگ خواہ مخواہ ان چکروں میں نہ پڑیں ورنہ شرمندگی اٹھانی پڑے گی!"

ماں نے غصے میں کہا "آخر تو چاہتی کیا ہے؟ کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو!"

مہ جبیں نے ڈھٹائی سے جواب دیا "امی میں جو چاہتی ہوں آپ کو معلوم ہے بار بار زبان نہ کھلوائیے!"

"یعنی؟" ماں کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں "تجھے جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہہ پہیلیاں کیوں بجھا رہی ہے۔"

مہ جبیں نے ہمت کر کے صاف صاف کہہ دیا "علی شاہد سے شادی!"

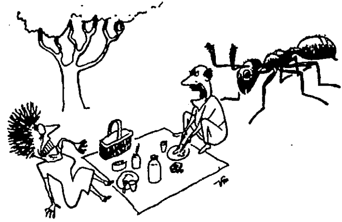
ماں کو ایسا لگا جیسے انہیں کسی اونچی جگہ سے پھینک دیا گیا ہو "لیکن تو تو علی شاہد سے فیصلہ کن بات کر چکی ہے!"

"ہاں" وہ اداسی سے کہنے لگی "میں اس کے پاس جس غرض سے گئی تھی وہ کہہ ہی نہ سکی، باتیں ہی کچھ اور ہو گئیں جو سوچ کر گئی تھی وہ پورا نہ ہوا" یہ کہتے کہتے اس کا دل بھر آیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی "اور پھر امی ہم ایک نئے معاملے میں جکڑ گئے امی میں دن رات اسی نئے معاملے پر غور کرتی رہتی ہوں اور سوچتی ہوں کیا اس دن مجھ سے لغزش ہو گئی اب اگر علی شاہد نے خود روگردانی کی تو میرا کیا بنے گا میں تو کہیں کی بھی نہ رہ جاؤں گی کاش میں اس دن نہ گئی ہوتی۔"

ماں نے بیٹی کی باتوں کا کچھ کچھ مفہوم پا لیا اور اس سے خوفزدہ ہو گئیں "کیا مطلب؟ آخر تو کہنا کیا چاہتی ہے؟"

مہ جبیں آنکھیں نہ ملا سکی، نظریں تکیے پہ گاڑ دیں، بولی "اب کچھ نہ پوچھیے امی! مجھے ہول آتا ہے دیکھیے مجھے کسی بات کا انتظار ہے اس کے بعد آپ کچھ پوچھیے گا۔"

"مہ جبیں!" ماں نے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی "یہ تو کیا کہہ رہی ہے میری بچی! سمجھ لے کہ تیرے ابا تجھے زندہ نہ چھوڑیں گے اور ہو سکتا ہے کہ



"بڑی ڈرپوک ہو تم، جہاں کھانا ہو گا وہاں ایک آدھ چیونٹی ضرور آئے گی۔"

علی شاہد بھی مارا جائے۔ آخر ایسا ہوا کیوں؟"

مہ جبیں نے آنکھیں بند کرلیں "وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے میں اُس کی بات ٹال نہیں سکی، اُس نے مجھے اعتماد میں لے لیا اب تو جو ہونا تھا ہو چکا، ابا ہم دونوں کو قتل کر کے پھانسی پر چڑھ جائیں اس سے اور رسوائی ہو گی رسوائی تو ہم سب کا مقدر بن گئی ہے؟"

ماں وحشت زدہ ہو گئی ان کا بس چلتا تو مہ جبیں کا منہ نوچ لیتیں اور اُسے اتنا مارتیں اتنا مارتیں کہ وہ ساری لن ترانیاں بھول جاتی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ یہ مار پیٹ اور تنبیہہ و تادیب اس نازک مسئلے کا حل نہیں ہے جب مہینے کی پانچ تاریخ گزر گئی تو مہ جبیں کی وحشت میں کچھ زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اسے گھر بالکل اچھا نہ لگتا دوسری طرف ماں بھی مہ جبیں کی کڑی نگرانی کر رہی تھیں اور تاریخوں کے بے داغ گزر جانے کو انہوں نے بھی محسوس کر لیا ان کے ہوش و حواس جاتے رہے اب کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہ رہی تھی کئی بار شوہر کے سامنے زبان کھلتے کھلتے رہ گئی لیکن بھیانک نتائج کے خوف نے ان کی زبان کو تالا لگا دیا۔ ماں بار بار مہ جبیں سے پوچھتیں کہ اب کیا ہو گا؟"

مہ جبیں حتی الامکان جواب سے گریز کرتی لیکن جب مجبور ہو جاتی تو چڑ کر کہہ دیتی "مجھے وہیں بھیج دیجئے علی شاہد کے پاس، ورنہ بدنامی کے لئے تیار رہیے" وہ خود بھی بہت پشیمان اور پریشان نظر آتی تھی، آنے والے دن رسوائیوں کے ہاتھ پھیلائے چلے آ رہے تھے، بالآخر تنگ آ کر اُس نے علی شاہد کو ایک خط لکھا:

"شاہد! کسی القاب، خطاب پر دل آمادہ نہیں ہوتا۔ اب میرا رُواں رُواں خوفزدہ ہے، مجھے یقین ہو چلا ہے کہ مجھ سے اپنی زندگی کی سب سے بڑی لغزش سرزد ہو گئی۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ اور مجھے یہاں تک یقین دلا دیا تھا کہ اگر ابا جان اپنی ضد پر قائم رہے تب تم کوئی جرأت مندانہ قدم اٹھاؤ گے

میں وہ لمحے یاد کرتی ہوں، جب ہم جذبات سے مغلوب ہو گئے تھے اور تم نے مجھ سے آخری درجے کی اپنائیت کا سلوک کیا تھا، مجھے اسی وقت فکر لگ گئی تھی، اور میں نے اس کا اظہار بھی کیا تھا لیکن تم نے یہ کہہ کر میری زبان بند کر دی تھی کہ تمہاری محبت ناقابل تسخیر ہے تم نے کہا تھا کہ اگر میں کسی قسم کے خطرے سے دوچار ہوئی تو تم اس پورے معاشرے سے لڑائی لڑو گے اور مجھے حاصل کر لو گے، اب وہی ہو گیا جس کا خطرہ تھا۔ میں جلد سے جلد تمہاری پناہ چاہتی ہوں، مجھے یہ لکھتے ہوئے شرم آتی ہے کہ مقررہ تاریخیں بے داغ گزر گئیں امی کے سوالات اور تشویشناک پرسش نے الگ ہلکان کر رکھا ہے تمہیں جو کچھ کرنا ہے جلد کرو، مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ کھانا پینا حرام ہو گیا ہے اگر تم میری زندگی چاہتے ہو تو تمہیں میرے لیے جلد از جلد کچھ کرنا چاہیئے ورنہ پھر موت ہی مجھے پناہ دے گی۔ بدنامی اور رسوائی کے خوف نے دل پر ایسا اثر کیا ہے کہ سوز و گداز کے جذبات کو فنا کر دیا ہے مجھ پر رحم کرو اور جو کچھ کرنا ہے جلد از جلد کرو"

اُس نے یہ خط ڈاک سے روانہ کر دیا۔ اسی دن رات کے پچھلے پہر نعمانی صاحب مہ جبیں کے کمرے میں داخل ہوئے خوفزدہ امی ان کے پیچھے پیچھے تھیں، نعمانی صاحب کا چہرہ غصے سے بھیانک ہو گیا تھا۔ مہ جبیں کی نیند تو ہفتوں پہلے سے اُڑی ہوئی تھی، جب ان دونوں نے اُس کے کمرے میں قدم رکھا تو وہ جاگ رہی تھی، انہیں دیکھتے ہی گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔

نعمانی صاحب مہ جبیں کے پلنگ کے قریب کھڑے ہو کر اُسے گھورنے لگے انہوں نے بڑی کوشش کی کہ وہ مہ جبیں کو جی بھر کے مغلظات سنائیں لیکن نہیں سنا سکے انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ انہیں اپنی لڑکی کے سامنے اس طرح جانا پڑے گا۔ وہ بدقت تمام یہ بول سکے "مہ جبیں! تم نے یہ کیا کیا؟" ان کی آواز میں وہ دبدبہ اور گرج چمک نہ تھی جو ان کے خاندان کا طرۂ امتیاز تھی۔

مہ جبیں نے شرم سے آنکھیں جھکا لیں اور سسکیاں لینے لگی۔

یکایک نعمانی صاحب جوش میں آگے بڑھے اور منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر مہ جبیں کو مکوں اور طمانچوں سے مارنا شروع کر دیا۔ مہ جبیں نے کوئی چیخ کوئی آہ بلند نہ کی۔ باپ کی طرح وہ بھی خاموش رہی اور نہایت ضبط اور خاموشی سے مار کی اذیتیں سہتی رہی۔

ماں نے ان دونوں کے درمیان آ کر بیچ بچاؤ کرنا چاہا۔ بولیں "اب بس بھی کرو بہت ہو چکا میں اسی لیے تمہیں بتاتے ہوئے ڈرتی تھی۔"

نعمانی صاحب کی آواز میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ بیوی کو ایک طرف دھکیلنے کی کوشش کی، بولے "تم ہٹ جاؤ سامنے سے، میں اس منحوس کو

جان سے مار دوں گا !"

دونین ہاتھ ماں کے بھی پڑ گئے آخر دونوں کے درمیان حائل ہی ہو گئیں اور ذرا بلند آواز میں بولیں "اگر جان ہی سے مارنا ہے تو پھر سب کے سامنے مارو اور پھانسی کے تختے پر چڑھ کر مجھے بیوہ اور بے آسرا کر جاؤ۔"

"پھر میں کیا کروں ! تم ہی بتاؤ۔"

نعمانی صاحب روہانسے ہو گئے گلوگرفتہ آواز میں بولے۔

ماں بھی رو رہی تھیں انہوں نے کہا "ہمیں صبر اور تحمل سے سوچنا چاہیے اس نے جو کچھ کیا بہت برا کیا میں تو یہ سوچتی ہوں کہ اس کے رشتے کے لئے جو مہمان آنے والے ہیں ان سے اب کیا کہا جائے گا۔"

مہ جبیں کی دبی دبی سسکیوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی، اس بات کو کئی دن گزر گئے ماں اور نعمانی صاحب کی خواب و خورش حرام ہو گئی۔

مہ جبیں کو شاہد کے خط کا انتظار تھا اسے یقین تھا کہ شاہد نے اسے جو روگ لگایا ہے اس کا علاج بھی وہی کرے گا۔ اِدھر گھر میں چپکے چپکے یہ مشورے ہو رہے تھے کہ مہ جبیں کو کچھ دنوں کے لئے اس کے ماموں زاد بھائی پروفیسر اعجاز کے پاس بھیج دیا جائے اعجاز کے پاس بھیجنے میں کئی مصلحتیں تھیں، وہ اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے پورے خاندان میں مشہور تھا سوسائٹی اور خاندان کی بہت سی قدروں کا کھلم کھلا مذاق اڑاتا تھا۔ اس آزادروی اور صاف گوئی نے اسے عملی زندگی میں ناکام رکھا تھا کئی کالجوں میں لیکچرار شپ ملی اور پرنسپل اور انتظامیہ سے اَن بن کی نذر ہو گئی۔ عمر چالیس سے اوپر تھی لیکن شادی نہ ہو سکی تھی کئی جگہ رشتوں کی بات ہوئی مگر لڑکی والوں کو جب اس کی عجیب و غریب بے باک سرشت کا علم ہوتا تو رشتہ دینے سے انکار کر دیا جاتا۔ اس نازک وقت میں آوارہ فکر اعجاز انہیں یاد آیا، سرکش نعمانی صاحب بھی بالآخر اس پر آمادہ ہو گئے لیکن انہیں یہ فکر کھائے جاتی تھی کہ اگر اعجاز نے مہ جبیں سے شادی کر لینے پر حامی بھر لی تو شادی کے بعد شرمناک انکشاف کا کیا جواز پیش کیا جائے گا انہیں یہ فکر بھی لگی ہوئی تھی کہ مہ جبیں کی نسبت کے سلسلے میں جو لوگ آنے والے ہیں آخر انہیں کیا جواب دیا جائیگا لیکن وہ قیامت کی تاریخ آئی اور گزر گئی۔ لڑکے والے نہیں آئے نعمانی صاحب ایک اور الجھن کے شکار ہو گئے اور پھر ایک دن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ لڑکے والے بھی مہ جبیں کی ناگفتنی کیفیت سے آگاہ ہو چکے ہیں تو ان کا جی چاہا کہ کچھ کھا کے ہمیشہ کے لیے سو رہیں۔

گھر میں ایک بار پھر سرگوشیوں میں باتیں ہونے لگیں، نعمانی صاحب بیوی پر زور دے رہے تھے کہ اب جتنی جلدی ممکن ہو سکے، اعجاز کو رضامند کر کے مہ جبیں کو اس کے سپرد کر دیا جائے، یہ بات مہ جبیں کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ آزاد خیال، مراقی سانولی رنگت کا یہ چالیس سالہ پروفیسر اسے بالکل پسند نہ تھا۔ اعجاز کی باتیں عجیب تھیں وہ کسی کی بھی سمجھ میں نہ آتی تھیں پھر اس کی آمدنی بھی بڑی محدود تھی، بس ساڑھے تین چار سو روپے ماہانہ کما لیتا تھا ایک حسین تعلیم یافتہ نوجوان لڑکی جس نے بہت سے خواب دیکھ رکھے ہوں، وہ کیسے اعجاز سے مفاہمت کر سکتی تھی، اسے معلوم تھا کہ اعجاز معاشرے کا ایک مضحکہ خیز اور مراقی کردار ہے اسے شوہر کی حیثیت سے متعارف کرانے میں کتنی شرم اور سبکی اسے محسوس ہو گی، اور پھر اس صورت میں تو اعجاز کا خیال تک گناہ ہے کہ اس کے پاس علی شاہد کی ایک امانت موجود ہے علی شاہد جو اس کا محبوب ہے

میر محبوب علی خاں

نظامِ دکن کے مزاج میں پرانے بادشاہوں کی فیاضی موجود تھی

ایک دن دربار میں مولانا گرامی پر ان کی نظر پڑ گئی۔ مولانا گرامی کھوئے کھوئے رہتے تھے یہ سادہ لوح انسان لیکن بہت بڑے شاعر تھے۔ اُن کا ازاربند لٹک رہا تھا۔ حضور نظام کی نظریں ان کے ازاربند پر جو پڑیں تو پیش کار حضوری سے ارشاد ہوا "ذرا گرامی کو تو دیکھو ازار لٹک رہا ہے اور کچھ ہوش نہیں۔"

پیش کار پریشان ہو گیا کہ کہیں مولانا پر کوئی عتاب نازل ہو جائے حاضر دماغ پیش کار نے فوراً بات بنائی۔ عرض کیا "حضور والا! آج کل گرامی بہت پریشان رہتے یہاں جو منصب میں ملتا ہے وہ نوکر چاکر اور گھوڑا گاڑی وغیرہ میں خرچ ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ وطن میں مولانا گرامی کی بہن کی شادی ہونے والی ہے۔ مولانا پنجاب کے رہنے والے ہیں جہاں لڑکیوں کو ٹھوس سونے کے زیور دیئے جاتے ہیں، آج کل گرامی کو یہی فکر ہے کہ بہن کی شادی میں جہیز کا انتظام کیونکر ہو گا۔"

حضور نظام نے حکم دیا۔ "اچھا تو گرامی کو فوراً پانچ سیر سونا عطا کیا جائے۔"

حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔ جب پانچ سیر سونا لے کر پیش کار مولانا گرامی کے گھر پہنچا تو مولانا ہکا بکا رہ گئے اور اس کی تقریب دریافت کی پیش کار نے پورا واقعہ عرض کر دیا۔ سادہ لوح اور بے نیاز مولانا نے پورا قصہ سن کر حیرت سے منہ کھول دیا اور پیش کار کی صورت دیکھتے رہ گئے۔

اور اُس سے شادی کرنے پر آمادہ ہے، وہ علی شاہد کو اتنی آسانی سے کیسے بھول سکتی تھی اور پھر ایک دن تو علی اعجاز آہی گیا جسے ہمیشہ نظر انداز کیا گیا تھا اس کی شد و مد سے خاطر مدارات شروع ہو گئیں۔

ماں نے اعجاز کو مہجبیں کے لیے کس طرح آمادہ کر لیا کچھ پتا نہ چل سکا لیکن جب انہوں نے اس کا ذکر مہجبیں سے کیا تو اُس کے چہرے پر سُرخی آ گئی اُس نے غصّے سے جواب دیا۔ "لیکن امی! آپ اعجاز بھائی کو جانتی ہیں وہ کسی لڑکی کو پسند آ سکتے ہیں!"

ماں نے عاجزی اور غصّے کے ملے جلے انداز میں کہا۔ "اعجاز پسند کس کم بخت کو ہے لیکن تو نے جو گل کھلا رکھا ہے اس کے پیش نظر اعجاز سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا ہمیں اعجاز کو مجبوراً گوارا کرنا پڑ رہا ہے!"

مہجبیں نے شدت جوش میں آنکھیں بند کر لیں، کہنے لگی۔ "امی آپ کیوں میری زندگی جہنم بنانے پر تُلی ہوئی ہیں سُن لیجیے۔ شاہد کے سوا کسی اور سے شادی ہرگز نہ کروں گی چاہے کچھ بھی ہو جائے!"

ماں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "تجھے زمانے کے سرد و گرم سے واسطہ نہیں پڑا ہے جذبات اور ضد کا انجام تو نے دیکھ لیا۔ تیرا باوا اگر تیری یہ لن ترانیاں سُن لے گا تو یاد رکھ وہ عزت دار ہے تجھے جان سے مارنے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔"

مہجبیں سسکیاں لینے لگی۔ "لیکن امی، سارے زمانے نے اعجاز بھائی کو مسترد کر دیا ہے۔ میں اس شکی سے کیسے شادی کرنے پر آمادہ ہو جاؤں گی۔"

ماں نے بھی تڑپتے ہوئے اپنا فیصلہ سُنا دیا۔ "بے وقوف! تجھے نہیں معلوم ہمارے دلوں پر کیا گزر رہی ہے کل علی شاہد تیرے باپ سے ملا تھا اور رشتہ مانگ رہا تھا تیرے باپ نے اُسے جواب دیا کہ اگر انہیں رُسوائی کا خوف نہ ہوتا تو وہ علی شاہد کے خلاف ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتے انہوں نے اُسے دھتکار دیا۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب مہجبیں سے اُس کا رشتہ کسی قیمت پر بھی نہیں ہو سکتا۔" اس کے بعد دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگیں۔ "تیرے باوا کسی طور پر علی شاہد کو برداشت نہیں کر سکتے وہ اسے آوارہ اور بدکردار شخص سمجھتے ہیں، اور کتنے افسوس کی بات ہے کہ لڑکے والوں کو علی شاہد نے خط لکھ کر تیرے خلاف ورغلایا تھا۔"

مہجبیں کو ماں کی آخری بات کا یقین نہیں آیا۔ اُس نے سرکشی کا انداز اختیار کیا، کہنے لگی۔ "علی شاہد ایسا نہیں کر سکتا میں اُس سے پوچھوں گی۔"

ماں غصے سے اکھڑ گئیں۔ "کس طرح پوچھے گی؟ کیا تو یہ سمجھتی ہے کہ میں کوئی دوسری غلطی بھی کروں گی؟ ہرگز نہیں کبھی نہیں۔" اور پھر یہ کہتی ہوئی چلی گئیں کہ ایک ہفتے کے اندر اندر تیرا عقد اعجاز سے کر دیا جائے گا اسی میں تیری بہتری ہے۔"

نگرانی سخت ہو گئی۔ مہجبیں کا دم گھٹنے لگا۔ علی شاہد نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ جب کوئی سہیلی اُس سے ملنے آتی وہ اس سے باتیں کرتے ہوئے اُس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتی رہتی اُس کے ہاتھوں کی حرکت پر غور کرتی رہتی کہ ممکن ہے وہ علی شاہد کا خط لے کر آئی ہو لیکن علی شاہد کا خط نہ آیا۔ گھر میں چپکے چپکے شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور آخر جب اسے یہ اطلاع دے دی گئی کہ آج کے تیسرے دن بروز جمعہ وہ اعجاز سے وابستہ کر دی جائے گی تو وہ سراپا احتجاج بن گئی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کس طرح اس شادی کو رکوا دے آخر کار ایک ترکیب سمجھ میں آ گئی بالکل اس طرح جیسے ابر آلود تاریک رات میں کوئی ستارہ دکھائی دے جاتا ہے۔

ابھی تک وہ اعجاز بھائی کے سامنے خود سے نہیں گئی تھی اُس نے سوچا کہ امی اور ابا نے یقیناً اصل کیفیت سے اعجاز بھائی کو لاعلم رکھا ہو گا اگر انہیں کسی طرح سب کچھ بتا دیا جائے تو وہ شاید حالات مختلف صورت اختیار کر لیں اور زچ ہو کر ابا معاً ہمت پر آمادہ ہو جائیں۔

نعمانی صاحب بیوی کو لے کر سامان کی خریداری کے سلسلے میں بازار گئے ہوئے تھے مہجبیں اپنے کمرے میں ناف تک چادر اوڑھے کسی کتاب کے مطالعے میں منہمک تھی کہ اعجاز پہنچ گیا۔ مہجبیں اُٹھ کر بیٹھ گئی اور ایک طرف سمٹتی ہوئی بولی۔ "آئیے اعجاز بھائی تشریف رکھیے۔"

اعجاز کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پائی جاتی تھی اُس نے مہجبیں کے سراپا کا بغور جائزہ لیا۔ ایک کرسی کھینچ کر فلسفیوں کے انداز میں مہجبیں کے مقابل بیٹھ گیا۔ مہجبیں اُس سے یوں نظریں چرانے لگی جیسے اعجاز اس کی کوئی چوری پکڑ رہا ہو۔

مہجبیں نے اعجاز کی توجہ ہٹانا چاہی۔ "آپ سب لوگوں سے مختلف ہیں میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"اے حیرت ہے!" اُس نے اُلجھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ "دراصل مہجبیں میں بھی اس وقت تم سے کچھ خاص باتیں کرنے آیا ہوں میرا خیال ہے تم میرے ہر سوال کا صاف صاف جواب دو گی۔"

مہجبیں کا حلق خشک ہونے لگا اُسے کانٹے پڑتے محسوس ہوئے "پہلے آپ ہی بتائیے۔"

"چلو یہی سہی۔" شاید اعجاز کو اپنا مافی الضمیر سمجھانے کے لیے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ "مہجبیں، تم جانتی ہو کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ اب یہ خوشخبری سُننے کو ملی ہے کہ پھوپا اور پھوپی جان تمہیں مجھ سے وابستہ کر دینا چاہتے ہیں۔"

کراچی

پریس کلب میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہو رہا تھا۔ مشہور و معروف شعرا ڈائس پر بیٹھے تھے۔ خوش ذوق سامعین کا بڑا اچھا اجتماع تھا۔ خواتین کی تعداد بھی مردوں سے کم نہیں تھی۔ واہ وا، سبحان اللہ اور مختلف قسم کے چُست فقروں سے پنڈال گونج رہا تھا۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے ہوں گے کہ یکایک سامنے کی صفوں سے دس بارہ لڑکیوں کی ایک ٹولی اُٹھی اور مشاعرہ گاہ سے باہر جانے لگی۔ فوراً کسی جانب سے ایک آواز اُبھری۔ "لیجیے شعر سمجھنے والے تو جا رہے ہیں، مشاعرے میں کیا خاک مزہ آئے گا۔"

پھر جھجکتے جھجکتے غلط فہمی کا اظہار کر دیا۔ ہنسنے لگا "کہیں ایسا تو نہیں کہ تم خود مجھے پسند" لیکن وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔

مہ جبیں لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں "نہیں اعجاز بھائی باتیں وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں، میں آپ کی عزت کرتی ہوں۔ میں خود بھی چاہتی تھی کہ کسی طرح آپ سے کچھ باتیں کروں، مجھے بھروسا ہے کہ آپ سنجیدگی اور تحمل سے میری باتیں سُنیں گے۔"

اعجاز اُس کی صورت تکنے لگا۔ وہ کہنے لگی "اعجاز بھائی! آپ آزاد خیال انسان ہیں میرا خیال ہے میری حد درجہ آزاد گفتگو آپ کو صدمہ نہیں پہنچائے گی۔"

"نہیں، تم ہر بات صاف صاف بیان کرو۔ اور مجھ پر اعتماد کرو۔"

مہ جبیں نے کربناک لہجے میں کہا "اعجاز بھائی مجھے آپ اپسند ناپسند دونوں ہی ہیں سچ تو یہ ہے میں نے آپ کے متعلق کبھی اس طرح کی پسندیدگی کے بارے میں نہیں سوچا جو آپ چاہتی ہیں۔ میں ایک شخص علی شاہد سے محبت کرتی ہوں، ابا نے اس مسئلے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے اور میں ان کی انا پر قربان ہونے کو ہرگز تیار نہیں، بات بہت بڑھ گئی ہے، آپ صاف گوئی کو پسند کرتے ہیں تو سنئے، میں آپ سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

اعجاز دم بخود رہ گیا۔

مہ جبیں نے ایک نظر اُٹھا کر اعجاز کے چہرے کے تاثرات پڑھنا چاہے وہ آہستگی سے کہنے لگی "معلوم نہیں آپ کو اس کا علم ہے یا نہیں لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ تاریکی میں نہ رہیں، کیا آپ سب کچھ جاننے کے بعد بھی مجھے قبول کر لیں گے؟"

اعجاز کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ اُبھری "پھوپی جان نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے اور میں اس کے باوجود تمہیں اپنانے کو تیار تھا لیکن اب بات ہی کچھ اور ہو گئی ہے، اب جبکہ تم نے مجھے ناپسند کر دیا ہے میں جبر سے کام نہیں لوں گا۔"

مہ جبیں چکرا گئی اور اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ اعجاز کس قماش کا آدمی ہے، اس شرمناک علم کے بعد بھی وہ اسے اپنانے کو تیار ہے، آخر کیوں؟ کیا اس لیے کہ وہ اپنی آزاد خیالی اور طرزِ فکر کی وجہ سے جو کہ شادی کرنے میں ناکام رہا ہے اس لیے مایوسی کے عالم میں اس متعفن رشتے کو بھی قبول کر لینے پر آمادہ ہو گیا ہے مہ جبیں کے دل میں اُس کے لیے نفرت کے جذبات اُبھرے لیکن اُس نے نرمی سے پوچھا "کیا واقعی آپ میرے معاملے میں حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کریں گے؟"

"بالکل!" اعجاز کھڑا ہو گیا "یہ میرا قطعی فیصلہ ہے مجھ پر اعتماد کر دیں میں تم سے شادی نہیں کروں گا!"

مہ جبیں نے نیم وا آنکھوں سے اعجاز کو دیکھا "آپ انکار کر دیں گے؟"

"ہاں!" اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا کہہ کر؟"

"یہ کہ مہ جبیں مجھے پسند نہیں کرتی اور اس معاملے میں، میں جبر کو پسند نہیں کرتا!"

"نہیں، ایسا نہ کہئیے گا!" مہ جبیں نے کہا "اس طرح تو بات بہت بڑھ جائے گی آپ چپ چاپ کچھ بتائے بغیر یہاں سے چلے جائیے اور گھر پہنچ کر شادی سے انکار کر دیجئے!" اس کے بعد مغموم لہجے میں بولی "میں علی شاہد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، اعجاز بھائی یا تو اسے حاصل کر لوں گی یا پھر اپنی جان دے دوں گی آپ میرے بھائی بھی تو ہیں میری مدد کیجیے۔"

یہ کہتے کہتے اُس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں نم ہو گئیں،

شام کو جب ابا اور امی بازار سے واپس آئے تو انہیں یہ جان کر سخت صدمہ ہوا کہ اعجاز کچھ کہے سُنے بغیر چلا گیا۔ مہ جبیں کی اُلجھن نئے سِرے سے پھر ذہنوں پر مسلط ہو گئی۔ بعد میں جب اعجاز کا چند سطری انکاری خط موصول ہوا تو گھر میں خاموش کہرام برپا ہو گیا۔ اعجاز نے اپنی پھوپی کو لکھا تھا۔

"ایک مجبوری کے تحت میں مہ جبیں سے شادی نہیں کر سکتا، ایسا لکھتے ہوئے میں دُکھ محسوس کر رہا ہوں لیکن مجبور ہوں۔"

ابا اور امی کی نظر میں یہ مجبوری مہ جبیں کے متورم پیٹ کے سوا کچھ اور نہ تھی، نعمانی صاحب چپ چپ رہنے لگے، امی بھی شوہر کی خاموشی سے خوفزدہ تھیں، انہوں نے نعمانی صاحب کو بہت سمجھایا کہ اختر علی شاہد میں بُرائی



بیوی ۔ "میں نے کہا تھا نا کہ زندہ لوٹ کر آؤں گی
تم ماننے پر تیار نہیں تھے ۔"

کیا ہے کیوں نہ لڑکی کی ضد پوری کر دی جائے!

نعمانی صاحب نے جواب دیا "میں اس سے انکار کر چکا ہوں اور اب آمادگی کا اظہار کر کے ذلیل ہونا نہیں چاہتا۔ اتنی بڑی توہین سے میں مرنا بہتر سمجھتا ہوں۔"

امی جل کر کہنے لگیں "کس عذاب میں مبتلا ہو گئے ہیں ہم، یہاں عزت آبرو پر بنی ہوئی ہے اور آپ ہیں کہ انا اور توہین کو لیے پھر رہے ہیں آپ کی یہ انا ذلت، رسوائی لا کے رہے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ ذلت اور رسوائی کے ساتھ خون خرابہ بھی ہو جائے۔ خدا کے لیے آپ خود کو قابو میں رکھیے۔"

نعمانی صاحب نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا جیسے سر میں درد ہو رہا ہو "پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

امی نے جواب دیا "یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہماری ایک نوجوان لڑکی ہے میری مانیے کسی بھی طرح شاہد کو راضی کر لیجیے، مصلحت کا تقاضا یہی ہے۔"

نعمانی صاحب نے کہا "یہ ہمارے بس کی بات نہیں رہی تھی کو کچھ کرنا پڑے گا!" انہوں نے معنی خیز نظروں سے بیوی کو دیکھا۔

بیگم نے اصل مفہوم پا لیا اور کہنے لگیں "کل جب آپ چلے جائیں گے تو میں مہ جبیں کو شاہد کے پاس بھیج کر معاملات طے کر لوں گی، اب اس کے سوا کوئی صورت باقی نہیں رہی۔"

نعمانی صاحب نے اس تجویز پر اپنے کان بند کر لیے، انہیں اس جملے سے شدید اذیت پہنچی تھی مگر اب رسوائی سے بچنے کا اس سے اچھا طریقہ بھی نہ تھا کہنے لگے "بڑی زہریلی باتیں کر رہی ہو لیکن ہم خود اس شادی میں شریک نہ ہوں گے!"

"وہ کیوں؟" بیوی نے حیرت سے سوال کیا۔

"کون اس شادی میں شریک ہو سکتا ہے، میں تو سرِ عام لٹ گیا ہوں، اب قوت برداشت ختم ہو گئی، اب اور تماشا نہیں دیکھا جائے گا۔"

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ بیٹی کی شادی میں باپ شریک نہ ہو، اگر تم شریک نہ ہو گے تو پھر اس بات کا آگے بڑھانا ہی فضول ہے، اب اتنے جذباتی بھی نہ بنیے۔"

نعمانی صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے وہ زندگی میں بہت کم روئے تھے رقت آمیز آواز میں بولے "بیگم اب جو تمہارا جی چاہے کرو۔ تم ہی بات آگے بڑھاؤ۔ اب جو ہو گا دیکھا جائے گا، میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں، تم ان دونوں کو قتل کرنے کی اجازت مجھے دے دو۔"

بیوی نے کہا "ہوش کی باتیں کرو، تمہیں مہ جبیں کی شادی اپنے ہاتھوں کرنا ہو گی۔"

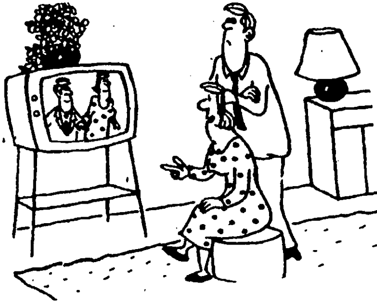
اس کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں "یقیناً خدا کی کوئی آزمائش ہے۔"

پھر انہوں نے نرمی اور محبت سے مہ جبیں کو اجازت دے دی، اسے ہدایت کی "تو علی شاہد کے پاس جا اور اس سے کہہ کہ وہ براہ راست مجھ سے بات کرے۔ اب اپنے باپ کو بیچ میں لانے کی کوئی ضرورت نہیں، اولاد کا جو درد ماں کو ہو گا وہ باپ کو نہیں ہو سکتا۔"

مہ جبیں کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ امی نے جو کچھ کہا تھا اس میں مادرانہ محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس کے انگ انگ میں خوشیاں بھر گئیں لیکن اس کا دل شکایتوں سے لبریز تھا اس نے سوچا کہ وہ پہلے تو علی شاہد کو خوب خوب ستائے گی، مایوسی کی باتیں کر کے اسے جلائے گی۔ اور اس سے شکوے کرے گی کہ اس نے خط کا جواب کیوں نہیں دیا اور یہ بھی پوچھے گی کہ اس نے مہ جبیں کے امید وار گھرانے کو خط لکھ کر اسے رسوا کیوں کیا؟

علی شاہد کے پی اے نے مہ جبیں کو کمرے میں بٹھا دیا۔ علی شاہد ابھی تک دفتر نہیں پہنچا تھا۔ تقریباً پون گھنٹے انتظار کے بعد جب علی شاہد کمرے میں داخل ہوا تو خلاف امید مہ جبیں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے معنی خیز مسکراہٹ سے مہ جبیں کی طرف دیکھا اور دریافت کیا "خیریت؟ کیسے آنا ہوا مہ جبیں؟"

* *



مٹا کی بیوی: "یہ فلم دس سال پرانی معلوم ہوتی ہے
کیونکہ لباس بالکل میری طرح کا ہے"۔

* *

شاہد کے لہجے میں مغائرت اور اجنبیت کی بو تھی وہ جو سوچ کر گئی تھی اس نے اداسی سے شکوہ کیا۔ "تم نے میرے خط کا جواب تک نہیں دیا۔ کیوں؟ مجھے تم سے اس کی توقع قطعاً نہیں تھی۔"

شاہد نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو دو کولڈ ڈرنک لانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد طنزیہ بولا۔ "کیا کرتا جواب دے کر تمہارے باپ نے کونسی کسر چھوڑ دی ہے انہوں نے جیسی بے عزتی میری کی ہے میں اسے زندگی بھر نہیں بھولوں گا!"

"اور تم نے میرے ہونے والے منگیتر کے گھر بھی خط لکھ مارا۔ آخر یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے"

شاہد نے ٹھہرے ہوئے غیر جذباتی لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا۔ نعمانی صاحب نے میری توہین کی تھی، توہین کا میں اسی طرح انتقام لے سکتا تھا!"

مہ جبیں کے وجود میں آگ سی لگ گئی۔ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ اس نے فیصلہ کن لہجے میں دریافت کیا۔ "انتقام تو لے چکے مگر اب کیا ارادے ہیں میرے پاس وقت بہت کم ہے بڑی مشکل سے تمہارے پاس پہنچ سکی ہوں"

شاہد نے کچھ بے تعلقی سے جواب دیا۔ "کیسے ارادے؟"

مہ جبیں نے بڑی دقت سے کہا۔ "شادی کے سلسلے میں۔"

شاہد نے پشت کرسی سے ٹکا لی اور تقریباً جھومنے لگا۔ "مہ جبیں تمہارے خوددار اور غیور باپ، نعمانی صاحب نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ یہ شادی ہرگز نہیں ہونے دیں گے!"

مہ جبیں نے کہا۔ "لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے عشق خود اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔ ہم دونوں نے تو عہد و پیمان کر رکھے ہیں، ہمیں ان رکاوٹوں سے کیا غرض ہے۔ تم اتنے کم حوصلہ کیسے ہو گئے؟"

"ہونہہ کم حوصلہ۔ کیا عشق کا انجام شادی ہے؟" شاہد آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔ "جب باپ ہی بیٹی کی شادی پر رضامند نہ ہو تو یہ کس طرح ہو گی۔"

مہ جبیں اس کی بے نیازی اور تلخ نوائی پر کھول رہی تھی۔ "لیکن ہم دونوں تو پہلے ہی یہ عہد کر چکے ہیں کہ اگر ابا جان اس رشتے پر آمادہ نہ ہوتے تو ہم بلوغ کا حق کام میں لائیں گے عشق کا انجام شادی نہیں تو پھر موت ہے، تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو شاہد۔"

"یہ ساری جذباتی باتیں ہیں!" شاہد نے کہا۔ "اگر ہم دونوں نے جذبات میں آ کر شادی کر بھی لی تو تنازعے کا یہ رشتہ ہمیں زندگی بھر پریشان کرتا رہے گا"

کولڈ ڈرنک آ چکا تھا۔ شاہد نے چپراسی سے بوتل لے کر اپنے ہاتھ سے مہ جبیں کو پیش کی لیکن مہ جبیں نے نہیں لی، شاہد نے بوتل میز پر اس کے سامنے رکھ دی۔

مہ جبیں کی مغموم آواز ابھری۔ "میں تمہارے پاس یہ خوش خبری لے کر آئی تھی کہ امی نے تمہیں پسند کر لیا ہے وہ کہتی ہیں کہ اس رشتے کے سلسلے میں علی شاہ کو میرے پاس بھیجو۔ ابا سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

شاہد نے اسٹرا سے چسکی لیتے ہوئے کہا۔ "مہ جبیں! تمہیں میری باتیں بری لگیں گی۔ عشق اپنی جگہ ہے اور انا اپنی جگہ، بات انا کی ہو گئی ہے نعمانی صاحب نے میری بے عزتی کی ہے۔ میں نے تمہاری خاطر یہ ذلت گوارا کر لی لیکن اب مزید برداشت کی ہمت مجھ میں نہیں ہے اگر تمہارے گھر والے واقعی تمہیں مجھ سے منسوب کر دینے پر آمادہ ہو گئے ہیں تو اس سلسلے میں ضروری ہے کہ نعمانی صاحب خود میرے پاس تشریف لائیں اور مجھ سے معذرت خواہانہ انداز میں درخواست کریں کہ میں ان کی بیٹی قبول کر لوں۔ اس کے بعد میں غور کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے!"

مہ جبیں نے غصے میں ہاتھ سے بوتل گرا دی۔ "تم کتنے کمینے نکلے، تم اندر سے اتنے زہریلے ہو، اتنے خبیث ہو، یہ مجھے نہیں معلوم تھا تم نے مجھے کہیں کا بھی نہ رکھا۔" اس کے منہ میں جو بھی آیا سناتی رہی۔ اس کا بدن غصے سے کپکپا رہا تھا اور الفاظ بے ربطی سے نکل رہے تھے۔ علی شاہد نے ڈسٹر سے میز پونچھی اور کہنے لگا۔

"مہ جبیں! آخر اتنے اشتعال کی وجہ؟ میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا اس میں تنہا میری خوشی شامل نہ تھی جتنا میں لطف اندوز ہوا۔ اتنی ہی لذت تم نے بھی حاصل کی ہو گی پھر اس میں تم مجھی کو گناہگار کیوں قرار دیتی ہو!"

مہ جبیں نے گلوگرفتہ آواز میں کہا۔ "لیکن اس وقت تو تم نے یہ نہیں کہا تھا!"

"یہ کہنے کی بات ہی کب ہے۔ یہ تو محسوس کرنے کی بات ہے!"

"لیکن تم نے تو بہت کچھ کہا تھا۔ کہا تھا کہ اگر یہ لغزش پکڑی گئی اور مجھے کچھ ہو گیا تو تم میرا پوری طرح ساتھ دو گے!"

"ہاں یہ میں نے بے شک کہا تھا۔ اور میں نے اپنی جیسی کوشش بھی کر لی۔ میں اب بھی تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں لیکن اس کی یہی ایک معمولی سی شرط ہے کہ اس سلسلے میں نعمانی صاحب خود تشریف لائیں اور مجھ سے دست بستہ درخواست کریں۔"

"ایسا کبھی نہ ہوگا۔" مہ جبیں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "میں خودکشی کر لوں گی لیکن ابا کو تمہارے سامنے ذلیل نہیں ہونے دوں گی!"

"اس میں ذلت کی کیا بات ہے میری بھولی گڑیا!" علی شاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب ایسا بھی نہیں کہ تم میرے مزاج سے ناواقف ہو۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں ایک حد تک برداشت کرنے کا عادی ہوں ویسے بڑا منتقم مزاج واقع ہوا ہوں یقین کرو میرے انتقام کی آگ اس وقت تک نہیں بجھے گی جب تک نعمانی صاحب کو اپنے روبرو گڑگڑاتا ہوا نہ دیکھ لوں گا۔"

"یہ کبھی نہیں ہوگا!" مہ جبیں نے غصے میں کہا۔ "اب اگر ابا جان تم سے شادی کر دینے پر آمادہ ہو گئے تو میں انکار کر دوں گی۔"

اور وہ پیر پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔



مہ جبیں نے ماں کے سینے پر سر رکھ دیا اور سسک سسک کر رونے لگی، ماں نے گھبرا گھبرا کے بہت سارے سوالات کر ڈالے لیکن مہ جبیں نے ہر سوال کا جواب سسکیوں میں دیا۔ آخر ماں کو یہ سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ بات بنی نہیں ان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ انہوں نے درشت لہجے میں پوچھا "آخر تو کسی بات کا جواب کیوں نہیں دیتی، تو نے تو سارے گھر کو ہلکان کر کے رکھ دیا ہے۔ آخر ہوا کیا؟ بتاتی کیوں نہیں؟"

"امی مجھے کچھ دنوں کے لیے اعجاز بھائی کے گھر بھیج دیجیے۔ میں اس زندگی سے عاجز آ گئی ہوں!" وہ بدستور سسکیاں لے رہی تھی۔

ماں نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ "آخر تو بتاتی کیوں نہیں کہ علی شاہد نے کیا جواب دیا؟"

مہ جبیں نے رو رو کر سب کچھ بتا دیا۔ ماں کے ضبط کا بند بھی ٹوٹ گیا۔ انہوں نے غصے میں دو تین تھپڑ رسید کر دیے اور کوسنے لگیں "مہ جبیں تو پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گئی، اب کیا ہوگا خدا ہی بہتر جانتا ہے!"

مہ جبیں نے پھر درخواست کی۔ "امی مجھے اعجاز بھائی کے پاس بھیج دو کچھ دنوں کے لیے!"

ماں نے جل کر جواب دیا۔ "علی شاہد کے جادو نے تیری عقل چھین لی ہے تجھے نہیں معلوم کہ اعجاز نے بھی تجھے ٹھکرا دیا ہے" پھر ٹھنڈی سانس لے کر کہنے لگیں۔ "اور سچ ہے کسی کا گناہ کوئی کیوں گوارا کرے۔"

لیکن مہ جبیں یہی کہتی رہی کہ "مجھے اعجاز بھائی کے پاس بھیج دو میں گناہگار ہوں اب کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں ہوں میں خود ہی اس مسئلے کا کوئی حل نکالوں گی۔"

ماں چپ ہو گئیں لیکن ان کا دل روتا رہا۔ رات کو جب نعمانی صاحب کو ساری بات معلوم ہوئی تو ان پر جذباتی دباؤ کا دورہ پڑا اور وہ پھٹ پڑے دیر تک مہ جبیں اور علی شاہد کو برا بھلا کہتے رہے وہ دونوں کو قتل کر دینا چاہتے تھے لیکن بیوی نے یہ کہہ کر ان کا جوش ختم کر دیا کہ ابھی بات زیادہ نہیں بگڑی ہے ابھی وقت بہت کم گزرا ہے اس موقع پر کچھ کیا جا سکتا ہے ورنہ ہر آنے والا دن رسوائی اور ذلت کو قریب کر دے گا ان ہولناکیوں سے بچنے کے لیے ابھی سے کچھ کیا جائے کیونکہ مہ جبیں کو کچھ دنوں کے لیے اعجاز کے پاس چھوڑ دیا جائے ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے ساتھ ساتھ رہنے سے آپس میں محبت پیدا ہو جائے۔

نعمانی صاحب کیا کرتے چار و ناچار انہوں نے اپنا حکم سنا دیا۔ "بھیج دو اس ناہنجار کو اعجاز کے پاس اور کچھ دنوں کے لیے تم بھی وہیں رہ جاؤ اگر اعجاز راضی ہو جائے تو مجھے اطلاع دیے بغیر قاضی کو بلا کر چپ چاپ دونوں کا نکاح پڑھا دینا اور اگر یہ دیکھو کہ اعجاز راضی نہیں ہوتا تو کسی طرح مہ جبیں کو زہر دے کر ٹھکانے لگا دینا اور مجھے مطلع کر دینا میں آ کر سب ٹھیک کر لوں گا!"

وہ رونے لگیں انہوں نے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کے گوشے خشک کیے اور لرزتی ہوئی آواز میں بولیں "میں نے اسی دن کے لیے تو پالا تھا اپنی بچی کو کہ جب جوان ہو جائے۔ تو خود ہی سنکھیا کھلا کر ٹھکانے لگا دوں۔" پھر ایک دم مشتعل ہو گئیں "تم باپ ہو مگر تمہارے سینے میں دل نہیں پتھر کا ٹکڑا رکھا ہے شاید لیکن میں ماں ہوں"

نعمانی صاحب نے غصے میں کہا۔ "تمہارے لاڈ پیار ہی نے تو نوبت یہاں تک پہنچائی ہے۔ یہ میرا فیصلہ ہے کہ اگر تم نے اس نامشدنی کو زہر نہ دیا تو میں اس کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دوں گا۔"

ماں مہ جبیں کو لے کر اعجاز کے پاس چلی گئیں۔ وہ ان دونوں کی اچانک آمد سے کسی سوچ میں پڑ گیا۔ کئی دن تک دونوں طرف خاموشی رہی

ماں مہ جبیں کا ذکر چھیڑنے گھبرا رہی تھیں اور اعجاز خود سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مہ جبیں موقع کی تلاش میں تھی ویسے اعجاز کا رویہ مغائرانہ تھا۔ وہ مہ جبیں سے کھنچا کھنچا رہتا تھا۔ مہ جبیں کو پہلے یہ اعتماد تھا کہ وہ اعجاز کو آسانی سے رضامند کرے گی لیکن یہاں حالات بڑے حوصلہ شکن تھے ویسے وہ خودکشی کو کوئی مشکل کام نہیں سمجھتی تھی لیکن زندہ رہ کر علی شاہد سے انتقام لینے کی خواہش ضرور رکھتی تھی اس نے سوچا تھا کہ اگر اعجاز نے اس سے شادی کرلی تو وہ اس کے ساتھ ہشاش بشاش طریقے سے زندگی گزارے گی اور ماضی کو بھلانے کی کوشش کرے گی اور علی شاہد کو یہ دکھائے گی کہ اس نے اس کے ساتھ فریب کرکے ایک اچھی لڑکی کو کھو دیا اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ اب کتنی خوش ہے وہ علی شاہد کو جلانا چاہتی تھی۔

ایک دن اعجاز بڑے موڈ میں تھا کالج سے خوش خوش آیا پھوپی جان کہیں پڑوس میں گئی تھیں اس نے مہ جبیں سے دریافت کیا۔ ”ارے مہ جبیں تمہارے مسئلے کا کیا ہوا؟ تم نے کچھ بتایا ہی نہیں!“

مہ جبیں کو اسی موقعے کا انتظار تھا اس نے مایوسی سے جواب دیا ”اعجاز بھائی! شاہد تو بڑا دھوکے باز نکلا۔“

”کیوں کیا اس نے شادی سے انکار کردیا؟“

”ہاں!“ اس کے بعد پوری روداد سچ سچ بتادی کہنے لگی۔ ”اب آپ ہی بتایئے اعجاز بھائی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”ہوں!“ اعجاز کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ ”ویسے یہ کوئی اتنا سنگین مسئلہ نہیں ہے جس کے لیے آدمی اپنی جان ہلکان کرے ایسی باتیں ایک زمانے سے عام ہیں۔“

مہ جبیں اس کی صورت تکنے لگی۔ اعجاز کہنے لگا۔ ”یہ تو محض سوسائٹی کی بات ہے کہ اس نے چند چیزوں کو اچھا چند کو برا سمجھ لیا ہے، ہماری سوسائٹی اسے برا سمجھتی ہے ورنہ بات اتنی زیادہ بری نہیں ہے بات صرف اتنی سی ہے کہ تم دونوں میں ایک معاہدہ ہونے والا تھا معاملہ ذرا آگے بڑھ گیا تھا تم دونوں میں سے کسی ایک نے ہونے والا معاہدہ پکا کرنے کے لیے کچھ بیعانہ دے دیا لیکن پھر معاہدہ نہ ہوسکا اور بات ختم ہوگئی، رہا بیعانے کی واپسی کا مسئلہ تو اس کی واپسی چونکہ ممکن نہیں ہے اس لیے دونوں ہی مجبور ہوجاتے ہیں!“

مہ جبیں کو اعجاز کی یہ باتیں کچھ عجیب سی لگیں اور اسے تشفی بھی ہوئی اس نے پوچھا۔ ”اب میں کیا کرنا چاہیئے اعجاز بھائی؟ آپ ہی کوئی مشورہ دیجئے“

اعجاز نے غیر جذباتی انداز میں مہ جبیں کو گھورا اور پوچھا۔ ”پہلے یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتی ہو؟“

مہ جبیں نے جواب دیا۔ ”میں اس سے انتقام لینا چاہتی ہوں!“

”وہ کس طرح؟“

”کسی سے شادی کرکے جب میں اپنے شوہر کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزاروں گی اور یہ بات اس کے سامنے آئے گی تو اس کا خون کھولنے اور نادم کرنے کے لیے بہت ہوگی۔“

”بچپنا!“ اعجاز ہنسنے لگا۔ ”وہ نادم نہیں ہوگا بلکہ ایسے موقعوں پر تم خود جلنے لگوگی!“

”وہ کیسے؟“

”شادی کے بعد تم جب بھی علی شاہد کو دیکھوگی تو یہ یاد کرکے کڑھنے لگوگی کہ اس نے کبھی تمہیں ٹھکرادیا تھا۔ تمہاری ذلت اور رسوائی کا سامان کردیا تھا“

مہ جبیں کو یہ بات تسلیم کرنا پڑی اس نے پوچھا۔ ”پھر مجھے کیا کرنا چاہیئے؟“

اعجاز نے جواب دیا۔ ”تمہیں کیا کرنا چاہیئے۔ سارے فیصلے تمہیں کرنا ہیں!“

مہ جبیں نے نظریں جھکاکر کہا۔ ”اعجاز بھائی میں بہت مجبور ہوگئی ہوں ورنہ میں اب شادی کا خیال تک دل میں نہ لاتی۔“

”پھر تم کیا چاہتی ہو، ذرا صاف صاف بتاؤ!“

مہ جبیں نے بے تکلفی سے کہہ دیا۔ ”میں شادی کرنا چاہتی ہوں تاکہ اپنے گناہ کی پردہ پوشی کرسکوں۔“

اعجاز کھل کھلا کر ہنسنے لگا۔ ”گناہ ثواب یہ ساری اضافی چیزیں ہیں مہ جبیں! کیا گناہ ہے اور کیا ثواب! اس کا صحیح علم کسی کو بھی نہیں، پچاس سال پہلے جو چیز گناہ تھی اب ثواب بن گئی ہے اور جو ثواب تھی گناہ ہوگئی، یہ بڑی فضول بحث ہے اس میں سر کھپانے سے فائدہ؟ میرا خیال ہے میں تمہیں سماجیات پڑھاؤں۔“

مہ جبیں ایک ہی بات کہتی رہی۔ ”میں شادی کرنا چاہتی ہوں اعجاز بھائی۔“

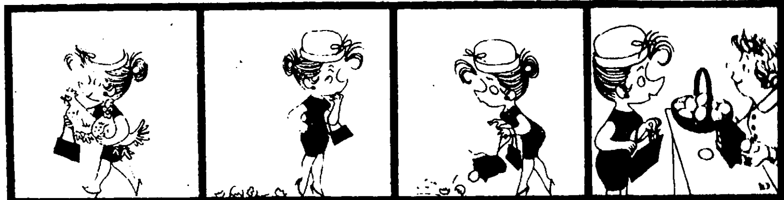
”پھر کرلو شادی، منع کون کرتا ہے تمہیں!“

مہ جبیں نے مایوسی سے جواب دیا۔ ”مگر مجھ سے شادی اب کرے گا کون؟“

اعجاز نے جواب دیا۔ ”تم نے مجھے تو ناپسند ہی کردیا تھا ورنہ میں تو پہلے ہی تیار تھا۔“

مہ جبیں نے شرما کر آہستہ سے پوچھا۔ ”وہ میری غلطی تھی لیکن کیا اب بھی آپ تیار ہیں مجھے اپنانے کے لیے؟“

”پھر وہی الجھاوے کی بات!“ وہ کہنے لگا۔ ”میرے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے جو پہلے تھا وہی اب بھی ہوں، میری دوری اور قربت میں تمہاری پسند اور ناپسند کو دخل ہے!“



مہ جبیں کا دل بھر آیا۔ دوپٹے کا آنچل آنکھ پر رکھ کر بولی "اگر آپ نے مجھے قبول کر لیا تو میں خود کو بڑا خوش قسمت سمجھوں گی!"

اعجاز نے اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور جھجکتے جھجکتے اُس کے بالوں کو پیار کر لیا۔

ماں کو زہر نہیں دینا پڑا۔ نہایت سادگی سے شادی کی رسم انجام پا گئی۔ نعمانی صاحب اس میں نہیں شریک ہوئے۔ کچھ دنوں تک ماں بھی ساتھ ہی رہیں اس کے بعد اطمینان کی سانس لے کر واپس چلی گئیں۔

کچھ ہی عرصے بعد دونوں گھروں کو نئی افسوسناک صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ نعمانی صاحب اعجاز کو بحیثیت داماد متعارف کراتے ہیں شرم محسوس کرتے تھے اور اعجاز ان کے اس رویے سے اپنی ہتک محسوس کرتا تھا آہستہ آہستہ یہ باتیں بڑھتی رہیں اور جانبین میں کھنچاؤ پیدا ہو گیا۔ اسی طرح جب شاہد شادی کرنے پر آمادہ ہوا تھا تو مہ جبیں نے بے پناہ خوشی محسوس کی تھی، جب وہ دونوں رشتہ ازدواج سے منسلک ہو گئے تو مہ جبیں کو ایسا لگا تھا جیسے اس کے سر سے بڑا بوجھ اُتر گیا اور اس نے اعجاز کی مدد سے شاہد کی سازش ناکام بنا دی ہے اس کا دل اعجاز کے لیے جذبۂ احترام رکھتا تھا وہ ایک عالی ظرف اور مثالی شوہر ثابت ہوا لیکن جب ساتھ رہتے رہتے اسے یکساں زندگی گزارنی پڑی تو طبیعت پر کچھ اُداسی غالب آ گئی۔ چڑچڑا پن پیدا ہو گیا۔ اعجاز کی آمدنی بھی کم تھی ہر ماہ صرف ساڑھے تین سو روپوں میں محتاط بجٹ بنانا اور بندھے ٹکے انداز میں شب و روز گزارنا اس کے لیے سوہان روح ہو گیا۔ نعمانی صاحب تو جیسے شادی کر کے بے نیاز ہو گئے تھے اور انہوں نے مہ جبیں کو اپنے کنبے سے گویا خارج کر دیا تھا وہ ایک گھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ اعجاز اُس کی اداسی اور چڑچڑے پن سے یہ سمجھنے لگا تھا کہ بچے کی پیدائش کا زمانہ جیسے جیسے قریب آ رہا ہے ویسے ویسے آنے والی گھڑی کے خطرات اسے خوفزدہ اور پریشان کر رہے ہیں۔ مہ جبیں یہاں تک اداس اور مایوس ہوئی کہ ذرا ذرا سی بات پر اعجاز سے جھگڑنے لگتی۔ اب اسے اعجاز بد وضع اور پھیکی شخصیت نظر آتا تھا۔ اس نے تقریبات میں شرکت کا خیال تک دل سے یوں نکال دیا تھا کہ اسے اعجاز کو شوہر کی حیثیت سے ساتھ لے جانے میں سبکی اور خفت محسوس ہوتی۔ اعجاز اُس کی ذہنی کشمکش اور گریز کو محسوس کرنے لگا تھا اور مہ جبیں کا چڑچڑا پن اس لیے گوارا کر لیتا تھا کہ وہ ابھی ناتجربہ کار ہے ———— بچہ پیدا ہوا وہ ہو بہو علی شاہد تھا۔ مہ جبیں نے اُسے دیکھا تو دل میں ایک کانٹا سا چبھنے لگا۔ "کیا اعجاز! اُس سے نفرت نہیں کرے گا؟" لیکن مہ جبیں ایسا سوچتے وقت یہ بھول گئی تھی کہ اعجاز نے علی شاہد کو دیکھا تک نہیں ہے، بچہ پرورش پانے لگا اور اعجاز اُس پر اتنا ہی مفتون نظر آتا جتنا وہ اپنے بچے کا والہ و شیدا ہو سکتا تھا۔

اس دوران اُسے ایک نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ آس پاس کی حاسد اور بالونی عورتیں آتیں تو عجیب و غریب دل دُکھانے والی باتیں کر کے چلی جاتیں وہ مہ جبیں سے پوچھتیں: "کیوں بیٹی! آخر تیرے ابا کو تجھ سے کیا دشمنی تھی جو تیرا پلّو اس بوڑھے کے دامن سے باندھ دیا!"

کسی نے یہاں تک طنز کیا کہ اعجاز کو مہ جبیں کا باپ کہہ دیا۔ وہ سارے تیر و نشتر برداشت کرتی رہی اور تنہائی میں آنسو بہاتی رہی۔ وہ سوچتی کاش اُس نے علی شاہد سے محبت نہ کی ہوتی۔ اُس نے سوچا ابا جان کو بات اتنی نہیں بڑھانی چاہیے تھی وہ لڑکی کے باپ تھے لڑکی کے باپ میں انا کب ہوتی ہے انہیں شاہد سے معافی مانگ لینی چاہیے تھی، انا کی سزا مہ جبیں کو جھیلنی پڑی اُسے شاہد معصوم اور بے گناہ نظر آیا اور اپنے باپ نعمانی کو خطا کار اور ضدی سمجھنے لگی اُس نے شاہد کے لیے سوچا اور بڑی شدت سے سوچا۔ یقیناً اسے یہی موقف اختیار کرنا چاہیے تھا۔ وہ مرد ہے غیرت مند مرد، اُس کے باپ کو اس غیرت مند نوجوان کی عزت کرنی چاہیے تھی، انہوں نے اس کا ہاتھ ایک بوڑھے کے ہاتھ میں دے دیا جو صریحاً ظلم اور ناانصافی ہے۔ وہ شب و روز یہی کچھ سوچتی رہتی۔

پیٹ بڑا ہو رہا تھا اور مہ جبیں ان اُلجھنوں میں مبتلا ہو کر اپنے باپ نعمانی اور شوہر اعجاز سے متنفر ہوتی جا رہی تھی اور یہ نفرت اُس وقت بڑی شدت سے اُبھرتی جب مہ جبیں کو آس پاس کی کسی تقریب میں جانا ہوتا اور معمولی لین دین تحائف کے لیے اُس کے پاس زیادہ پیسے نہ ہوتے اور اعجاز کو ساتھ لے جانے میں شرم محسوس ہوتی، ایسے موقعوں پر اُس کی اعجاز سے تو تو میں میں بھی

رونے لگی وہ آنسو بہا کر کہتی "تم سے کیا گلہ، ابا جان اگر بے حس اور ظالم نہ ہوتے تو مجھے یہ بُرے دن نہ دیکھنے پڑتے۔"

اعجاز پوچھتا "تمہیں کون سے بُرے دن دیکھنا پڑے ہیں تو تمہی میں ڈوب گیا ہوں!"

مہ جبیں جواب دیتی "جب آپ کی آمدنی زیادہ نہیں تھی اور خاصی عمر گزار چکے تھے تو آپ کو شادی کا نام بھی نہیں لینا چاہیئے تھا۔"

اعجاز جذباتی ہو گیا "شادی کا نام میں نے نہیں تم نے لیا تھا مہ جبیں! اب میں کیا کروں، ورنہ اگر میں صاف گوئی پر اتر آیا تو تمہیں بڑی تکلیف پہنچے گی۔"

مہ جبیں کی زبان چلتی رہی "میں اس گھر سے اکتا گئی ہوں!"

"تو اپنے ابا کے پاس چلی جاؤ!"

"وہ بلاتے ہی نہیں!" مہ جبیں رونے لگی۔

اعجاز نے اُسے اپنی آغوش میں لے کر پے در پے کئی بوسے لیے بولا "تمہاری شکایات بجا ہیں مہ جبیں میں خود یہ محسوس کرتا ہوں کہ ماحول کی یکسانی نے تمہیں چڑچڑا اور پریشان کر دیا ہے، ابا جان تمہیں بُلائیں یا نہ بلائیں تمہیں خود سے چلا جانا چاہیئے۔ وہ تمہارے باپ کا گھر ہے چلو میں کل ہی تمہیں پہنچائے دیتا ہوں پھر جب تم کہو گی لینے آجاؤں گا!"

اور دوسرے ہی دن اعجاز نے مہ جبیں کو نعمانی صاحب کے پاس پہنچا دیا وہاں کسی نے ان تینوں کا گرمجوشی سے استقبال نہیں کیا۔ امّی تو انہیں دیکھ کر مسکرائیں بھی لیکن نعمانی صاحب تو سامنے تک نہ آئے اور انہوں نے بیوی کو منع کر دیا کہ مہ جبیں اور اُس کے بچے کو ان کے سامنے نہ آنے دیا جائے۔

امّی کا رویہ بھی بچے کے حق میں معاندانہ تھا انہوں نے اُسے گود میں بھی نہیں لیا۔ مہ جبیں دو دن میں عاجز آگئی اور اُس نے اعجاز سے کہا کہ وہ بھی ساتھ ہی واپس چلے گی۔ اعجاز مہ جبیں کے والدین کا معاندانہ سلوک دیکھ کر مہ جبیں کو ساتھ ہی واپس لے گیا۔ اب پھر وہی گھر تھا اور اُکھڑی اُکھڑی کھوئی کھوئی چڑچڑی اُداس مہ جبیں تھی، اعجاز سے تلخ کلامیاں پھر شروع ہو گئیں، معلوم نہیں کیوں اُس کے دل میں یہ وہم بیٹھ گیا تھا کہ اعجاز اُس کے بچے سے دکھاوے کی محبت کرتا ہے۔ پھر جب دوسرا بچہ بھی ہو گیا تو مہ جبیں کو شدت سے یہ خدشہ محسوس ہونے لگا کہ اب اعجاز پہلے بچے کو نظرانداز کر دے گا اور اپنے پیار کی شدت اپنے بچے کے لیے وقف کر دے گا۔ اعجاز مہ جبیں کے احساسات سے واقف تھا اور نہایت احتیاط سے پیش آرہا تھا۔ مگر کم آمدنی کی وجہ سے ہونے والی اُداسی دور کرنا اُس کے بس میں نہ تھا۔

ایک روز کسی بات پر مہ جبیں گرم ہو گئی "بس آپ بچے پیدا کیئے جائیں آمدنی نہ بڑھائیں میں کہتی ہوں ان کا مستقبل کس طرح سُدھرے گا آخر؟"

اعجاز نے اب تک بڑے صبر سے کام لیا تھا لیکن یہ جملہ نشتر بن کر اُس کے سینے میں اُتر گیا کہنے لگا "بچے پیدا کرنے کا الزام مجھے نہ دو، میرا صرف ایک بچہ ہے!"

مہ جبیں کو ایسا لگا جیسے کسی نے سوتے میں اُس کا منہ کچل دیا ہو وہ شیرنی کی طرح بھر پڑی "مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ آپ میرے پہلے بچے کو اپنا نہیں سمجھتے" وہ رونے لگی "اگر آپ اسے پسند نہیں کرتے تو میں اسے لے کر کہیں اور چلی جاؤں گی میں طعنے ہرگز نہیں سنوں گی۔"

اس نے طیش میں آکر اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ اعجاز دور کھڑا گھورتا رہا۔ مہ جبیں نے اپنے کپڑے سوٹ کیس میں رکھے اور زیورات کا بکس کھول کر کچھ سوچنے لگی۔

اعجاز کو اس نیم پاگل لڑکی پر غصہ آرہا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور سوٹ کیس کھینچ کر اپنے قابو میں کیا "مہ جبیں پاگل مت ہو کہاں جاؤ گی؟"

مہ جبیں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے ڈبڈبائی نظروں سے اعجاز کی طرف دیکھا اور پھر اس سے چمٹ گئی "میں کہاں جا سکتی ہوں میرا ٹھکانا ہی کہاں ہے اس گھر کے سوا" وہ اعجاز کے سینے سے لگ کر دیر تک سسکتی رہی۔

اعجاز نے آمدنی بڑھانے کے لیے کچھ ٹیوشنز کر لیے تھے، ان ٹیوشنوں سے جب پہلی بار اُسے دو سو روپے ملے تو وہ مہ جبیں کو بازار لے گیا۔ دونوں دیر تک کپڑے کی دکانیں دیکھتے رہے بڑا بچہ اعجاز کی گود میں تھا اور چھوٹا بچہ مہ جبیں کے پاس ایک دکان سے کپڑا خریدنے کے دوران بڑا بچہ شربت کی ضد کرنے لگا۔ اعجاز نے مہ جبیں کو دکان پر ہی چھوڑا اور بچے کو شربت پلانے کے لیے ایک ہوٹل میں چلا گیا۔ اعجاز نظروں سے اوجھل ہوا تو ایک خوش پوش نوجوان مہ جبیں کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا "مہ جبیں!" یہ علی شاہد کی آواز تھی۔

وہ چونک پڑی اور جیسے ہی نظریں ملیں، مہ جبیں کے ہاتھ سے پرس چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ علی شاہد نے پھر مخاطب کیا "مہ جبیں! ایک بات بتا دو، وہ بچہ بڑا بچہ بھی تمہارا ہی ہے نا؟"

مہ جبیں نے دکاندار سے دریافت کیا "کتنے پیسے ہوئے؟"

دکاندار نے کپڑوں کا بل دیا، پرس سے روپے نکالتے وقت اُس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

اتنے میں ہوٹل سے اعجاز نمودار ہوا شاہد وہاں سے ہٹ گیا۔ مہ جبیں نے

کنکھیوں سے دیکھا علی شاہد سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی گلابی رنگ کی کارٹینیا کے اسٹیرنگ کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ اُس کی نظریں اب بھی مہ جبیں ہی پر جمی ہوئی تھیں۔

جب وہ اعجاز کے ساتھ ٹیکسی میں گھر واپس آ رہی تھی تو اُس نے ٹیکسی کے شیشے میں کارٹینیا کو پیچھا کرتے ہوئے محسوس کیا۔ پھر گھر میں داخل ہوتے وقت اُس نے انتہائی ضبط کے باوجود مڑ کر دیکھا، کارٹینیا ہزار آٹھ سو قدم دور کھڑی تھی اور علی شاہد اُس کے اگلے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ دروازے بند ہو گئے۔ اعجاز بہت خوش تھا اُس کا خیال تھا کہ آج مہ جبیں بھی بہت خوش ہو گی لیکن اُس نے جلدی ہی یہ عجیب و غریب کیفیت دیکھ لی کہ آج مہ جبیں ہر روز سے زیادہ جذباتی اور چڑچڑی ہو رہی تھی، یہاں تک کہ اُس نے مہ جبیں کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو دیکھ لیے۔

رات کو مہ جبیں سے کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ مہ جبیں سے زیادہ اعجاز کی حالت افسوسناک تھی وہ سوچتا کہ مہ جبیں کو خوش رکھنا کم از کم اُس کے بس کی بات نہیں ہے۔

دونوں بچے سو چکے تھے کمرے میں زیرو بلب کی نیلی روشنی تھی، مہ جبیں کا سر اعجاز کے زانو پر تھا اور وہ آہستہ آہستہ رو رہی تھی۔ اعجاز رونے کی وجہ جاننے پر بضد تھا، مہ جبیں جھوٹ بولنے پر مجبور تھی۔ اعجاز نے مہ جبیں کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔ ”مہ جبیں! جب تک میں زندہ ہوں تمہیں فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تمہارے والدین سرد مہری دکھا رہے ہیں تو دکھانے دو، تم اپنا دل میلا نہ کرو۔“

لیکن مہ جبیں کے ذہن میں صرف علی شاہد تھا جس نے اُس کے سینے میں آگ لگا دی تھی، اُس کی یاد آتی تو اُسے خود پر قابو نہ رہتا، وہ یہ سمجھے ہوئے تھی کہ اُس نے شاہد کو بھلا دیا ہے لیکن آج علی شاہد کی ایک جھلک نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا، اس نے تصور میں خود کو علی شاہد کے گھر میں مالکانہ انداز میں رہتے ہوئے دیکھا، شاندار مکان، کئی ملازمین، روپوں کی ریل پیل، کارٹینیا، زندگی اور نوجوانی کی ساری دلچسپیاں اور اُس کے لوازمات، ہر روز تقریبات اور تفریح گاہوں میں بے فکری سے ہنستے ہوئے شرکت کرنا، شاندار خریداری، جب ہوش میں آئی تو [illegible] کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اعجاز کے زانو پر اپنا سر دیکھ کر کوفت [illegible] لگی، اُس نے اُٹھنا چاہا لیکن اعجاز نے جوش محبت میں سر نہیں اُٹھانے دیا [illegible] نے سر ذرا سا اُٹھایا اور دونوں بچوں کو غور سے دیکھا۔ [illegible] دونوں اپنے معصوم ہونٹوں پر ملکوتی تبسم لیے سو رہے تھے اُن [illegible] اس گھر میں کوئی مستقبل نہیں ہے اس نے اعجاز سے شادی [illegible]

کام لیا تھا۔ اگر وہ ذرا صبر سے کام لیتی تو بہت ممکن تھا کہ علی شاہد اُس سے شادی کر لیتا۔ شاہد کی کپکپاتی آواز اور پیچھا کرنے کا انداز یہ بتاتا تھا کہ اب بھی اُس کے دل میں مہ جبیں کے لیے تڑپ موجود ہے، وہ اُسے اب بھی چاہتا ہے، اُس کا دل [illegible] اعجاز مہ جبیں کے چہرے سے اُس کی اندرونی کشمکش سمجھنے کی کوشش [illegible] اس وقت اُس نے شدت سے یہ بات محسوس کی کہ وہ مہ جبیں کو خوش [illegible] اُس نے جھک کر مہ جبیں کی پیشانی چوم لی اور بغل میں گدگدی [illegible] کر دیا۔ مہ جبیں جبراً ہنسنے لگی۔ اعجاز نے اُسے اُٹھا کر بٹھا دیا اور [illegible] نہیں! میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں تمہیں خوش نہیں رکھ سکا، [illegible] ذرا ای معاف کرنا، تم نے شادی میں عجلت سے کام لیا۔ اور میں نے سوچے [illegible] سے مجبور ہو کر تمہاری درخواست قبول کر کے بڑی بھاری [illegible] اُس وقت یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ شادی سارے مسائل کا خاتمہ

بُوڑھے

میاں نے ایک نوجوان عورت سے شادی کر لی۔ رُوپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ باتیں کرنی بھی خوب جانتے تھے۔ جب رات کو اپنی نوجوان بیوی کو اُداس دیکھتے تو اسے خوش کرنے کے لیے دلچسپ باتیں شروع کر دیتے۔ ایک دن کہنے لگے۔ ”تو کتنی خوش قسمت ہے جو ایک تجربے کار شخص سے منسوب ہوئی، دولت کی اس گھر میں کوئی کمی نہیں ہے۔ میں نے ایک زمانے کو دیکھا ہے اچھے بُرے کو آزمایا ہے۔ حقوق العباد سے واقف ہوں۔ شدت سے محبت کرنا جانتا ہوں، طبیعت میں شفقت بھی ہے۔ خوش بیان بھی ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر کہیں غلطی سے تو کسی بے وقوف نوجوان سے منسوب ہو جاتی اور وہ نوجوان شباب کی گرمی سے تند خو، خود سر بھی ہوتا، بات بات پر تجھے ٹوکتا، ہر معاملے میں اپنی ٹانگ اڑاتا، اگر رُومان پسند اور عاشق مزاج ہوتا تو اور در بھی تلاش کرتا۔ اب تو خود ہی فیصلہ کر کہ میں اچھا ہوں جو اپنی زندگی عقل و آداب کے ساتھ گزار رہا ہے یا وہ جاہل خودسر اور نا تجربہ کار نوجوان جو کسی ایک کا ہو کر نہیں رہتا۔“

نوجوان عورت نے ایک سرد آہ بھری اور کہنے لگی۔ ”مجھے عقل نہیں شباب کی خود سری اور عشق کی شوریدگی درکار ہے۔ جب میں چھوٹی سی تھی تو میں نے اپنی عقلمند لیکن نئے جوانی سے سرشار دائی سے سُنا تھا کہ جوان عورت کے پہلو کو کسی بوڑھے کی رفاقت ملنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ اُس کے پہلو میں تیر پیوست ہو جائے۔“

کردے گی لیکن اب میں یہ سوچتا ہوں کہ انسانی نفسیات بڑی پیچیدہ شے ہے! کتابوں کی باتوں اور عملی زندگی میں بڑا فرق ہے ہم اس معاشرے سے اتفاق نہ کرنے کے باوجود بھی اس کی حد بندی سے آزاد نہیں ہو سکتے۔"

مہ جبیں کو شبہ گزرا کہ شاید اعجاز علی شاہد والی بات سے واقف ہو گیا ہے اُس نے معنی خیز نظروں سے اعجاز کو دیکھا لیکن اُس کے چہرے پر کوئی خاص بات نہیں تھی اُس نے آہستہ سے پوچھا "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

اعجاز کہنے لگا "شادی کوئی ایسا بندھن نہیں ہے جسے توڑا نہ جا سکے۔"

مہ جبیں چونک کر وحشت سے اُسے دیکھنے لگی اعجاز کہتا رہا "شادی تو ایک قسم کا معاہدہ ہے ——— معاہدہ عارضی بھی ہو سکتا ہے اور پائیدار بھی اگر کسی معاہدے سے فریقین یا کوئی ایک فریق مطمئن نہ ہو تو اسے حق پہنچتا ہے کہ معاہدہ توڑ دے" یہ کہتے کہتے اعجاز کی آواز بھرا گئی وہ رک رک کر بولا "اگر تم یہ محسوس کرتی ہو کہ معاہدہ صحیح نہیں ہوا تو اسے توڑ سکتی ہو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

مہ جبیں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ آخر ایسا خیال کیوں آیا آپ کے دل میں؟"

اعجاز نے مہ جبیں کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا "تم ہر وقت اُداس اُداس رہتی ہو اور میں تمہیں اُداس دیکھ کر کڑھنے لگتا ہوں۔"

مہ جبیں اعجاز سے چمٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی سسکیوں کے درمیان اس نے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ اُداس نہیں دکھائی دے گی خوش خوش رہے گی تقریباً چار دن تک وہ واقعی بہت خوش خوش رہی لیکن حالات کے موڑ نے پھر خوشی چھین لی اعجاز کالج گیا ہوا تھا علی شاہد نے کار ٹینا دور چھوڑی اور سنسان گلی سے فائدہ اُٹھا کر گھر میں داخل ہو گیا۔ مہ جبیں بوکھلا گئی اور اُس نے علی شاہد کو حکم دیا "تم اسی وقت گھر سے نکل جاؤ ورنہ میں شور کر کے محلے بھر کو اکٹھا کر لوں گی۔"

شاہد بڑے بچے کی طرف بڑھتا ہوا بولا "تم شوق سے شور کرو۔ میں باہر نہیں جاؤں گا میں اپنے بچے کو دیکھنے آیا ہوں۔"

مہ جبیں خوفزدہ ہو گئی اُس نے جلدی سے بڑے بچے کو گود میں اُٹھا لیا اور بھنچتی ہوئی بولی "یہ تمہارا بچہ نہیں ہے تم اسی وقت نکل جاؤ میرے گھر سے۔"

شاہد اس کے بالکل قریب جا کھڑا ہوا "میں یہ نہیں کہتا کہ تم اسے میری گود میں دے دو مجھے تو بس اس کی شکل دکھا دو۔"

مہ جبیں نے سوچا کہ غل مچانے سے رسوائی ہوگی اُس نے بچے کا چہرہ علی شاہد کی طرف کر دیا اور کہنے لگی "اچھا دیکھ لو اس کا چہرہ لیکن پھر ایک منٹ بھی یہاں نہ رکنا!"

شاہد کے ہونٹوں پر شفقت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ بچہ سہم کر ماں کے سینے میں منہ چھپانے لگا۔

"خوب!" علی شاہد بولا "مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ بالکل میری شکل ہے۔"

مہ جبیں نے گھبرا کر پوچھا "کس نے بتایا تھا تمہیں؟"

شاہد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر کمروں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "ڈرائنگ روم بھی ہے اس گھر میں؟"

مہ جبیں نے جل کر جواب دیا "کیوں کیا ڈرائنگ روم تمہارے ہی گھر میں ہو سکتا ہے؟"

علی شاہد ہنستا ہوا بولا "میں نے یہ سنا تھا کہ تمہارے آقائے نامدار کی مالی حالت اچھی نہیں ہے!"

"تم نے غلط سنا تھا!" پھر وہ ایک کمرے کی طرف جاتی ہوئی بولی۔ "اِدھر آؤ میرے ساتھ میں دکھاؤں تمہیں ڈرائنگ روم۔"

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ علی شاہد کچھ دیر ٹکٹکی لگائے اسے دیکھتا رہا۔ مہ جبیں نے نظریں جھکا لیں۔

"مہ جبیں!" علی شاہد نے آہستہ سے کہا "ہم دونوں نے اپنی زندگی کے فیصلوں میں بچپنے کا مظاہرہ کیا!"

مہ جبیں گھبرا رہی تھی کہ کہیں کوئی آ نہ جائے۔ بولی "اب ان باتوں کا وقت نہیں رہا۔"

"نہیں، وقت کیوں نہیں رہا" علی شاہد نے کہا "میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میرا بچہ کوئی غیر آدمی پرورش کرے۔"

مہ جبیں نے ناگواری سے کہا "یہ تمہارا بچہ نہیں ہے!" پھر التجا آمیز لہجے میں کہنے لگی "تمہیں ایسی بات زبان سے نہیں نکالنا چاہیے۔ اگر یہ بات مشہور ہو گئی تو میرے بچے کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔"

شاہد نے درخواست کی "مہ جبیں! تمہیں کھو کر میں نے اپنا سکون کھو دیا ہے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم میرے لیے کچھ سوچو تم سے جدا ہو کر تو میں کہیں کا بھی نہ رہا۔"

"تمہارے لیے کیا سوچوں؟" مہ جبیں مذبذب ہو گئی۔

"کیا تم یہاں خوش ہو؟"

"ہاں خوش ہوں!" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"تم جھوٹ بولتی ہو اس اُجاڑ اور مفلس گھر میں تم کس طرح خوش رہ سکتی ہو میں تمہاری طبیعت سے پوری طرح واقف ہوں۔"

"میں بہر حال خوش ہوں!" مہ جبیں خوف زدہ ہوتی جا رہی تھی "میں ایک عالی ظرف شوہر کے ساتھ رہتی ہوں۔"

"بہر حال!" علی شاہد کھڑا ہو گیا۔ "اگر تم چاہتی ہو کہ آسودہ زندگی گزارو، تمہارے بچوں کا مستقبل تباہ نہ ہو اور معاشرے میں ہر دل عزیزی حاصل کرو تو تم اب بھی میرا انتخاب کر سکتی ہو۔ میں اب بھی تمہیں اپنانے کے لیے تیار ہوں، پچھلی باتیں بھول جاؤ۔"

اس غیر متوقع پیش کش سے علی شاہد اور اُس کی امارت کی ساری دلکشیاں اور لوازم مہ جبیں کے تصور میں اچانک گردش کرنے لگے وہ بے خیالی میں بولی "اب یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ تم نے خود ہی کب اس کا موقع دیا۔"

"یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے" علی شاہد پُر اُمید لہجے میں بولا۔ "بس تم ہاں کر دو، بقیہ سارے کام میں خود انجام دے لوں گا۔ دیکھو مہ جبیں، یہ کوئی نئی بات نہیں، ایسا اب بھی ممکن ہو سکتا ہے" وہ نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔

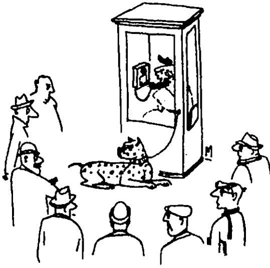
مہ جبیں اُلجھن میں پڑ گئی۔

علی شاہد نے آگے بڑھ کر اُسے آغوش میں لینا چاہا لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی اور گھبرا کر بولی "یہ نہیں ہو سکتا اب نہیں ہو سکتا۔ تم کتنے بے غیرت ہو۔"

لیکن علی شاہد پھرتی سے آگے بڑھا اور اُسے آغوش میں لے کر بھینچ لیا اور پے در پے کئی بوسے ڈالے۔ مہ جبیں نے اُسے دھکیل دیا اور رُندھی ہوئی آواز میں بولی "تم اسی وقت نکل جاؤ میرے گھر سے۔ تم میری پُر سکون زندگی تباہ کرنے کیوں چلے آئے؟"

علی شاہد نے ایک منٹ تک مہ جبیں کو غور سے دیکھا اس کے بعد اپنے بچے کے گال پر ہلکی سی چپت رسید کرتا ہوا بولا۔ "بہر حال میرا پتہ تو تمہیں معلوم ہی ہے جب بھی میری پیش کش سے فائدہ اُٹھانا چاہو مطلع کر دینا میرے دروازے تمہارے لیے ہر وقت کھلے رہیں گے!"

علی شاہد چلا گیا اور مہ جبیں کے دل میں ایک طوفان اُٹھا گیا۔ وہ طوفان میں پھنسی ہوئی کشتی کی طرح ڈولنے لگی۔ اس کے لیے یہ انتہائی خوشی کی بات تھی کہ علی شاہد اب بھی اُس سے محبت کرتا تھا۔ بُرے بُرے خیالات دل میں آتے لیکن وہ لاحول پڑھ کر ان سے نجات حاصل کر لیتی مگر اب اعجاز سے تلخ کلامی بہت زیادہ ہونے لگی تھی، بات بات پر وہ اُلجھ پڑتی، ہر وقت علی شاہد کی پیش کش ذہن میں گونجتی رہتی۔ شروع شروع میں تو اس نے پیش کش پر غور کرنا بھی گناہ سمجھا تھا لیکن رفتہ رفتہ کچھ ایسا ہو گیا کہ علی شاہد کی جملہ باتوں میں صرف پیش کش ہی یاد رہ گئی کئی بار اُس کے جی میں آئی کہ علی شاہد کو خط لکھ دے کہ وہ سنجیدگی سے اس کی تجویز پر غور کر رہی ہے لیکن یہ سوال پریشان کرتا تھا کہ اعجاز جیسے شریف انسان سے کس طرح نجات حاصل کی



جائے۔ لوھر یہ بھی ڈر تھا کہ اگر اُس نے اعجاز سے علیحدگی کا اظہار کیا تو وہ اپنا بچہ ضرور لے لے گا۔ علی شاہد کے ساتھ حسین اور سرشار شب و روز گزارنے کا تصور اسے پریشان کرنے لگا، اور بچوں کے مستقبل کا خیال علی شاہد سے رجوع ہونے پر مجبور کرنے لگا۔

اس نے سوچا اگر سرمایہ پاس ہو تو والدین اور رشتے داروں کی ناخوشی بھی گوارا کی جا سکتی ہے، وہ سوتے سوتے جاگ جاتی اور سوتے ہوئے اعجاز کی شکل یوں دیکھتی رہتی گویا پھر کبھی نہ دیکھ سکے گی، وہ گھر کی ایک ایک شے کی طرف الوداعی نظروں سے دیکھتی رہتی۔ علی شاہد کی محبت جنون اور طوفان کی طرح اُس کے رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ اسی عالم میں علی شاہد کا چند سطری خط موصول ہوا اُس نے لکھا تھا "مجھے تمہارے خط کا انتظار ہے جب چاہو بچوں کو لے کر آ جاؤ میرے ہوتے ہوئے کسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

اسی دوران مہ جبیں کے کانوں میں اعجاز کی آواز گونجنے لگی "مہ جبیں! شادی تو ایک قسم کا معاہدہ ہے معاہدہ عارضی بھی ہو سکتا ہے اور پائیدار بھی، اگر کسی معاہدے سے کوئی فریق مطمئن نہ ہو تو اسے حق پہنچتا ہے کہ معاہدہ توڑ دے۔"

مہ جبیں نے نہ جانے کس جذباتی لمحے میں نیچے کا ہونٹ دانتوں سے داب کر علی شاہد کو لکھ دیا۔

"علی شاہد! تم نے دوبارہ آ کر میری رگ و پے میں آگ لگا دی، میں تمہارے پاس آنا چاہتی ہوں لیکن میں دوسرا بچہ بھی اپنے ہی پاس رکھنا چاہتی ہوں اعجاز سے طلاق اور بچے کا حق پرورش تمہیں دلانا پڑے گا۔ اگر اس پر تیار ہو تو میں تمہاری محبت میں آگ کے سمندر سے بھی گزر سکتی ہوں۔"

ایک دن اعجاز کی عدم موجودگی میں علی شاہد کار لے کر پہنچا مہ جبیں نے اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ دیا اور جلدی جلدی اعجاز کے نام چند سطریں لکھنے لگی "مجھے بہت افسوس ہے کہ میں آپ کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی چونکہ آپ نے خود ہی یہ حق دے دیا تھا کہ میں معاہدہ توڑ سکتی ہوں اس لیے میں علی شاہد کے

ساتھ جا رہی ہوں۔ اعجاز! آپ بہت شریف انسان ہیں اس لیے شرافت کے نام پر میں آپ سے یہ درخواست کرتی ہوں کہ آپ اپنا بچّہ بھی مجھے بخش دیں۔ میں ماں ہوں اور اولاد کی جُدائی کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی۔"

اعجاز کو جب یہ خط ملا تو اسے چکّر سا آگیا۔ دنیا اندھیر ہو گئی۔ گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ خاموش، اُداس اور سوگوار در و دیوار اسے کھانے کو دوڑ رہے تھے پھر بھی اس نے انتہائی صبر و ضبط سے کام لیا۔

رات کی تاریکی میں وہ ڈھونڈتا ہوا علی شاہد کے گھر پہنچا۔ علی شاہد جیسے اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اُس نے علی شاہد ہی سے علی شاہد کے بارے میں دریافت کیا۔ علی شاہد نے اُسے پہچان لیا تھا پھر بھی پوچھا۔ "آپ علی شاہد سے کیوں ملنا چاہتے ہیں، آپ کا نام ؟"

اعجاز نے افسردگی سے جواب دیا۔ "آپ مجھے علی شاہد سے ملوا دیجیے وہ بات کسی اور سے نہیں کی جا سکتی!"

علی شاہد کچھ دیر تک سوچتا رہا اس کے بعد اُسے شاندار ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ "قبلہ میرا ہی نام علی شاہد ہے فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

اعجاز نے چونک کر علی شاہد کو اُوپر سے نیچے تک دیکھا وہ واقعی ایک شاندار نوجوان تھا۔ آہستہ سے بولا۔ "میں مہ جبیں سے ملنا چاہتا ہوں!"

شاہد نے کھرّے لہجے میں جواب دیا۔ "قبلہ! مجھے آپ ایک سُلجھے ہوئے آدمی نظر آتے ہیں، یقیناً آپ حالات سمجھ گئے ہوں گے، وہ آپ کی بیوی ضرور ہے لیکن محبت مجھ سے کرتی ہے اور اتنا اندازہ تو آپ نے لگا ہی لیا ہو گا کہ وہ آپ کے ساتھ خوش نہیں تھی۔"

"بے شک!" اعجاز نے سوگواری سے کہا۔ "لیکن میں یہاں کسی ہنگامے کی نیت سے نہیں آیا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ جو کچھ ہونا ہے نہایت خوش اسلوبی سے ہو جائے بدنامی نہ ہو تو اچھا ہے!"

علی شاہد نے دریافت کیا۔ "آپ مہ جبیں سے کیا باتیں کریں گے ؟"

اعجاز نے پتلون کی داہنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اس کی پرتیں کھولتے ہوئے کہا۔ "یہ طلاق نامہ ہے یہ کسی ایسے ہی وقت کے لیے میں نے بہت دنوں سے جیب میں ڈال رکھا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر دوستوں کی طرح اس پر دستخط کر کے علیحدہ ہو جائیں!"

علی شاہد نے کاغذ اعجاز کے ہاتھ سے لے لیا اور پڑھنے لگا۔ پڑھ چکنے کے بعد ایسا لگا جیسے وہ اعجاز سے بڑا متاثر ہے۔ اسی لمحے اُس نے دروازے پر کھڑے ہوئے لڑکے کو چائے لانے کا حکم دیا لیکن اعجاز نے منع کر دیا۔ بولا۔ "جناب والا! چائے منگوانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں نہیں پیوں گا!"

لیکن لڑکا جا چکا تھا۔ علی شاہد نے دریافت کیا۔ "خوب! آپ تو بڑے آزاد خیال اور سمجھ دار انسان ہیں، لیکن یہ تو بتایئے کیا مہ جبیں کو چھوڑنے کا آپ کو کوئی غم نہیں ہو گا؟"

"ہو گا کیوں نہیں!" اعجاز نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "لیکن اگر وہ میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تو انصاف اور فراخ دلی کا تقاضا ہے کہ میں ساتھ رہنے پر مجبور نہ کروں۔"

علی شاہد کے چہرے پر فکر کے آثار اُبھرے، وہ فوراً اندر چلا گیا اور تقریباً پندرہ منٹ بعد جب واپس آیا تو شرمسار مہ جبیں اُس کے ساتھ تھی۔ اعجاز نے غور سے اسے دیکھا لیکن مہ جبیں نظر نہ ملا سکی۔ کچھ دیر تک دونوں ہی چپ رہے آخر اعجاز نے مہ جبیں سے کہا۔ "تشریف رکھیے!"

یہ آواز نشتر کی طرح مہ جبیں کے دل میں اُتر گئی۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

علی شاہد نے چائے کی پیالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "چائے تو آپ نے پی ہی نہیں، اب تک تو ٹھنڈی بھی ہو گئی ہو گی!"

اعجاز نے کہا۔ "شکریہ جناب! میں نے تو پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ چائے نہیں پیوں گا!"

علی شاہد نے ناگواری کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ "اچھا جناب تو پھر نیک کام میں دیر کیسی ؟ آپ دونوں طلاق نامے پر دستخط کر کے کاغذ میرے حوالے کر دیجیے!"

اعجاز نے گویا علی شاہد کی بات سُنی ہی نہیں، اُس نے مہ جبیں سے دریافت کیا۔ "مہ جبیں! میرا بچّہ کہاں ہے ؟"

مہ جبیں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اندر ہے!"

"اُسے لے آؤ!"

"کیوں وہ میرے ہی پاس رہے گا!"

"نہیں، ایسا نہیں ہو گا۔" اعجاز کے لہجے میں اعتماد پایا جاتا تھا۔ "وہ میرے پاس رہے گا!"

مہ جبیں نے لجاجت سے کہا۔ "اعجاز! آپ بہت عظیم انسان ہیں مجھ پر یہ ظلم نہ کیجیے مجھ سے میرا بچّہ جُدا نہ کیجیے۔"

اعجاز نے ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بات ظلم کی نہیں، انصاف کی ہے میں تمہاری خوشیوں میں دخل انداز نہیں ہو رہا۔ اس لیے رواداری اور اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ تم بھی میرا بچّہ مجھ سے جدا نہ کرو۔"

"میں بچّہ کس طرح دے سکتی ہوں!"

"تو پھر میں تمہیں طلاق بھی نہیں دوں گا!"

مہ جبیں نے بے بسی سے علی شاہد کو دیکھا۔ علی شاہد کہنے لگا۔ "آخر آپ بچّے کے لیے بضد کیوں ہیں؟"

اعجاز نے جواب دیا: "صرف اس لیے کہ وہ میرا بچہ ہے!"
شاہد نے ایک نظر مہ جبیں کو دیکھا اور کہنے لگا: "مہ جبیں! بات کو طول نہ دو۔ ان کا بچہ انہیں دے دو۔"
مہ جبیں تلملا کر کھڑی ہو گئی: "نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اپنا ایک بچہ بھی کسی کو نہ دوں گی۔"
علی شاہد نے تیوریوں پر بل ڈال لیے حکم دینے کے انداز میں کہا: "مہ جبیں! تم جھگڑا نہ بڑھاؤ۔ یہ مسئلہ بڑی آسانی سے نمٹ رہا ہے۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو میرا حکم بھی مانو۔ ان کا بچہ ان کے حوالے کر دو کیونکہ میں خود بھی کسی اور کے بچے کو اپنے گھر میں رکھنا نہیں چاہتا۔"
مہ جبیں نے عجیب سی نظروں سے شاہد کو دیکھا اور دریافت کیا: "کیا کہا؟"
علی شاہد نے اسی لاپرواہی سے جواب دیا: "ان کا بچہ ان کے منہ پر لا کر مارو۔ میں اس پلّے کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔"
اعجاز کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا: "مہ جبیں! اب زیادہ ذلیل نہ کرواؤ۔"
مہ جبیں کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ سکتے کی حالت سے دوچار رہی پھر اُس نے خود کو سنبھالا اور ایک نئی شرط پیش کر دی کہنے لگی: "بچہ ایک شرط پر دے سکتی ہوں۔"
اعجاز نے سراپا سوال بن کر پوچھا: "وہ کیا؟"
اُس نے شاہد کو محبت آمیز نظروں سے دیکھا اور اعجاز کو جواب دیا: "میرے کپڑے اور زیورات میرے حوالے کر دیجیے اگر بچے کو دوں گی تو اپنی ایک ایک چیز لے لوں گی۔"
اعجاز نے کسی پس و پیش کے بغیر کہا: "میں تیار ہوں۔"
شاہد نے کہا: "طلاق نامہ پر دستخط اسی وقت ہو جائیں تو بہتر ہے۔"
اعجاز نے جواب دیا: "نہیں! ابھی نہیں پہلے میرا بچہ میرے حوالے کر دو!"
مہ جبیں نے جھگڑا چکانے کے لیے کہا: "ہم سب ابھی اعجاز کے ساتھ ان کے گھر چلتے ہیں، وہاں سے میں اپنی ایک ایک چیز لے کر ان کا بچہ ان کے حوالے کر دوں گی۔ طلاق نامے پر دستخط بھی وہیں ہو جائیں گے۔"
مہ جبیں اندر گئی، دونوں بچوں کو ساتھ لیا۔ علی شاہد نے کار نکالی اور سب لوگ اعجاز کے گھر پہنچ گئے۔ راستے بھر تینوں ایک دوسرے سے نظریں چُراتے رہے اور انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔
مہ جبیں اپنی ایک ایک چیز نکالتی اور بڑے صندوق میں رکھتی رہی حتیٰ کہ زیورات بھی اس میں رکھ لیے۔ اعجاز کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ گھر کی ایک چیز بھی نہیں چھوڑے گی۔ اعجاز کو اُس کا بچہ مل گیا اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔ بڑا بچہ مہ جبیں کی گود میں تھا جب یہ ساری کارروائی ہو چکی تو مہ جبیں نے اعجاز سے کہا: "لاؤ وہ طلاق نامہ کہاں ہے؟"
اعجاز طلاق نامے کی تہیں کھول کر دستخط کرنے کے لیے قلم جیب سے نکالنے لگا۔
مہ جبیں نے جذباتی آواز میں کہا: "لاؤ پہلے میں کروں گی اس پر دستخط!"
اعجاز نے کاغذ اُس کی طرف بڑھا دیا اور علی شاہد نے اپنا قلم مہ جبیں کی جانب بڑھایا۔
مہ جبیں نے کاغذ پُرزے پُرزے کر کے اُڑا دیا اور پوری قوت سے چیخ کر علی شاہد کو حکم دیا: "بدمعاش! تم اسی وقت نکل جاؤ میرے گھر سے کمینے انسان! تو نے میرے بچے کو پلّا کہا ہے مکار! تو مجھ سے محبت کرتا ہے لیکن میرے بچے کو اپنے گھر میں رکھنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اسی وقت یہاں سے چلا جا۔ ورنہ میں تھانے جا کر تجھے پکڑوا دوں گی۔"
شاہد حواس باختہ ہو گیا اور جواب میں ایک لفظ کہے بغیر فوراً باہر نکل گیا۔ مہ جبیں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور بچے کو مسہری پر بٹھا کر والہانہ انداز میں اعجاز سے چمٹ گئی اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی: "میں یہاں نہیں رہوں گی اعجاز! مجھے کہیں اور لے چلیے۔"
اعجاز کا چہرہ بھی تر بتر ہو گیا۔ مہ جبیں نے رُندھی ہوئی آواز میں پوچھا: "اگر میں بچہ آپ کے حوالے کر دیتی تو آپ کیا کرتے؟"
اعجاز نے جواب دیا: "اسے مار کر خودکشی کر لیتا!"
وہ اور شدت سے چمٹ گئی: "میں بہت بُری ہوں اعجاز۔ آپ مجھے ہلاک کیوں نہیں کر دیتے!"
اعجاز نے پیار سے اس کی پشت تھپتھپائی اور کہنے لگا: "مہ جبیں! مت رو، ہم سب مجبور ہیں، زندگی کی گاڑیاں حالات اور وقت کے اسٹیئرنگ کے اختیار میں رہتی ہیں، یہ جدھر گھومتا ہے ہم بھی اسی طرف مڑ جاتے ہیں لیکن تم کوشش کرو کہ اس اسٹیئرنگ پر تمہارا اپنا اختیار رہے۔"
مہ جبیں، اُس کے سینے میں سمائی چلی جا رہی تھی پھر وہ اعجاز کو چھوڑ کر باری باری دونوں بچوں کو سینے سے لگا کر روتی رہی بالکل مشرق کی اُس نئی نویلی دُلھن کی طرح جو رخصتی کے وقت اپنے چاہنے والوں سے گلے مل مل کر رویا کرتی ہے۔

♥♥



اس ماہ کی خاص کہانی

جو اعلیٰ درجے کی کہانیاں پڑھنے کا فن جانتے ہیں اُن کے لیے ایک کہانی



وہ پیدائشی اندھا تھا۔ شیرخواری کے زمانے میں بھی اُس کی بے نور آنکھیں ماں کی طرف بے چارگی سے تکتی رہتی تھیں۔ اُس کی یہ محرُومی موروثی نہیں تھی کیونکہ اُس کے والدین نہایت صحتمند تھے اور اچھے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے خاندانوں میں کبھی کوئی شخص اس قسم کے کسی مرض میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔ بہرحال وجہ چاہے کچھ بھی ہو مگر یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ وہ نابینا تھا۔

اُس کے لیے دُھوپ تپش کے ایک احساس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اُس کے نزدیک پھُول محض خوشبو تھی۔ محبّت محض ہاتھوں کے لمس اور کچھ آوازوں کا مجموعہ۔ اُس کی تاریک دُنیا چھوٹے چھوٹے بے رحم حادثات سے بھری ہوئی تھی۔ اکثر راستے کی چھوٹی چھوٹی رکاوٹیں اُس کے لیے تکلیف کا باعث بن جاتی تھیں اور وہ بعد میں یہ چیزیں اپنی حسّاس اُنگلیوں سے چھوکر رہ جاتا تھا اور ان چیزوں کے کھردرے لمس سے اُس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ روشنی، تاریکی، دِن



ایڈون پونج

محمد اسلم شاھد

ایڈون پونج طبعاً مزاح نگار تھے لیکن اُن کے مزاح میں گُدگُدی کے بجائے طنز کی چُبھن ہوتی ہے اور اس طنز میں فلسفے کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔ انسانی فطرت کے کمزور پہلوؤں سے اُنہیں ھمدردی ہے۔ اُن کا قول ہے کہ "مزاح اور سوز وگداز آپس میں اتنے مربوط ھیں کہ اُنھیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔" یہ بات اُن کی کہانیوں اور کرداروں میں نمایاں طور پر موجود ہے اور اُنہوں نے انسانی فطرت کی کمزوریوں کے ناسُور کو اپنے قلم سے اس طرح چھیڑا ہے جِس طرح کوئی سرجن فاسد مادّہ نکالنے کے لیے نشتر لگاتا ہے۔

ایڈون پونج نے تقریباً تیس۳۰ کتابیں لکھیں۔ اُن کا ۱۹۳۰ء میں اِنتقال ھوا۔

...نگ، فاصلے، تناسب، خوبصورتی اور بدصُورتی ایسے الفاظ تھے جن کے معنی اُس کے لیے کسی معمے سے کم نہ تھے۔

اگر دولت سے مراد رُوپیہ اور پیسہ ہے تو وہ واقعی بہت امیر تھا۔ مگر اُس کی دلچسپیوں کا انحصار امارت سے زیادہ ماں اور بہن کی محبت پر تھا۔ اُس کے والد اکلوتے بیٹے کی اس محرومی کا صدمہ برداشت نہیں کر سکے تھے۔ انہیں عرصے سے ایک لڑکے کی تمنّا تھی اور اپنی تمنّا کی اس طرح پائمالی دیکھ کر وہ دِل برداشتہ ہو گئے تھے اور بہت جلد اپنے حقیقی خالق کے پاس قدرت کے اس مذاق کا گِلہ کرنے پہنچ گئے تھے۔

بچپن گزرا اور جیسے تیسے وہ ایک وجیہہ اور باوقار مرد بن گیا۔ قدرت نے اُسے فنونِ لطیفہ سے خاص لگاؤ عطا کیا تھا۔ موسیقی کے ذریعے وہ اپنی تاریک اور خاموش دُنیا میں رنگ، نُور اور سوز و ساز بکھیرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اُس کے گلے میں سوز تھا۔ لوگ جب اس کی سُریلی آواز سُنتے تو عش عش کر اُٹھتے۔ پیانو، بانسری، وائلن اور رباب بجانے پر اُسے عبُور حاصل تھا۔ موسیقی کے ساتھ ساتھ اُسے ادب سے بھی محبّت تھی۔

وہ اپنا زیادہ وقت ایک ساحلی محل میں گزارا کرتا تھا۔ شہر کے شور و غُل سے اب اُسے خوف سا آنے لگا تھا۔ کبھی کبھار وہ پہاڑوں پر بھی رہنے چلا جاتا تھا لیکن مسلسل خاموشی اور سکُون سے گھبرا کر دوبارہ ساحلی محل میں آجاتا جہاں سمندر کی موجیں اُس سے ہر وقت کچھ نہ کچھ کہتی رہتی تھیں۔

اسی تاریکی میں چوبیس سال بیت گئے۔ اب بینائی کے بحال ہونے کی تمام امیدیں ختم ہو گئی تھیں۔ بے شمار ماہرینِ چشم اُس کا معائنہ کر چکے تھے مگر سبھی نے اسے لاعلاج قرار دیا تھا۔ وہ خود ان روز روز کے معائنوں سے اُکتا گیا تھا۔ اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب کوئی امید رکھنا مزید تکلیف کو دعوت دینے کے مترادف ہو گا۔ رفتہ رفتہ نا امیدی ہی اُسے سکُون میسّر آ گیا۔

ایک روز اچانک اُن کے ایک عزیز مسٹر وائمن نے کسی اطالوی ڈاکٹر کا ذکر چھیڑ دیا۔ مسٹر وائمن خود بھی امراضِ چشم کے ماہر تھے۔ انہوں نے اطالوی ڈاکٹر کے متعلق بتاتے ہوئے کہا کہ اُس کے ماہرانہ علاج سے متعدد پیدائشی اندھوں کی بینائی بحال ہو چکی ہے۔ مسٹر وائمن نے یہ بھی بتایا کہ "میں نے اُس کی تعریفیں بہت سنیں تو ان کی تصدیق کے لیے خود اٹلی گیا اور اُس سے ملاقات کی۔ میرا خیال ہے ذاتی طور پر وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے، پھر بھی پیشہ ورانہ رقابت سے قطع نظر میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ دھوکے باز نہیں ہے کیونکہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اُس کے علاج سے بے شمار مریضوں کو صحتیاب ہوتے دیکھا ہے۔ وہ نک چڑھا ہے، کام میں بڑا طاق ہے۔"

"کیا وہ ہمارے فرڈی کے علاج کی ذمّے داری بھی قبول کر لے گا؟"

"ہاں۔ میں نے فرڈی کے سلسلے میں اُس سے بات کی تھی۔ وہ علاج کرنے کے لیے تیار ہے مگر ناکامی کی صُورت میں اُس نے ایک شرط رکھی ہے۔"

"وہ کیا؟" ماں نے بے تابی سے پوچھا۔

"اُس کا کہنا ہے کہ اگر فرڈی پیدائشی نابینا ہے تو پھر کسی بات کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔۔۔۔"

ماں نے فرڈی کی بہن کی طرف دیکھا۔ دونوں کے چہرے اُتر

گئے، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ فرڈی پیدائشی اندھا ہے۔

"حالانکہ ڈاکٹر پریرا نے فرڈی کو دیکھا نہیں ہے پھر بھی اُس کا خیال ہے کہ شاید یہ پیدائشی اندھا نہ ہو۔ اُس کی رائے ہے کہ شاذونادر ہی کوئی شخص پیدائشی نابینا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شاید ایسا کوئی آدمی اب تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ اُس کا خیال ہے کہ فرڈی بچپن میں غالباً پیدائش کے چند گھنٹوں بعد تک دیکھ سکتا ہوگا۔ بعد میں اُس پر تاریکی غالب آگئی ہوگی۔" مسٹر وائمن کہتے ہے۔ "یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اطالوی ڈاکٹر فرڈی کا علاج کرنے پر تیار ہوگیا ہے۔ میری گزارش ہے کہ اُسے اُس کی فراخدلی کا معاوضہ بھی فراخدلی ہی سے پیش کیا جائے۔"

"اگر وہ فرڈی کا علاج کرنے میں کامیاب ہوگیا تو ہماری ہر چیز اُس کے لیے حاضر ہے۔ خدا کے لیے اُسے فوراً بُلاؤ۔"

مسٹر وائمن نے اطالوی ڈاکٹر کو تار بھجوا دیا اور دونوں ماں بیٹی ایک بار پھر فرڈی کو علاج کے لیے آمادہ کرنے لگیں۔ شروع میں اُس نے احتجاج کیا مگر ماں اور بہن کے پُرزور اصرار کے سامنے اُس کی ایک نہ چلی۔ پندرہ روز بعد ڈاکٹر پریرا پہنچ گیا اور نوجوان فرڈی نے اپنے آپ کو بادلِ ناخواستہ اُس کے حوالے کر دیا۔

"میرا خیال ہے کہ کچھ امید پائی جاتی ہے۔" ڈاکٹر نے معائنے کے بعد کہا اور پھر علاج کی تفصیلات بتانے لگا۔ اُس نے بڑی صاف گوئی سے اس بات کا اعتراف بھی کیا کہ اُس کی مہارت قطعی طور پر کامیابی کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ "بہر حال، نوجوان! مجھے یقین ہے کہ تمہارے اندر اپنے مرض کے متعلق صحیح بات سُننے کی ہمت موجود ہوگی۔"

"جی.... غالباً!" فرڈی نے مایوسی سے کہا۔

"بڑی سے بڑی مایوسی برداشت کر لو گے؟"

"میں اب تک یہی کرتا آیا ہوں۔" اُس نے ایک سرد آہ بھری۔

"پھر شاید مجھے تم سے صاف صاف بات کرنا چاہیئے۔ دیکھو فرڈی مجھے یقین ہے تمہاری بینائی بحال ہو سکتی ہے۔ بہت ممکن ہے مستقل طور پر اور بہت ...."

"اور کیا ممکن ہے؟" اُس نے بے چینی سے پوچھا۔

"میں تم سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتا۔ دراصل اس بات کا خدشہ بھی موجود ہے کہ تم محض عارضی طور پر دوبارہ دیکھنے کے قابل ہو سکو۔ یعنی یہ مدت بہت مختصر بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے تمہیں صرف چند لمحوں کے لیے بینائی ملے۔ کیا تم یہ صورتِ حال برداشت کر لو گے؟"

"بڑا مشکل کام ہے۔" اُس نے اعتراف کیا "لیکن میرا خیال ہے میں برداشت کر لوں گا۔"

"تم معاملے کی نزاکت سمجھنے کی کوشش کرو۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ عارضی بینائی کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ چونکہ ابھی تمہیں مکمل طور پر اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ تم کتنی بڑی نعمت سے محروم ہو لیکن بینائی کی بحالی کے چند گھنٹوں یا چند منٹوں کے لیے دیکھ سکنے کے بعد اس نعمت سے دوبارہ محروم ہونے کا احساس تمہارے لیے بہت تکلیف دہ ثابت ہوگا۔"

"اگر کامیابی کی ذرا بھی امید ہے تو میں ہر خطرہ مول لینے کیلیے تیار ہوں۔"

"امید تو بہت ہے۔" ڈاکٹر نے کہا "تمہیں میرے علاج کی [illegible] یاں باقاعدگی سے برداشت کرنی ہوں گی۔"

"[illegible] اس کا آپ کو مکمل اطمینان دلاتا ہوں۔"

اس طرح یہ معاملہ طے ہوگیا۔ اطالوی ڈاکٹر کو وہیں کوٹھی میں ایک کمرہ دے دیا گیا اور اُس نے علاج شروع کر دیا۔

اُس کا طریقہ علاج بڑا تکلیف دہ اور سُست رفتار تھا۔ فرڈی کو [illegible] ہفتوں تک ایک تاریک کمرے میں پیٹھ کے بل لیٹے رہنے کا حکم ملا۔ [illegible] کی آنکھیں پلاسٹر سے ڈھانک دی گئی تھیں اور بھنوؤں پر بھی پٹیاں باندھ دی گئی تھیں۔ اُس کی خوراک کی مقدار اور اوقات کے سلسلے میں سخت پابندی کی جاتی تھی۔ اُسے ہلنے جلنے کی اجازت بھی نہیں تھی مگر فرڈی نہایت خندہ پیشانی سے یہ پابندیاں برداشت کرتا رہا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک مثالی مریض ثابت ہوا۔

چھٹے اور آخری دن ڈاکٹر پریرا نے ایک عجیب و غریب حرکت کی۔ صبح ناشتے کی میز پر حسبِ معمول سبھی اُس کے منتظر تھے مگر وہ نیچے نہیں آیا۔ ایک ملازمہ کو چائے کے کپ کے ساتھ اُس کے کمرے میں بھیجا گیا۔ ملازمہ کچھ دیر بعد اُلٹے قدموں لوٹ آئی۔

ڈاکٹر کہیں جا چکا تھا۔

اُس نے خود ہی سارا سامان باندھا ہوگا اور اُٹھا کر لے گیا ہوگا۔

فرڈی کی ماں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور بہن کے چہرے سے

جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا۔

"اُن کے پلنگ پر یہ خط پڑا ہوا تھا۔" ملازمہ نے کہا

بدنصیب ماں نے بڑی مشکل سے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے لفافہ کھول کر بیٹی کی طرف بڑھا دیا۔ "تمہی پڑھ کر سُنا دو بیٹی۔"

ڈاکٹر نے شروع میں اپنی اس حرکت پر معذرت کا اظہار کیا تھا اور پھر ایک کام کی اہمیت پر زور دیا تھا جس کی وجہ سے اُسے اچانک یہاں سے بھاگنا پڑا۔

جنوبی امریکہ کے ایک کروڑ پتی نے اپنے بیٹے کے علاج کے لیے اسے تین لاکھ ڈالر کی پیش کش کی تھی اور کامیاب علاج کے بعد مزید انعام و اکرام کا وعدہ کیا تھا مگر شرط فوری حاضری کی تھی۔ اس کا بیٹا ایک حادثے کے سبب اندھا ہو گیا تھا جس کا فوری علاج ممکن اور آسان تھا۔ ڈاکٹر نے یہ عُذر پیش کیا تھا کہ ان حالات کے پیشِ نظر مجھ جیسے غریب آدمی کے لیے یہ پیش کش قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اس کے علاوہ فرڈی کا علاج بھی تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ آخری پلاسٹر اکھڑنے کے بعد پٹیاں آسانی سے کھولی جا سکتی ہیں اور اگر فرڈی کی قسمت میں دُنیا کو اور اپنی ماں بہن کو دیکھنا لکھا ہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ آخر میں ڈاکٹر نے چند احتیاطی تدابیر درج کرنے کے بعد اختتامی جملے میں لکھا تھا کہ بینائی کی بحالی محض عارضی بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

خط پڑھنے سے کچھ ڈھارس بندھی، فرڈی کی بینائی بحال ہو جانے کی امید اب بھی تھی۔ دونوں نے فرڈی کے کمرے میں جا کر نہایت نرمی سے اُسے ڈاکٹر کے فرار کی خبر سُنائی۔

"تو مسٹر وائمن نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔" اُس نے دِل گرفتہ لہجے میں کہا۔ "بہر حال کچھ دن اور صبر کرنے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔"

ڈاکٹر پریرا نے خط میں تاکید کی تھی کہ جب تک پلاسٹر کا ایک ایک پرت خود بخود علیحدہ نہ ہو جائے، پٹی نہیں کھلنی چاہیے۔ چنانچہ وہ تینوں اس صبر آزما اور تکلیف دہ انتظار کی گھڑیاں نہایت صبر و تحمل سے گزارتے رہے تقریباً پانچ روز تک وہ اسی کیفیت سے دو چار رہے۔ آخر وہ لمحہ بھی آ پہنچا جب فرڈی کی پٹیاں کھلنی تھیں۔

فرڈی پر ایک انجانا خوف طاری ہو گیا جس کی وجہ سے بار بار اس کا ہاتھ آنکھوں تک جا کر لوٹ آتا۔ خوشی کا یہ لمحہ وہ کیسے برداشت کر سکے گا جب دُنیا اُس پر روشن ہو جائے گی یا اگر اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اُس کی دُنیا ہمیشہ تاریک ہی رہے گی تو وہ اس اذیت ناک احساس پر کیسے غلبہ پائے گا۔

"نہیں ابھی نہیں۔" اُس نے اپنی ماں سے کہا۔ اُس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے ماں۔ شاید مجھے اس خطرناک کھیل میں شریک نہیں ہونا چاہیے تھا۔۔۔ پہلے میں خوش تھا۔ بہت خوش۔۔۔ لیکن اگر ان تکلیف دہ کوششوں کے باوجود مجھے کچھ بھی حاصل نہ ہوا تو میں پھر کبھی خوش نہیں رہ سکوں گا۔"

ماں نے بڑھ کر اُسے گلے سے لگا لیا اور شفقت سے اُس کا ماتھا چُومنے لگی۔

"ماں! تمہاری اور راکیلی کی محبتوں کا خیال کر کے میرا دل اچانک رونے لگتا ہے۔ کیا تم دونوں محسوس کر سکتی ہو کہ اس وقت میری کیا حالت ہے؟ نہیں بالکل نہیں۔۔۔۔ میں نے تم دونوں کو پرندوں پھولوں اور رنگوں کے بارے میں باتیں کرتے سُنا ہے۔ میں نے چیزوں کے حرکت کرنے کا ذکر بھی سُنا ہے۔ سُورج، چاند، ستارے اور سمندر، ہاں مجھے سمندر کی مانوس آواز ضرور سُنائی دے رہی ہے۔ میرا خیال ہے میں کبھی کسی سمندر سے خوف نہیں کھاؤں گا۔۔۔۔۔ لیکن ماں ذرا سوچو تو۔" اس نے جُھرجُھری لی۔ "ممکن ہے میں یہ برداشت نہ کر سکوں۔۔۔ ایک مرد کی طرح۔۔۔۔۔ پتہ نہیں کہ مجھے بینائی ملنے والی ہے یا دوبارہ ہمیشہ کے لیے تاریکی نصیب ہو گی۔ نہ معلوم کیا انکشاف ہو۔ ماں، میں چاہتا ہوں کہ اس انکشاف کے وقت میں تنہا رہوں۔"

"تنہا۔" دونوں یک زبان ہو کر بولیں۔

"ہاں تنہا۔ تنہائی میں انسان زیادہ اچھی طرح دُعائیں مانگ سکتا ہے۔ اور خدا سے قریب تر بھی ہوتا ہے۔ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے دُعا مانگی تھی تو یہ احساس مجھ پر غالب آ گیا تھا۔" اس نے اصرار کیا۔ "ہاں ماں! میں تنہا رہنا چاہتا ہوں۔ یہی سکون کا واحد راستہ ہے۔"

وہ دونوں اُس سے لپٹ کر روتی رہیں مگر فرڈی کا دل نہ پسیجا۔

"دروازہ بند کر دینا۔ اسے کھولنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں بھی اندر سے بند کر لوں گا۔ تم لوگ صرف انتظار کرنا۔ ذرا سوچو تو سہی کہ میں نے بھی کتنا انتظار کیا ہے۔"

"لیکن فرڈی"۔۔۔۔ ماں کا دل نہ مانا۔

"ماں!" اُس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "کیا تم یہ پسند کرو گی کہ میں تمہاری موجودگی میں اپنے آپ کو کمتر سمجھوں؟ اگر میں نے رونا اور چیخنا چلانا شروع کر دیا تو؟ کیا یہ سب کچھ میرے لیے قابلِ برداشت ہے؟ نہیں



ماں! میرا خیال ہے کہ تمہیں میری اس خواہش کا احترام کرنا چاہیے اور خدا کے لیے یہ بحث یہیں ختم کر دیجیے۔ ہمیں بعد میں بھی بہت سی باتیں کرنے کا موقع ملے گا۔"

سب لوگ اُس کی خواہشات کے آگے سر جھکا دینے کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ اس وقت بھی سرِ تسلیم خم ہو گیا۔ اُس نے ان دونوں کے چلے جانے کے بعد دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ "جب تک میں نہ بلاؤں ..... یاد رکھنا۔" اُس نے آخری بار ہدایت کی۔

●

کمرے میں تنہا رہ جانے کے بعد اُس نے فوراً اپنی پٹیاں اُتارنی شروع کر دیں۔ اُس کی اُنگلیاں کانپ رہی تھیں۔ اُسے اپنے ہاتھ بہت کمزور اور تھکے ہوئے محسوس ہو رہے تھے اور پٹیاں کھولنے میں بہت دِقت پیش آ رہی تھی۔ بے صبری کی وجہ سے اُس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی..... وہ جس نے پچیس برس تک انتظار کیا تھا، اس وقت بے صبری اور جلد بازی کا شکار تھا، آخر وہ تمام پٹیاں کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھولیں اور بے اختیار اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ "میں دیکھ سکتا ہوں۔"

اُس کی پلکوں میں درد تھا مگر اسے اس درد کا قطعی احساس نہ تھا کیونکہ اب وہ دیکھ سکتا تھا۔ ابھی اُس کی آنکھوں کے سامنے دُھند سی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا دِل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ آہستہ آہستہ دُھند دُور ہونے لگی اور دھبے رفتہ رفتہ چیزوں کی شکلوں میں تبدیل ہونے لگے۔ سب کچھ نظر آنے کے باوجود اُس نے قدم آگے بڑھایا تو لڑکھڑا سا گیا..... عادتاً اُس کا ہاتھ راہ ٹٹولنے کے لیے آگے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اچانک چکرا کر ایک صوفے پر گر گیا اور وہاں پڑا ہوا خوشی سے کپکپاتا رہا ——

وہ کسی اندیشے کے مطابق اس وقت نہ جانے کیوں ایک خوف سا محسوس کر رہا تھا..... اس نے چاہا کہ دوڑ کر جائے اور دروازہ کھول دے..... مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے گرد موجود اُن حیرت انگیز چیزوں میں سے دروازہ کون سا ہے۔ اس کے باوجود وہ دروازے کو سمجھنے اور کھولنے کی کوشش کرتا مگر اُس کے ہاتھ پیر جیسے مفلوج ہو کر رہ گئے تھے اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اِدھر اُدھر تک رہا تھا۔

آسمان ابر آلود تھا اور ماحول پر سُرمئی رنگت چھائی ہوئی تھی..... کھڑکی میں سے سمندر کا صرف ایک حصّہ دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک اُسے ایک کشتی تیرتی ہوئی نظر آئی۔ اُس نے سوچا کہ یہ کیا چیز ہو سکتی ہے؟... کہیں کوئی چڑیا تو نہیں ہے؟ پھر اُسے چند مرغابیاں اُڑتی ہوئی دکھائی دیں... نہیں، پرندے تو یہ ہیں، اُس نے سوچا۔ پھر وہ بڑے سے سفید بادبان والی چیز کیا ہے؟ وہ سُنی سنائی باتوں کی مدد سے کشتی کا تصوّر اپنے ذہن میں نہیں لا سکا تھا۔

اُس کا خوف کم ہوتا چلا گیا۔ اب وہ اپنے اعضا بھی آزادی سے ہلا سکتا تھا مگر اُس کے دِل میں اپنی ماں یا بہن کو بُلانے کی آرزو اِتنی شدید نہیں تھی۔ وہ کچھ مسحور سا تھا اور اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی کم ہو گئی تھی۔

اخبار کا ایک ٹکڑا ہوا میں پھڑ پھڑاتا ہوا کھڑکی کے سامنے سے گزرا۔ کیا یہ آدمی ہے؟ اُس نے سوچا۔ سمندر کی موجوں کا شور اسے صاف سُنائی دے رہا تھا۔ اُس نے بہت جلدی سمندر کو پہچان لیا..... پھر ایک لڑکا دوڑتا ہوا وہاں سے چلا گیا..... کہیں یہی تو آدمی نہیں ہے؟ اس نے اپنے سارے جسم میں کپکپاہٹ محسوس کی۔

اُس کے ذہن میں آئینے کا کوئی واضح تصوّر نہیں تھا اور اگر اسے اپنی شکل دیکھنے کی خواہش ہوتی تب بھی وہ نہیں دیکھ سکتا تھا کیوں کہ ڈاکٹر ریرا نے جن ہدایات پر خصوصیت سے زور دیا تھا، ان میں یہ ہدایت بھی شامل تھی کہ بینائی بحال ہونے کے بعد کئی ہفتوں تک فرڈی کو آئینہ نہ دیکھنے دیا جائے تاوقتیکہ وہ بینائی کے اس احساس کا اچھی طرح عادی